آج کا جاپان

عامر بن علی

آج کا جاپان

عامر بن علی

نستعلیق مطبوعات

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 042-7351963

Email: *nastalique786@gmail.com*

نٓ وَالۡقَلَمِ وَمَا یَسۡطُرُوۡنَ O

القرآن

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

مصنف: عامر بن علی

سرورق: عبید

بار اوّل: جنوری ۲۰۱۴ء

کمپوزنگ: ایمان گرافکس

مطبع: حاجی حنیف پرنٹرز لاہور

قیمت: 400 روپے

بیرون ملک: 20 امریکی ڈالر

نستعلیق مطبوعات

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

0300-4489310 / 042-7351963

Email: nastalique786@gmail.com

پیاری بیٹی فاطمہ کے نام!

جو گھر کے تمام بچوں کے لیے ''عینی باجی'' ہیں

ترتیب

1	تجربہ نامہ سو یا مانے	10
2	جاپان-ایک آئیڈیل ملک خواجہ محمد زکریا	12
3	حرفِ آغاز عامر بن علی	16

حصہ اول

چڑھتے سورج کی سرزمین کا سفر

5	مسکراہٹ	21
6	خزاں کی دستک	24
7	چیری بلاسم	28
8	دنیا کا بلند ترین مینار	31
9	برفانی بندر	34
10	محبت کی سائینس	37
11	علامہ اقبالؒ اور جاپان	41
12	جگنو کہاں گئے؟	45
13	مزیدار کھانوں کا شہر	48
14	جاگتا جہنم	52
15	جاپان میں رمضان المبارک	58

16	روایت کا نیا رنگ	58
17	اولاد کی جنس کا انتخاب ممکن ہوگا؟	62
18	جاپان کا پرائمری نظامِ تعلیم	64
19	جاپان بھارت بُلٹ ٹرین معاہدہ	68
20	سائبر کرائم کا نیا چیلنج	72
21	جاپان کا معاشی ارتقاء	77
22	ٹوکیو سے کراچی تک......!	82
23	جاپانیوں کی جانوروں سے عقیدت	85
24	محوِ حیرت ہوں کہ......	89
25	ایڈیسن دیوتا	92
26	بدلتے موسم	95
27	جوا- کسی کا نہ ہوا	98
28	کرسمس اور نئے سال کی روشنیاں	102
29	سیکنڈ ہینڈ تمباکو نوشی	106
30	جدید ٹیکنالوجی	110
31	رکھ رکھاؤ	115
32	ٹوکیو اولمپک 2020ء	119
33	بلٹ ٹرین	120
34	زلزلے، سونامی اور ایٹمی بحران	128
35	جوہری توانائی کا مستقبل	132
36	صدرِ پاکستان کا دورۂ جاپان	136

37	مستقبل کی موٹر گاڑیاں	140
38	کوئلے سے توانائی کا حصول	143
39	تھری-ڈی ٹیلی ویژن	146
40	مطالعہ کا چلن	149
41	اخبار-کلیدی ذریعۂ اطلاعات	152
42	امریکی فوجی اڈا اور وزیراعظم کا استعفیٰ	155
43	موبائل فونوں سے سونے کی برآمد	158
44	چینی، جاپانی حلیف	161
45	جاپانی شہر اوبامہ	164
46	ایٹمی ہتھیاروں کے خاتمے کی کوششیں	167
47	ایٹمی بمباری کے 64 سال	171
48	خودکشی کا رجحان اور اوکھی ناوا	175
49	کاک ٹیل	179
50	یہ بھی کوئی الیکشن تھا	183
51	پاکستانی ادیبوں کا دورۂ جاپان	188
52	سو یاما نے پاکستان واپس جا رہا ہے	192
53	ایں جہانِ دِگر است	195
54	**حصہ دوم**	199
	رنگِ دیگر	
55	نصرت فتح علی خاں کے انمٹ نقوش	201
56	پاک ٹی ہاؤس کا نیا روپ	204
57	آئن سٹائن اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان	208
58	یہ زنجیریں ٹوٹ سکتی ہیں	213

59	الیکشن نتائج 2013ء کے روشن پہلو	217
60	پیشہ، ذات اور الیکشن	221
61	خدا حافظ	225
62	کیسے لوگ ہیں دنیا والے؟	228
63	مرار جی ڈیسائی	232
64	اِک چراغ اور بجھا......!	236
65	دوہری شہریت	240
66	دوہری شہریت - دوسرا رخ......!	244
67	چیئرمین نادرا اور دوہری شہریت	249
68	پاکستان - کپڑے کا دوسرا بڑا برآمد کُندہ	253
69	گاندھی بنام موتی لال نہرو	256
70	متاعِ ضمیر اور حرفِ رسا	259
71	**حصہ سوم** جہانِ دِگر	262
72	پابلو نرودا کے چلّی میں چند روز	264
73	سرِ وادیٔ سینا	269
74	11 ستمبر ایک اور بھی ہے	273
75	ٹالسٹائی مسلمان تھا؟	277
76	تہران سے ایک خط	282
77	مشہد میں چند روز	286
78	کیا پابلو نرودا قتل کیا گیا؟	291
79	میجر آندرے کا قندھار	297

تجربہ نامہ

جاپانی ٹی وی پروگراموں میں سے ایسے پروگرام بہت مقبول ہیں جن میں غیر ملکی لوگ بلائے جاتے ہیں اور وہ لوگ جاپان اور جاپانی لوگوں کے بارے میں اپنے تاثرات بتاتے ہیں۔انہیں دیکھ کر جاپانی لوگ کبھی خوش ہو جاتے ہیں یا کبھی افسردہ ہو جاتے ہیں۔دوسروں کی رائے پر جاپانی لوگ اتنا کیوں گھبراتے ہیں؟

اس کی کئی وجوہات ہوں گی اوران میں سے ایک یہ کہا جاتا ہے کہ جاپان کئی جزائر پر مشتمل ملک ہےاور کسی دوسرے ملک کے ساتھ اس کی زمینی سرحد نہیں ملتی۔پھر قومی اعتبار سے ایک جیسے لوگ رہتے ہیں،لوگوں کی شکل بھی ایک جیسی ہےاور شاید ہماری اس شکل کی خصوصیت اردو کے محبوب کی جیسی ہوتی ہے کہ یہاں جاپان میں ان نیم باز آنکھوں والے ہی رہتے ہیں۔

ایک جیسے لوگوں کی سرزمین ہونے کی وجہ سے جاپانی لوگ باہر کے لوگوں کی رائے سننا بہت پسند کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات ایسے واقعات ہوتے ہیں جب کوئی غیر ملکی جاپانی معاشرے کی اجنبیت پر بیان کریں تو اسے اپنی منفرد خصوصیت سمجھ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم جاپانی ہیں۔

یہ بات سچ ہے کہ کسی چیز کی شناخت دوسری چیز کے ساتھ مقابلہ کرنے ہی سے زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔کسی شخص یا کسی معاشرے کے بارے میں جاننا چاہیں گے تو دوسرے لوگ ہی اچھی طرح بتا سکیں گے کہ اس میں کیا کیا خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں

اور کیا کیا نہیں ہیں۔

آپ کے سامنے مضامین کا ایک مجموعہ ہے جو سفرنامہ نہیں، تحقیقی مقالہ بھی نہیں بلکہ ’’آج کا جاپان‘‘ ایک تجربہ نامہ ہے۔مصنف نے جاپانی معاشرے کواس کے اندر رہتے ہوئے خوب دیکھا، اپنا تجربہ خوب آزمایا۔ پھرایک طویل عرصہ تک اردو صحافت سے وابستہ رہنے سے تحریروں کو عمدہ لکھنے کا تجربہ بھی انہیں بہت خوب ہے۔اس لیے یہ تجربہ نامہ دوسرے سفرناموں سے منفرد ہے۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے مصنف عامر بن علی صاحب زیادہ وقت جاپان کے ایک ایسے شہر میں رہتے ہیں جہاں ٹوکیو، اوساکا کی طرح غیر ملکی لوگ زیادہ نہیں رہتے اور سردیوں میں خوب برف باری ہوتی ہے۔ایسے شہر میں رہنے سے جاپان کے روایتی معاشرے کو دیکھنے کا موقع بھی یقیناً انہیں ملا ہوگا۔

طرح طرح کی باتیں عامر صاحب وقتاً فوقتاً لکھتے آئے ہیں اوراب ’’آج کا جاپان‘‘ کتابی شکل میں آئی ہے۔

مجھے پوری طرح یقین ہے کہ آپ اسے پڑھ کرلطف اندوز ہوجائیں گےاور پڑھنے کے بعد آپ کو جاپانی معاشرے کا اندازہ تو ضرور ہوگا لیکن سب سے مزے کی بات تو یہ ہوگی کہ آپ کے سامنے پاکستان اور پاکستانی کا تصور پہلے سے زیادہ نمایاں نظر آئے گا۔

پروفیسر سو یامانے

استاد شعبہ اردو، اوساکا یونیورسٹی

اوساکا، جاپان

جاپان-ایک آئیڈیل ملک

عامر بن علی کئی سال سے جاپان میں مقیم ہیں اور جاپانی شہریت (نیشنلٹی) کے حصول کی جملہ شرائط پوری کرتے ہیں مگر محبِّ وطن پاکستانی ہونے کی وجہ سے انھوں نے پاکستانی شہریت برقرار رکھی ہے۔ وہ پاکستانی معاشرے کی جملہ خامیوں سے آگاہ ہیں مگر اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ پاکستان کے پاس ایسے ذرائع ہیں کہ وہ قابلِ رشک ترقی کرسکتا ہے اور ایسی افرادی قوت بھی موجود ہے جو بڑی باصلاحیت ہے مگر وہ ماحول موجود نہیں جس کی وجہ سے ہم چند اہم ترقی یافتہ قوموں میں شامل ہوسکیں۔

جاپان ایسا ملک ہے جہاں جا کر تیسری دنیا ہی کے لوگ نہیں، بلکہ انتہائی ترقی یافتہ ملکوں کے باشندے بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ وہ عالمی جنگوں میں تباہ ہوجانے کے باوجود چند برسوں میں حیرت انگیز ہمہ جہتی ترقی کے ذریعے دنیا کے ممتاز ترین ممالک میں سرفہرست آ چکا ہے۔ بہت سے پاکستانی جنھیں براہِ راست جاپانی معاشرے سے متعارف ہونے کا موقع میسر نہیں آیا، جاپانی قوم کی اس تیز رفتار ترقی کا راز نہیں سمجھ سکتے۔ بلکہ اس ترقی کی بہت سی جہتوں سے آگاہ ہی نہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس ترقی کا اہم ترین سبب یہ ہے کہ جاپانی صحیح معنوں میں ایک قوم ہیں اور ہماری طرح منتشر افراد کا گلہ نہیں ہیں۔

عامر بن علی جاپانی معاشرے کے بارے میں اپنے مشاہدات، تجربات اور احساسات اخباری کالموں کی شکل میں لکھتے رہے ہیں۔ وہ جاپانی زندگی کی مختلف جہتیں ان ’مکتوبات جاپان‘ میں نہایت اچھے انداز میں قلمبند کرتے رہے ہیں اور اخبار کے قارئین ان سے متمتع اور مستفید ہوتے رہے ہیں مگر جیسا کہ مشہور ہے اخبار کی تحریر ایک دن زندہ رہتی ہے۔ دوسری دن بہت سا نیا مواد چھپ جاتا ہے اور اپنی کشش کے باعث گزرے ہوئے دن کی تحریروں کو فراموش کرنے پر آمادہ کردیتا ہے مگر کتابی شکل میں یکجا ہو کر

مستقل اہمیت اختیار کر لیتا ہے اس لیے ان کالموں کو کتاب کا روپ دینے کا فیصلہ صائب ہے۔

ان کالموں سے یکے بعد دیگرے گزرتے ہوئے مجھے اپنے قیامِ جاپان کے چار سال بہت یاد آئے۔ میں ۱۹۹۵ء سے ۱۹۹۹ء تک جاپان کے دیہی علاقے میں واقع زبانوں کے ایک تدریسی ادارے میں استاد کے فرائض انجام دیتا رہا ہوں لیکن فرصت کے اوقات میں کئی بڑے شہروں میں چند دن گزارنے کے مواقع بھی میسر آئے ہیں اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ جاپان کے چھوٹے بڑے شہروں میں آبادی کی کثرت اور اس سے وابستہ لوازم سے قطع نظر عام لوگوں کے لیے چھوٹے سے چھوٹے شہر اور قصبے کے عوام کو بھی وہی سہولیات میسر ہیں، جو بڑے شہروں میں مل جاتی ہیں۔ جاپان کا چپہ چپہ ٹیکنالوجی کے بل پر باہم منسلک ہے۔ میں امریکہ بھی متعدد دفعہ گیا ہوں اور وہاں بھی شہری اور دیہاتی علاقے دیکھے ہیں اگرچہ وہاں بھی رسل ورسائل اور دیگر سہولیات کا جال بچھا ہوا ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ جاپان جاپان ہی ہے۔ امریکہ میں دنیا کے بے شمار مختلف رنگوں، نسلوں، زبانوں اور تہذیبوں کے لوگ ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں جو دو چار نسلوں سے امریکی شہری بن چکے ہیں لیکن ابھی وہ ہم آہنگ ہو کر ایک قوم نہیں بنے مگر جاپان کی قوت یہ ہے کہ وہاں غیر ملکی بہت کم ہیں اور جاپانی نسل کے لوگ ایک ہی طرح سوچتے اور مختلف معاملات میں بہت حد تک ایک جیسا ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔ وہاں افراد کے اختلافات سطحی ہیں اور سطح کے نیچے یک جہتی ہے۔

جاپانی قوم قانون پسند، متحمل، نرم خو، مستقبل بین، محنتی اور دھیمے مزاج کی حامل ہیں۔ غیر ضروری جذباتیت سے دور اور بے کار سیاسی و مذہبی مناقشات سے نفور ہے۔ ہم اگر چاہیں تو، جاپانیوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ جاپان نے ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ خصوصاً 'الیکٹرونکس' میں دنیا بھر میں ان کا صحیح معنوں میں کوئی مدمقابل نہیں ہے۔ ہر ہفتے اخباروں میں خبریں چھپتی ہیں کہ فلاں چیز ایجاد ہوئی ہے یا فلاں ایجاد میں یہ بہتری کر دی گئی ہے۔ دو عالمی جنگوں کے بعد برطانیہ اور امریکہ نے دنیا بھر میں یہ پروپیگنڈا کیا کہ جاپانی ایجادات کی نقالی کرتے ہیں اور یہ نقالی ادنیٰ درجے کی ہوتی ہے۔ مگر آج جاپان کی ساختہ اشیاء انتہائی اعلیٰ معیار کی ہیں اور خریدار ''میڈ اِن جاپان'' دیکھ کر ہی انھیں خرید لیتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ساختہ جاپان اشیاء پر انحصار کیا جا سکتا ہے اس لیے

دنیا بھر کی منڈیوں میں الیکٹرونکس اور جاپانی گاڑیاں چھا چکی ہیں۔ جاپان کے اندر مختلف قسم کی ٹیکنالوجی کے مظاہر قدم قدم پر دکھائی دیتے ہیں۔ جوہری توانائی سے قسم قسم کے کام لیے جا رہے ہیں۔ رسل و رسائل کے مختلف اور انتہائی منظّم وسائل لوگوں کو میسر ہیں۔ جاپانی تعلیم یافتہ ہیں اور تعلیم میں محنت ان کا اصل اصول ہے۔ انفرادیت کو بہت نمایاں کرنے کی بجائے 'ٹیم ورک' ان کا نصب العین ہے اور وہاں تربیت کا نام ہے جس سے ان کی ٹیکنالوجی میں تیزی سے پیش رفت ہو رہی ہے اور کمال کی بات یہ ہے کہ یہ ساری ترقی انھوں نے جاپانی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر کی ہے۔

جاپان میں مذہب اور عقیدے کے معاملے میں لوگوں میں بہت رواداری ہے۔ وہ بدھ یا شنتو عبادت گاہوں میں بلالحاظِ عقائد عبادت کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بدھ یا شنتو مذاہب کے ماننے والے عیسائیوں کے گرجوں سے بھی گریز نہیں کرتے۔ سیاست میں جاپانیوں نے دوسری عالمی جنگ کے بعد 'صلح کل' کا مسلک اپنا رکھا ہے۔ بڑے ملکوں میں سے کسی کے ساتھ ان کی دشمنی نہیں۔ کوریا اور چین کے وہ عرصے تک حریف رہے ہیں لیکن انھوں نے اس ماضی کو فراموش کر دیا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک خواہ ایشیا میں ہیں یا افریقہ میں یا لاطینی امریکہ میں، جاپان ان کے ساتھ مختلف ترقیاتی منصوبوں میں تعاون کرتا ہے۔

جاپان بڑا صاف ستھرا ملک ہے۔ لوگ عموماً صحت مند ہیں اور سو سال سے زیادہ عمر کے افراد ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ سطح زمین ناہموار ہونے کے باوجود درخت، پھول، پھل، پارک اور تفریح گاہوں کی کمی نہیں۔ میں نے دنیا کے جو مختلف ممالک دیکھے ہیں ان میں جاپان کو کئی لحاظ سے بہترین ملک پایا ہے اس لیے عامر بن علی کی اس تصنیف کو میں پاکستانی ''قوم'' کے لیے ایک تحفہ تصور کرتا ہوں۔ انھوں نے جاپان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو دیکھا، جانا اور پرکھا ہے اور پھر ان کی سچی، کھری اور بے لاگ تصویریں تیار کی ہیں۔ اس میں سفرنامے کا لطف بھی ہے اور قیام نامے کی گہرائی بھی۔ سفرناموں میں کسی ملک کا سرسری سا ذکر ہوتا ہے اور بہت سی دیگر تفصیلات کے ساتھ انھیں ضخیم کتاب کی شکل دے دی جاتی ہے۔ ان میں اکثر اوقات مشاہدہ سرسری اور غلط بھی ہوتا ہے لیکن کسی ملک میں قیام کرنے سے

وہاں کی حقیقی زندگی کا حال معلوم ہوتا ہے۔اس کتاب میں سفر نامہ اور قیام نامہ دونوں کی خوبیوں کو یکجا کیا گیا ہے اور رواں، سلیس، ہلکی پھلکی نثر میں بہت کام کی باتیں تحریر کی گئی ہیں۔

اس کتاب کی پاکستانی معاشرے کو بہت ضرورت ہے۔شاید اس کے مطالعے سے چند افراد کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہمیں بھی اپنے ملک اور قوم کو ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کے لیے جاپان سے کچھ سیکھنا ہے۔

یک حرفِ کاشکے کہ بصد جانوشہ ایم

خواجہ محمد زکریا

پروفیسر امیریٹس (اُردو)

پنجاب یونیورسٹی، لاہور

حرفِ آغاز

سفر کی روداد لکھنے کا تو مجھے ابتدا سے ہی بڑا شوق تھا۔ روزانہ ڈائری لکھنا میں نے سکول کے دنوں میں شروع کیا تھا۔ زمانۂ طالب علمی میں جن بیرونی ممالک کا دورہ کیا وہاں کے متعلق کالج میگزین اور اخبارات میں اکّا دُکّا مضامین لکھتا رہا۔ مگر جب امریکہ گیا تو وہاں کچھ ایسا واقعہ پیش آیا کہ میں نے سفرنامہ لکھنے کا خیال دل سے نکال دیا۔ یوں ہوا کہ لاس اینجلس میں میزبان دوستوں نے میرے اعزاز میں مشاعرہ رکھا ہوا تھا۔ مشاعرہ بڑے خوشگوار انداز میں اپنے اختتام کو پہنچا تو اہلِ قلم ساتھیوں سے گپ شپ ہونے لگی۔ سفرناموں کے موضوع پر بات ہوئی تو کیلی فورنیا میں مقیم ایک بزرگ شاعر نے کہا کہ ہمارے سفرنامہ نگار پاکستان کی غربت زدہ عوام کا استحصال کرتے ہیں، ان کے جذبات سے کھیلتے ہیں اور سفرنامہ نگاری کو خودنمائی قرار دیا۔ میں ان دنوں لاطینی امریکہ کے متعلق سفرنامہ لکھنے کا سوچ رہا تھا، کچھ مواد تحریروں کی صورت میں جمع بھی ہو چکا تھا۔ اپنے اس شاعر دوست کی بات کا مجھ پر بہت گہرا اثر ہوا، میں نے سوچا کہ اگر سفرنامہ لکھنا مفلس، بے کس اور غریب لوگوں کا استحصال ہے اور حقیقت میں یہ شیخی بگارنا اور خودنمائی ہے، تو پھر میں ایسا برا کام کبھی بھی نہیں کروں گا۔

اگلے چند برس اسی خیال میں گزر گئے۔ انہی خیالات کے ساتھ ایک دفعہ جناب احمد ندیم قاسمی کے دفتر میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا، انہوں نے کہا کہ تم جہاں رہتے ہو وہاں کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھتے رہا کرو۔ میں نے جواب میں انہیں مذکورہ بالا واقعہ سنا کر عرض کیا

کہ میں کسی کا استحصال کرنا نہیں چاہتا۔اس پر قاسمی صاحب نے بالکل ہی دوسری رائے کا اظہار کیا۔ان کا فرمانا تھا کہ اگر آپ جاپان یا کسی بھی دوسرے ملک کے معاشرے اور معیشت کا تعارف اپنی تحریر کے ذریعے پاکستان میں رہنے والے لوگوں سے کرواتے ہیں، اور وہاں کی کسی بھی مثبت بات کو پڑھ کر اگر کوئی بھی شخص اچھا اثر لیتا ہے تو بلاشبہ یہ بڑا نیکی کا کام ہے، اور آپ کو ضرور کرنا چاہئے۔قاسمی صاحب سے اس ملاقات کے بعد میری سوچ میں تبدیلی آئی اور میں نے بیرونی دنیا کے متعلق دوبارہ لکھنا شروع کر دیا۔

جاپان کا ذکر کریں تو میرے اس جانب پہلے سفر کا آغاز پاکستان سے نہیں ہوا بلکہ جنوبی امریکہ کے براعظم سے یہ مسافرت شروع ہوئی جہاں میں بسلسلۂ کاروبار مقیم تھا۔زیرِ نظر کتاب جاپان کے متعلق ماضی میں لکھے گئے سفرناموں سے یکسر مختلف ہے۔میں اسے سب سے بہتر تو قرار نہیں دوں گا کہ حکیم محمد سعید، ابنِ انشاء اور امجد اسلام امجؔد جیسے عظیم مصنفین اس موضوع پر لکھ چکے ہیں، لہٰذا سب سے اچھا کہنا اپنے منہ میاں مٹھو بننے کے علاوہ میرے نزدیک بدتہذیبی بھی ہوگی۔ہاں! منفرد ہونے کا دعویٰ میں یقیناً کرسکتا ہوں۔وہ اس لیے کہ ماضی میں جاپان پر لکھنے والے تمام اردو مصنفین کا اس ملک میں قیام چندروز سے زیادہ نہیں رہا، دوسری بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی جاپانی زبان نہیں جانتا تھا۔جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو میں اس معاشرے میں ایک دہائی گزار چکا ہوں، اس کے علاوہ جاپانی زبان بھی جانتا ہوں۔اسی بنیاد پر آپ کو اس کتاب اور دیگر سفرناموں میں ایک واضح فرق محسوس ہوگا۔میرا دعویٰ ہے کہ اردو زبان میں ماضی میں کسی نے جاپانی معاشرے کا اتنی گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ پیش نہیں کیا ہوگا۔

اس سفرنامے میں شامل زیادہ تر مضامین ''روزنامہ خبریں'' میں کالمز کی صورت اور ہمارے ادبی میگزین ''ارژنگ'' میں شائع ہو چکے ہیں، اس لیے امجد اسلام امجؔد کے بقول آپ کو اس سفرنامے کا انداز نظم کی بجائے غزل جیسا لگے گا۔یہ محض سفر کی داستان نہیں ہے، جاپان کے ماضی، حال اور مستقبل کا عکس بھی

ہے۔ گو کہ اسے تحریر کرتے ہوئے میری توجہ کا بنیادی مرکز آج کا معاشرہ ہی رہا ہے۔ رسم و رواج، سیاست، ادب وصحافت، مذہب اور فنونِ لطیفہ سے لے کر زندگی کے تمام دیگر شعبوں کو میں نے تھوڑا یا زیادہ، بہر حال گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ آپ اسے جاپان کے متعلق اردو کی پہلی گائیڈ بک بھی کہہ سکتے ہیں، میرے دوست سویامانے نے تو اسے تجربہ نامہ قرار دیا ہے۔

اس کتاب میں ملکوں ملکوں گھومنے کے تذکروں سے آپ یہ مت سمجھ لیجئے گا کہ میں کوئی ابنِ بطوطہ یا کولمبس ٹائپ کا آدمی ہوں، دنیا بھر کے ممالک کی سیاحت فقط شوق آوارگی ہی نہیں، کاروباری ضرورت بھی ہے۔ بنیادی طور پر ہمارا کاروبار جاپان سے ری کنڈیشن گاڑیاں ایکسپورٹ کرنے سے متعلق ہے، جو پاکستان سمیت دنیا کے نوے ممالک میں جاتی ہیں۔ کہیں کم تو کہیں زیادہ۔ میری ''ہفت زبانی'' کے پیچھے بھی یہی راز چھپا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہسپانوی زبان جاننے کے سبب میں پابلونرودا اور گبریلا مسترال کو اردو زبان میں ترجمہ کر کے ''محبت کے دورنگ'' کے نام سے شائع کروانے کے قابل ہوا، اور روسی زبان جاننے کی وجہ سے روس کے جدید اور کلاسیک شعراء کو ان کے اصل متن میں پڑھنے اور لطف اندوز ہونے کے قابل ہوسکا۔ میرے خیال میں زبان کسی بھی معاشرے کا ڈی این اے (DNA) ہوتی ہے۔ زبان جانے بغیر آپ کبھی بھی کسی سماج یا قوم کی اصل روح کو نہیں سمجھ سکتے۔ یوں تو آپ کو انگریزی زبان بولنے اور سمجھنے کی اہلیت کے حامل لوگ ہر غیر انگریزی ملک میں مل جائیں گے مگر یہ لوگ عمومی شہریوں کی ہرگز نمائندگی نہیں کرتے جیسے کسی بھی ملک کی ایمبیسی کا سٹاف اس ملک کے باشندوں کے عمومی رویوں کا عکاس نہیں ہوا کرتا ہے۔ مقامی زبان جاننے سے تجزیے اور مشاہدے پر کیا اثرات ہوتے ہیں، اس بات کا آپ کو ''آج کا جاپان'' کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ یہاں میں جاپان میں اردو زبان کی ترقی وترویج کے لیے کوشاں، اپنے دوست سویامانے کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس نے اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر اس کتاب کا مطالعہ کیا اور اس کے

بارے میں اپنی رائے تحریر کر کے راقم الحروف کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

میں نے جب ''آج کا جاپان'' کا مسودہ انہیں ارسال کیا تو رسید دینے کے لیے سویاما نے نے مجھے فون کیا اور ساتھ ہی یہ مژدہ سنایا کہ وہ جنوری میں اس کتاب پر اپنا تبصرہ لکھ بھیجیں گے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ وضاحت بھی کر دی کہ میں اور آپ آدھے ہی جاپانی ہیں، اس حقیقت کی روشنی میں اگر جنوری کی بجائے فروری بھی ہو جائے تو برا مت منائیے گا (میں جاپان میں ایک دہائی گزارنے کی بناء پر آدھا جاپانی ہو گیا ہوں اور سویاما نے پاکستان اور اردو سے تعلق کی وجہ سے آدھا جاپانی رہ گیا ہے۔) وہ ستم ظریف تو خود کو ''دو نمبر'' جاپانی کہتا ہے۔

خواجہ محمد زکریا نے کمال محبت سے اس کتاب کو پڑھا اور اپنی قیمتی آراء سے نوازا جس کے لیے راقم سپاس گزار ہے۔ خواجہ صاحب کی رائے اس کتاب کے متعلق یوں بھی معتبر ہے کہ وہ جاپان کی یونیورسٹیوں میں چار سال تک اردو پڑھاتے رہے ہیں۔ تعلیم و ادب کی ساری زندگی انہوں نے جس طرح خدمت کی ہے، ان کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔

قارئین کی رائے سے میں بے نیاز نہیں ہوں۔ ''آج کا جاپان'' کی اشاعت کا بنیادی محرک یہ خواہش ہے کہ ایک پاکستانی تارکِ وطن کی حیثیت سے میں نے جو مشاہدات کیے اور جن تجربات سے گزرا، ہو سکتا ہے ان کے بیان سے میرے کسی ہم وطن کے لیے کوئی آسانی پیدا ہو جائے، یا پھر کسی کے چہرے پر مسکراہٹ کا سامان پیدا ہو سکے۔ میں اپنی اس کاوش میں کس حد تک کامیاب ہو سکا ہوں اس کا فیصلہ تو آپ کریں گے مگر ایک بات میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کوشش خواہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، کچھ نہ کرنے سے بہر حال برتر ہے۔

عامر بن علی

605-Samaria Mansion
Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku Tokyo Japan
Email:amirbinali5@hotmail.com

URL:www.amirbinali.com

حصہ اوّل

چڑھتے سورج کی سرزمین کا سفر

مسکراہٹ

شنتو روح ہمیشہ مسکراتی ہے۔ یہ نقطہ شنتو دھرم کے بنیادی مذہبی عقائد میں شامل ہے۔ جاپان کا سرکاری مذہب چونکہ شنتو ازم ہے، عوام کی اکثریت بدھ مت اور شنتو مت کے پیروکاروں پر مشتمل ہے، غالباً یہی مذہبی اصول وہ بنیادی وجہ ہے جس کے سبب آپ یہاں کے کسی بھی دفتر، دکان یا استقبالیے پر چلے جائیں، آپ کا استقبال بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ ہوتا ہے۔ بیزار، سپاٹ یا پھر افسرہ چہرے کے ساتھ گاہک کو مخاطب کرنا یہاں خلافِ آداب سمجھا جاتا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ یہاں کسی استقبالیے پر پچھلے کئی سالوں میں مسکراہٹ کے بغیر مخاطب کیا گیا ہوں لیکن کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ شنتو مت کی روحوں کو ہمیشہ مسکرانے کی تلقین اور فطری جذبات سے زیادہ ان مسکراہٹوں کے پیچھے ادارتی پالیسی کارفرما ہوتی ہے۔ یقیناً مہاتما بدھ اور ایک بنک مینیجر کی مسکراہٹ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ ذکر بھی دلچسپی کا باعث بنتا ہے کہ جاپان میں بدھ مت اور شنتو مت آپس میں اس طرح گڈمڈ ہیں کہ ان کو علیحدہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ایک ہی گھر کے آدھے افراد شنتو دھرم کو مانتے ہیں تو باقی نصف بدھ ازم میں یقین رکھتے ہیں۔ گو کہ شنتو ازم میں روایتی طور پر جاپان کے بادشاہ کی پوجا کی جاتی رہی ہے اور اسے خدا کا اوتار مانا جاتا رہا ہے، جاپان کے شاہی خاندان کو سورج کی دیوی کی اولاد مانا جاتا ہے، جبکہ بدھ مت کا دارومدار سدھارتھ گوتم بدھ کی ذات اور نظریات ہیں۔ بظاہر یہ دونوں بالکل مختلف نظریات پر مبنی مذاہب لگتے ہیں لیکن زمینی حقیقت یہاں یہ نظر آتی ہے کہ ارتقائی عمل نے دونوں مذاہب کی آمیزش سے ان کی

مشترک باتوں کو اجاگر کر دیا ہے جبکہ اختلافی مسائل گھٹتے چلے گئے ہیں جس کے سبب اب ان مذاہب میں، جاپان کی حد تک بہت کم فرق رہ گیا ہے۔ یہاں ضرب المثل مشہور ہے کہ ’’ گاہک بھگوان ہے۔‘‘ ہمارے برصغیر پاک و ہند میں گاہک کو خدا کا روپ تو کہا جاتا رہا ہے مگر یہاں وہ بھگوان ہے، اسی لیے مسکراتے چہرے کے ساتھ ہی اس کا استقبال کیا جاتا ہے۔

تازہ خبر یہ ہے کہ دن بھر استقبالیوں، دفتروں اور دکانوں پر باچھیں پھیلا کر زندگی سے بھرپور مسکراہٹیں بکھیرنے والے ملازمین جب تھک جاتے ہیں تو مساج پارلر سے باچھوں کا مساج کرواتے ہیں۔ ان دنوں ٹوکیو میں خصوصاً، مسکراتے چہروں کی باچھوں کے مساج پارلر بہت تیزی سے مقبول ہو رہے ہیں اور ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ ایسی صورتحال دیکھ کر شک پڑتا ہے کہ شاید ان مسکراتے چہروں کی مسکراہٹ قدرتی نہیں مصنوعی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ صوفی کے تبسم اور بیوپاری کی مسکراہٹ میں بہت فرق ہے۔ رابعہ بصری قلندرؒ کے ہاں ایک حسن نامی درویش مہمان ٹھہرا ہوا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد وہ خیمے کے باہر کھڑا ہو کر دن نکلنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ نظارے سے مبہوت ہو کر اس نے رابعہ بصریؒ کو آواز دی ’’رابعہ! باہر آ کر دیکھو کیسا خوبصورت دن نکلا ہے‘‘ حسن درویش کی بات سُن کر رابعہ بصری قلندرؒ مسکرائی اور مسکراتے ہوئے کہنے لگی ’’اندر آؤ! یہاں یہ دن نکالنے والا بیٹھا ہوا ہے۔‘‘

صوفیاء کرام کی مسکراہٹ جو کہ ضرب المثل ہے، آقائے دو جہاں ﷺ کی سنت پر عمل ہی تو ہے۔ حضور پاک ﷺ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ اکثر مسکراتے رہتے تھے۔ پتا نہیں ہمارے اکثر و بیشتر مذہبی رہنما مسکرانے سے پرہیز کیوں کرتے ہیں؟

برصغیر پاک و ہند پر برطانوی نوآبادیاتی راج کے اثرات تو مسکراہٹ سے پرہیز کی وجہ نہیں ہو سکتے؟ ہماری بیوروکریسی کے سپاٹ چہرے تو انگریز دور کی یادگار ہیں۔ انگریزوں کی یہ عادت مجھے سخت ناپسند ہے کہ وہ اپنے چہرے سے جذبات و تاثرات کا اظہار نہیں ہونے دیتے، خوشی غم، پسندیدگی

ناپسندیدگی، مسکراہٹ غصہ، سب سے عاری سپاٹ

چہرے۔ میرے ایک برطانوی نژاد کلاس فیلو کا اس بابت کہنا ہے کہ اب حالات تبدیل ہو رہے ہیں اور نئی نسل جذبات کے اظہار کے سلسلے میں بزرگوں کی اس نصیحت کو نظر انداز کرتی نظر آ رہی ہے کہ ''اپنا چہرہ تاثرات سے ہمیشہ آزاد رکھو۔'' مگر جذبات سے خالی سپاٹ چہرہ جسے انگریزی میں ''سو بر فیس'' اور پنجابی زبان میں ''وٹے ورگا منہ'' کہتے ہیں، برطانیہ کی حکمران جماعت ٹوری پارٹی کا غالب کلچر اب بھی اسی طرح کے چہرے ہیں۔ لندن کی زیرِ زمین ریل گاڑی میں بیٹھ کر انگریز مسافروں کے چہروں کے تاثرات نوٹ کیے جائیں تو محسوس ہوتا ہے کہ میرے مذکورہ برطانوی نژاد دوست کی تھیوری اگر باطل نہیں تو ناقص ضرور ہے۔ ہمارے لیے اس بابت پیغام بڑا واضح اور خوبصورت ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ ''لوگوں سے مسکرا کر ملنا بھی خیرات ہے۔''

خزاں کی دستک

دھرتی نے خزاں کے رنگ اوڑھ لیے ہیں۔ درختوں کے پتے سبزہ کھو رہے ہیں، کہیں زردی مائل، پیلے اور نارنجی تو کہیں کہیں سرخ ہوتے جا رہے ہیں۔ چند دنوں سے جا بجا پیڑوں سے ٹوٹ کر یہ پتے باغوں میں زرد قالین بچھاتے نظر آتے ہیں۔ پت جھڑ کی رُت میں پگڈنڈیوں پر پیدل چلتے ہوئے پاؤں تلے آئے خشک پتوں کی آواز میری پسندیدہ ترین آوازوں میں سے ایک ہے۔ پتا نہیں یہ موسم میرے شاعر دوستوں میں اتنا غیر مقبول کیوں ہے؟ جاپان میں خزاں کی آمد بچوں میں بے حد مقبول ہے۔ اس مقبولیت کی وجہ اس موسم میں بچوں سے متعلق منائے جانے والے تہوار ہیں۔ نومبر کی ابتدا میں نونہالوں کی اچھی صحت اور ترقی کا تہوار منایا جاتا ہے، نئی آنے والی نسلوں کے لیے دعائیہ تقریبات ہوتی ہیں۔ اس تہوار کا بنیادی حُسن بچوں کا مل جُل کر روایتی اور ثقافتی کھیل کھیلنا ہے، ایسے تہذیبی کھیل جو اگر ہزاروں نہیں تو سینکڑوں سالوں سے اس تیوہار کے موقع پر کھیلے جا رہے ہیں۔

ہر سال نومبر کے وسط میں سات پانچ تین میلہ انعقاد پذیر ہوتا ہے۔ اس برس پندرہ نومبر کو بھی 3-5-7 میلہ روایتی جوش و جذبے کے ساتھ منایا گیا۔ جیسا کہ نام سے ہی اس میلے کی جزیات چھلک رہی ہیں، تین سال کی لڑکیاں، پانچ سال کے لڑکے اور سات سال کی لڑکیاں اس فیسٹیول کا محور ہیں۔ اس موقع پر تین اور سات سال کی عمر والی لڑکیاں اور پانچ سال کی عمر والے لڑکے جاپان کا روایتی لباس زیب تن کر کے عبادت گاہوں میں، اپنے والدین کے ساتھ حاضری دینے جاتے ہیں۔

پروہت مخصوص منتر پڑھنے کے بعد درازیٔ عمر کے لیے بچوں کو خاص قسم کی ٹافیاں دیتے ہیں جنہیں عرف عام میں ''طویل العمر ٹافی'' کہتے ہیں، یہ ٹافیاں خالصاً اسی تہوار کے موقع سے نسبت رکھتی ہیں، اب مجھے نہیں پتا کہ اس ٹافی کو کھانے سے عمر بڑھتی ہے یا پھر یہ سیدھی سادی ''گولی'' ہے۔ پروہت منہ سے پیسے تو نہیں مانگتے مگر بدشگونی سے بچنے کے لیے لوگ خود ہی معبد کو نذرانہ پیش کیے بغیر نہیں پلٹتے۔ عبادت گاہوں سے واپس لوٹتے ہوئے، معبدوں کے احاطے میں ہی لگے ہوئے سٹالوں سے خوش بختی کے لیے مخمل کی ننھی ننھی پوٹلیوں میں لپٹے ہوئے تعویز خریدے جاتے ہیں۔ ریشمی ڈور سے بند کی گئی اس پوٹلی کے اندر اچھی صحت، محبت میں کامیابی، شادی، سکول کے امتحانوں میں کامیابی سمیت قریباً قریباً ہر مشکل کا شرطیہ حل موجود ہوتا ہے۔ اس کو کھولنا مگر ممنوع و مکروہ سمجھا جاتا ہے۔ بڑی تکریم سے اس تعویز کو کسی اہم اور پاک صاف جگہ پر نصب کیا جاتا ہے۔ ہمارا کاروبار چونکہ ری کنڈیشن گاڑیوں کی برآمد سے متعلق بھی ہے، اس لیے پرانی گاڑیوں میں ایسے تعویز اکثر نظر آتے ہیں۔ ایک بار میں نے تجسس سے مغلوب ہو کر جامنی رنگ کی گُتھلی میں لپٹا ہوا تعویز کھول کر دیکھا تھا، اندر سے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکروں اور کاغذی پرزوں پر دعائیں لکھی ہوئی تھیں۔

خزاں میں جس طرح پتے درختوں سے جھڑتے ہیں، اسی طرح ہمارے سروں سے بال جھڑنے کا بھی یہی موسم ہوتا ہے۔ ایک تندرست و توانا آدمی کے سر پر ایک لاکھ کی تعداد سے لے کر ایک لاکھ چالیس ہزار تک بال ہوتے ہیں۔ سال کے باقی تین موسموں میں عموماً روزانہ سر سے بال گرنے کی اوسط شرح سو کے قریب ہوتی ہے، خزاں کے موسم میں مگر یہ شرح دو سو بال یومیہ تک پہنچ جاتی ہے یعنی دوگنی ہو جاتی ہے۔ بال گرنے کی شرح دوگنی ہونے کا سبب متعلقہ شعبے کے ماہرین کے نزدیک موسم گرما میں سر پر پڑنے والی الٹرا وائیلٹ شعاعیں ہیں۔ کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ سورج کی شعاعوں کا گرمی کے موسم میں شدت کے ساتھ بالوں پر اثر انداز ہونے سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ سال کے اس

موسم میں پرانے بالوں کی جگہ نئے بالوں کے لیے قدرتی طور پر راہ ہموار کی جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ نئے بالوں کی تیاری ہے جو پرانے بال گرنے کی صورت میں ظاہر ہو رہی ہے، اصل میں تو نئے بالوں کے لیے جگہ بن رہی ہے، جیسے پیڑ، پودوں میں نئے پتوں کا معاملہ ہوتا ہے۔

خزاں کا پیڑوں اور انسانوں پر ایک ہی انداز میں، اتنی مماثلت کے ساتھ اثر انداز ہونا قدرت کا کرشمہ لگتا ہے۔ مشکل مگر یہ ہے کہ خزاں کے گزر جانے کے بعد درختوں پر نئے پتوں کا آنا یقینی ہوتا ہے جبکہ سر کے بالوں کے دوبارہ نمودار ہونے کی تھیوری پر یقین متزلزل ہے۔ اسی غیر یقینی صورت حال کا شکار میرا ایک دوست، جو بال جھڑنے کی رفتار سے گھبرایا ہوا تھا، چند دن پہلے مجھے بھی اپنے ساتھ آرائش گیسو کے متعلق ایک مرکز میں لے کر چلا گیا۔ حالانکہ میں نے اپنے اس دوست کو بہت سمجھایا کہ اگر بال گر بھی گئے تو پھر کیا ہے؟ نئے لگوا لیں گے۔

بفرضِ محال، اگر زندگی کا باقی حصّہ گنجے یا نیم گنجے شخص کے طور پر بھی گزارنا پڑے تو کیا مضائقہ ہے؟ کون سی آفت ٹوٹ پڑے گی؟ لینن سے لے کر ماؤزے تنگ اور ذوالفقار علی بھٹو سے لے کر چرچل تک کی مثالوں سے بھی جب میرا یہ دوست قائل نہ ہوا تو میں نے ہار مان لی اور اس کے ہمراہ ہو لیا۔ گیسوئے زوال پذیر کلینک چلانے والے ڈاکٹر نے فیس تو اتنی وصول کی کہ جس میں پاکستان میں چار لوگوں کا آپینڈکس کا آپریشن با آسانی کروایا جا سکتا ہے مگر اس بدلحاظ نے جو باتیں بتائیں وہ بہت کام کی تھیں۔ ایک تو اس نے یہ سمجھایا کہ بال صرف خزاں کی رُت کے سبب ہی نہیں گرتے، پریشانی اور کم سونا بھی اس کے اہم اسباب میں شامل ہیں۔

پت جھڑ کے موسم میں سر کے بالوں کو گرنے سے روکنے کے چند ٹوٹکے جو اس ڈاکٹر نے بتائے وہ آپ کو بھی بتا تا چلوں کہ اگر آپ کے نہیں تو آپ کے کسی دوست کے کام آئیں گے۔ پہلی بات تو یہ کہ نہاتے، سر دھوتے وقت شیمپو، صابن کو زور لگا کر سر پر مت

ملیں، سر دھوتے وقت طاقت کا مظاہرہ جتنا کم کریں اتنا ہی بالوں کے لیے اچھا ہے، روزانہ شیمپو ہرگز استعمال نہ کریں، شیمپو کے مخالف اس ڈاکٹر نے تو بہت پروپیگنڈہ کیا مگر میں آپ کو صرف اس کے استعمال میں اعتدال کا ہی کہوں گا۔ شیمپو و صابن سر پر لگانے سے پہلے سر کا تین منٹ مساج اس طرح کریں کہ سر کی جلد کو ہلایا جائے، مگر زیادہ زور آزمائی نہ ہو کیونکہ بالوں کی جڑوں میں خون کو گردش دینا ہی اس کا واحد مقصود ہے۔

پانچ گھنٹے سے کم دورانیہ نیند لینے والے لوگوں میں بال گرنے کا تناسب، اچھی نیند لینے والوں کی نسبت کئی گنا زیادہ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ لہٰذا نیند کا دورانیہ پانچ گھنٹے سے زیادہ رکھیں۔ سر دھونے کے لیے انگلیوں کی پوروں کو استعمال کیا جائے، بال دھونے کے بعد ہیئر ڈرائیر کے استعمال سے پرہیز کیا جائے، یا پھر مختصر دورانیے کے لیے کم درجۂ حرارت پر استعمال کیا جائے۔ ان احتیاطی تدابیر کے باوجود اگر سر پر بال نہ رہیں تو قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا جائے۔ پت جھڑ کے موسم کو بھی دوشی ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

ادھر باغ، باغیچوں میں آئے دن گلی، محلّے کے بچے اکٹھے ہو کر خشک پتے اکٹھے کرتے ہیں، ان کے ڈھیر بناتے ہیں، پھر انہی پتوں کو ایک دوسرے کے اوپر اچھالتے ہیں اور کپڑوں پر چپکانے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی پتوں کے ٹیلے بناتے ہیں اور ان ٹیلوں پر خوب اچھلتے ہیں، آخر میں ان پتوں کو آگ لگا دیتے ہیں اور اس آگ میں شکر قندی و آلو بھونے جاتے ہیں۔ آگ دیر تک جلتی رہتی ہے اور بچے نئے پتے جمع کر کے اس میں سلگاتے جاتے ہیں۔ اس ہنگامے کا خاتمہ، جسے جشن کہنا زیادہ اچھا لگتا ہے، یوں ہوتا ہے کہ سلگتی ہوئی آگ میں سے شکر قندی ٹٹولی جاتی ہے، جو بالآخر کوئلہ بنی نظر آتی ہے، اس کو چھیلا جاتا ہے اور بُھنی ہوئی شکر قندی کو بچے مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔ اس موسم میں بچے کسی نہ کسی باغیچے میں جشن مناتے نظر آتے ہیں۔

چیری بلاسم

پھول تو دنیا کے ہر کونے میں کھِلتے ہیں اور بہار تو رُت ہی پھولوں کی ٹھہری مُلک چاہے کوئی بھی ہو۔ ہمارے ہاں جیسے بسنت کا تہوار بہار کی آمد کا اعلان سمجھا جاتا رہا ہے اسی طرح جاپان میں چیری کے پھول کھلنے کو فصل بہار کی سند مانا جاتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ چیری بلاسم دیکھنا یہاں باقاعدہ تہوار ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ ان چیری کے پھولوں کو دیکھنے کا تہوار، مقامی زبان میں جسے ''ہنامی'' کہتے ہیں، یہاں کے کیلنڈر میں سب سے اہم موقع ہے تو یہ بھی مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔ چیری کے پھول کو جاپان کی روح کہا جاتا ہے اور یہ ان بنیادی اجزاء میں شامل ہے جو اس ملک کا چہرہ شمار کیے جا سکتے ہیں، جیسے ابلے چاولوں پر کچی مچھلی کی تہہ جسے ''سوشی'' کہا جاتا ہے، سبز چائے، جدید ٹیکنالوجی اور کورنش بجا لاتے ہوئے فرشی سلام۔

یہاں موسم کی مناسبت سے ایک طرف یہ خبر گرم ہے کہ ملک کے کئی حصوں میں چیری کے پھول کھلنا شروع ہو گئے ہیں تو دوسری طرف حکومت کی جانب سے شمالی کوریا کے راکٹ لاؤنچ کے اعلان پر چیری بلاسم دیکھنے کی سرکاری تقریبات منسوخ کر دیئے جانے کا چرچا ہے۔ وزیراعظم نے تقریبات کی منسوخی کا مختصر بیان جاری کرتے ہوئے اس کا مقصد ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کی تیاری کرنا بیان کیا ہے۔ یاد رہے کہ شمالی کوریا نے اپریل کے وسط میں اپنے بانی رہنما کم اِل سنگ کی سالگرہ کے موقع پر مصنوعی سیارہ خلا میں بھیجنے کا اعلان کر رکھا ہے جسے یہاں کے دفاعی حلقے میزائل ٹیسٹ سے تعبیر کر رہے ہیں۔

جاپان اور شمالی کوریا کے باہمی تعلقات بالکل ویسے ہی کشیدہ ہیں جیسے پاکستان اور ہندوستان کے رہے ہیں۔اس تناؤ کی وجوہات بھی پاک بھارت تنازع کی طرح تاریخی ہیں۔

شمالی وجنوبی کوریا گزشتہ صدی کی ابتدا سے لے کر دوسری جنگ عظیم کے خاتمے تک جاپان کی نو آبادی رہے ہیں۔جنوبی کوریا کے لوگوں میں بھی میں نے جاپانیوں کے متعلق عموماً غیر دوستانہ اور منفی جذبات ہی محسوس کیے ہیں لیکن انہوں نے جاپان کا مقابلہ اقتصادی وسماجی میدانوں میں کرنے کا فیصلہ کیا ہے جبکہ شمالی کوریا عسکری اعتبار سے جاپان کے لیے سب سے بڑا خطرہ اور اس کی دفاعی پالیسی کا مرکزی نقطہ ہے۔

اسی لیے جب ہمارے ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے یہ بیان دیا کہ کھوٹہ لیبارٹری میں شمالی کوریا کے جوہری سائنس دان بھی ان کے ساتھ مصروف عمل رہے ہیں تو اس خبر کو پاکستان کے میڈیا میں کچھ زیادہ لفٹ نہیں کرائی گئی لیکن جاپان میں یہ خبر اگلے دن کے تمام قومی اخبارات کی شہ سرخی تھی اور کئی دن تک ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے مبینہ نیٹ ورک اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے متعلق تحفظات پر مبنی مضامین وخطوط شائع ہوتے رہے۔

ممکن ہے کچھ دوستوں کے لیے چیری کے پھول کھلنے اور انہیں دیکھنے کی تقریب کی منسوخی ایسی خبر نہ ہو جسے اس تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہو......! مگر ٹھہریے! پندرھویں صدی عیسوی کے ایک اساطیری جنگی سردار تھا کیدا کی مثال شاید میرے بیان کی وضاحت کر سکے جسے یہاں ایک دلیر جنگجو ہیرو کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔اس بہادر سورما نے اپنے ایک دوست کی طرف سے چیری بلاسم دیکھنے کی دعوت کو جنگ کے ہنگام میں بھی رد نہیں کیا تھا اور جنگ ملتوی کر دی تھی۔اس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس سماج میں یہ تہوار کتنی اہمیت کا حامل ہے۔

چیری کے پھول گلابی اور سفید رنگ پہنے بڑے پاکیزہ لگتے ہیں مگر ان کی اصل خوبصورتی ان

کی زندگی کے اختصار میں ہے۔جس طرح ناگ پھنی (Cactus) کا پھول سال میں ایک ہی مرتبہ فقط

ایک رات کے لیے کِھلتا ہے ویسے ہی چیری کے پھول بھی سال

بھر کے انتظار کے بعد آتے ہیں اور دو چار دن کے ہی مہمان ہوتے ہیں۔ جب چیری درختوں کی شاخیں پھول اٹھاتی ہیں تو ان کے نیچے لوگ چٹائیاں بچھا کر دریاؤں کے کنارے اور باغوں میں صبح سے شام تک بیٹھے رہتے ہیں۔ کھانے، شراب اور موسیقی ان مخلوط دعوتوں کے بنیادی اجزاء ہوتے ہیں۔

پھول اٹھانے والی شاخوں میں چیری کے ایسے درخت بھی شامل ہیں جن کی عمر ہزار سال سے بھی زیادہ بتائی جاتی ہے۔ مگر یہ تو ٹورسٹ گائیڈ کے بتانے کی باتیں ہیں جن کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ایک ٹورسٹ گائیڈ نے سیاحوں کو ایک درخت کی عمر ایک ارب پانچ سال بتا کر ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس پر ایک سیاح نے ہمت کر کے یہ سوال داغ دیا کہ وہ کیسے اس قدر یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس درخت کو ایک ارب پانچ سال ہی ہوئے ہیں۔ کچھ سال کم یا پھر کچھ سال زیادہ کیوں نہیں؟ جواباً چرب زبان گائیڈ نے اپنا یہ موقف پیش کیا کہ جب وہ اس شہر میں منتقل ہوا تو اسے بتایا گیا تھا کہ یہ درخت ایک ارب سال پرانا ہے اور اسے اس شہر میں آئے خیر سے پانچ سال پورے ہو گئے ہیں۔

چیری کا کوئی درخت ہزار سال پرانا ہے کہ نہیں یہ بات تو غیر مصدقہ ہے مگر ان درختوں پر کھلنے والے پھولوں پر شاعری یقیناً ہزار سال سے ہو رہی ہے اور ان کے سائے میں جشنِ بہاراں بھی ہزار ہا سال سے منایا جا رہا ہے۔

دنیا کا بلند ترین مینار

ٹوکیو سکائی ٹری۔پہلی نظر میں تو ایسا لگتا ہے جیسے گندم یا مکئی کے کھیت میں سفیدے کا درخت کھڑا ہو۔ٹوکیو شہر کو اگر بلند و بالا عمارتوں کا کھیت مان لیا جائے تو یوں سمجھئے کہ یہ مینار اس کھیت کے بیچ میں کھڑا ہوا تناور شجر ہے۔شاید اسی مناسبت سے اس مینار کا نام ''سکائی ٹری'' رکھا گیا ہے جسے ''شجرِ آسمان'' یا پھر آکاش برکھش بھی کہا جا سکتا ہے۔اسی سال اس مینار کی تعمیر تکمیل کو پہنچی ہے اور کچھ ہی روز قبل اسے عوام الناس کے داخلے کے لیے کھولا گیا ہے۔

گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے تازہ ایڈیشن میں اسے دنیا کا بلند ترین مواصلاتی ٹاور قرار دیا گیا ہے۔اس کی تکمیل سے لے کر افتتاح تک اور افتتاحی تقریب کی کوریج سے آج کی تاریخ تک شاید ہی کسی دن کا یہاں کوئی اخبار اس پر شکوہ مینار کی خبر سے مبرا ہو گا۔ٹیلی وژن پر خبریں دیکھیں تو بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ یہ ٹوکیو کا لازوال نشان ہے اور بعضے تو اسے ''ابدی علامت'' تک قرار دینے پر تلے نظر آ رہے ہیں۔خبروں کے اسی سیلابی ریلے سے متاثر ہو کر میں پچھتر ارب روپے کی لاگت سے تعمیر ہونے والے دنیا کے اس بلند ترین مینار کے متعلق یہ چیدہ چیدہ باتیں تحریر کر رہا ہوں۔

634 میٹر لمبا یہ مینار ٹوکیو کی دنیا بھر میں نئی تعارفی علامت کہلانے کا مستحق ہے۔اس کی مضبوطی کا پہلا امتحان گذشتہ سال آنے والا تاریخی زلزلہ تھا، جس کے جھٹکے اس نے بطریق احسن برداشت کر لیے تھے۔ زلزلے سے کسی بھی طرح متاثر نہ ہونے کے سبب یہ

سونامی سے متاثر ہونے والے لوگوں سمیت، تمام جاپانیوں میں ایک امید کا استعارہ بن کرابھرا ہے۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ سونامی سے مراد یہاں عمران خان کی سونامی نہیں بلکہ پچھلے برس سمندر کے فرش پر زلزلے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی، پانی پر مبنی سونامی کا تذکرہ ہے، جس میں تیس ہزار افراد لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ سونامی جاپانی زبان کا لفظ ہے لہٰذا عمران خان کی سونامی سے کوئی بھی مماثلت محض اتفاقیہ ہوگی۔

وضاحتوں کی بات چلی ہے تو یہ بھی وضاحت کرتا چلوں کہ دنیا کی بلند ترین عمارت دوبئ میں واقع ''برج خلیفہ'' ہی ہے جس کی اونچائی 828 میٹر ہے۔ برج خلیفہ وہ عمارت ہے جس کی تکمیل سے پہلے دوبئ کی حکومت دیوالیہ پن کے دہانے پر پہنچ گئی تھی۔ ابوظہبی نے دوبئ حکومت کو بیل آؤٹ تو کر دیا لیکن اس منصوبے کا قبضہ اس سے لے لیا ورنہ دنیا کی اس بلند ترین عمارت کا نام کوئی اور ہوتا۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ برج خلیفہ کنکریٹ سے بنی ہوئی ایک مکمل عمارت ہے جبکہ سکائی ٹری ایک آہنی مینار ہے۔ یوں اس ٹاور کا مقابلہ فرانس کے ایفل ٹاور، ٹوکیو ٹاور، جو لمبائی کے اعتبار سے دنیا میں بالترتیب پانچویں اور چوتھے نمبر پر ہیں یا پھر کینیڈا اور چین میں واقع بلندی کے لحاظ سے دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والے میناروں سے ہے۔ دوبئ کے برج خلیفہ، ملائیشیا کے پیٹرو ٹاور اور امریکہ کی ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کی کیٹگری مختلف ہے۔

سیاحوں کی توجہ حاصل کرنا بھی اسی مینار کی تعمیر کے مقاصد میں شامل ہے مگر بنیادی طور پر اس منصوبے کے اہداف مواصلاتی شعبے سے متعلق ہیں۔ ابتداء میں اس ٹاور پر پانچ ٹیلی وژن اسٹیشنوں، دو ایف ایم ریڈیو، ایک ٹیکسی کمپنی اور موبائل فون کمپنی کے مواصلاتی آلات نصب کیے گئے ہیں۔ یہ کوئی سرکاری عمارت نہیں بلکہ نجی شعبے کا منصوبہ ہے جس سے سالانہ 150 ارب روپے کی آمدن ہونے کی توقع کی جارہی ہے۔

اس مینار پر سیاحوں کے لیے دو درشنی جھروکے بنائے گئے ہیں۔ Observator

کے لیے درشن جھروکہ ہی مناسب لفظ لگتا ہے۔ پہلا جھروکہ ساڑھے تین سو میٹر کی بلندی پر ہے جس پر دو ہزار افراد منظر کا بیک وقت نظارہ کر سکتے ہیں۔ دوسرا درشن جھروکہ ساڑھے چار سو میٹر کی اونچائی پر ہے جس میں ایک ہزار کے قریب لوگ سما سکتے ہیں۔ یوں تو چھ سو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی لفٹیں اس میں میں لگی ہوئی ہیں لیکن ہنگامی صورت میں لوڈ شیڈنگ کے لیے سیڑھیاں بھی موجود ہیں۔ بس ذرا سی مشکل ہے کہ اس کے زینے ڈھائی ہزار ہیں۔ اگر زینہ زینہ اترنا یا پھر چڑھنا پڑے تو دقت ہوگی۔

سکائی ٹری کے درشنی جھروکے پر سب سے پہلے جانے کا اعزاز افتتاح کے دن اس عورت کو حاصل ہوا جس نے 2008 میں اس مینار کا نام تجویز کیا تھا۔ یاد رہے کہ مذکورہ خاتون کے علاوہ بھی بیس ہزار سے زیادہ لوگوں نے یہی نام تجویز کیا تھا مگر قرعہ فال اس خوش نصیب کے نام کا نکلا۔ اس مینار کی تعمیر کا اعلان 2008 میں ٹوکیو ٹاور کی گولڈن جوبلی کے موقع پر کیا گیا تھا، جسے 1958 میں تعمیر کیا گیا تھا۔ سالہا سال تک ٹوکیو ٹاور کو دنیا کا بلند ترین مینار ہونے کا اعزاز حاصل رہا۔ پچاس سال مکمل ہونے پر جاپانیوں نے اس سے دگنی اونچائی کا ٹاور بنانے کا منصوبہ پیش کیا تھا، چار سال بھی نہیں گزرے اور اب یہ سب کے سامنے حقیقت کے روپ میں کھڑا ہے۔

ٹوکیو کے مرکزی ریلوے اسٹیشن سے صرف پانچ کلومیٹر کی دوری پر واقع اس ٹاور کے گرد اک چھوٹا سا شہر بسایا گیا ہے۔ ٹاور کے مقام تک ریلوے لائین بچھائی گئی ہے، خصوصی ریل سروس کا آغاز کیا گیا ہے۔ گراؤنڈ فلور پر سیاحوں کے لیے سینکڑوں دکانوں اور ریستورانوں کے علاوہ ایک رسدگاہ اور ایکواریم تعمیر کیا گیا ہے۔ درشنی جھروکے سے شہر کا منظر کیسا نظر آتا ہے؟ میں فی الحال بتانے سے قاصر ہوں۔ مینار کے درشن جھروکے تک جانے کے لیے ٹکٹ درکار ہے۔ اگلے تین ماہ کی ٹکٹیں ایڈوانس میں فروخت ہو چکی ہیں اور یہاں پر بلیک میں ٹکٹ خریدنے کی سہولت بھی میسر نہیں ہے اس لیے میں ابھی تک فضائی نظارے سے محروم ہوں۔ جب وہ نظارہ دیکھوں گا تو ضرور لکھوں گا۔

برفانی بندر

افریقہ کے جنگلوں سے لے کر ہندوستان کے مندروں تک بندروں کا مسکن نسبتاً گرم ممالک ہی ہوتے ہیں۔ سنا تو ہم نے بھی یہی تھا کہ بندر سردی سے بھاگتے ہیں لیکن جاپان میں ایک وادی ایسی بھی ہے جہاں برفانی بندر بستے ہیں یوں تو جیسے برفانی ریچھ ہوتے ہیں ویسے ہی برفانی بندر بھی ہو سکتے ہیں لیکن اصل دلچسپی کی بات ان بندروں کا رہن سہن ہے اور حکومت کی طرف سے بنایا گیا بندروں کا پارک ہے۔ پارک تو بس نام کو ہے اصل میں تو جنگل میں منگل کیا گیا ہے اور اگر سردیوں میں دیکھنے کا اتفاق ہو تو جنگل برف سے مکمل طور پر ڈھکا ہوا ہوتا ہے۔ ہاکوبا گاؤں کے قریب واقع یہ مقام تقریباً وہاں ہی ہے جہاں کچھ سال پہلے ناگانو اولمپک کے عالمی مقابلے ہوئے تھے۔

سن ساٹھ کی دہائی کی ابتدا تھی جب اس قدرتی پارک کی دریافت کچھ یوں ہوئی کہ موسم سرما میں ایک سیاح ان بلند پہاڑوں میں گھری ہوئی اس برفانی وادی میں آیا جہاں قدرت کی رنگارنگی اپنی انتہاؤں کو یوں چھوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے کہ گرم پانی کے چشمے انہی برفیلے پہاڑوں کے بیچوں بیچ پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ برف سے ڈھکی چٹانوں کے سینوں سے ابلنے والے اس انتہائی گرم پانی کو عرف عام میں Hot Spring یعنی ''گرم بہار'' کہا جاتا ہے۔ اس ''گرم بہار'' کا غسل جلد کے علاوہ کئی امراض سے شفا کا ذریعہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس سیّاح نے ایک دلچسپ منظر دیکھا کہ گرم چشمے کا کچھ پانی ایک چھوٹے سے جوہڑ میں جمع ہو گیا تھا جس میں ایک بندر غسل کر رہا تھا۔ ہاکوبا گاؤں کے لوگ تو

صدیوں سے یہ منظر دیکھتے چلے آرہے تھے۔اس لیے ان کے لیے یہ کوئی عجیب بات نہ تھی لیکن ایک سیّاح کے لیے برفانی وادی میں غسل کرتے ہوئے بندر کا نظارہ ایک حیرت انگیز عمل تھا۔اس سیاح نے کچھ روز اس گاؤں میں قیام کیا اور بندروں کو گرم پانی میں بیٹھ کر گھنٹوں تک غسل سے انسانوں کی طرح لطف اندوز ہوتے دیکھتا رہا۔وہ سیّاح ٹوکیو کا رہنے والا تھا۔سفر سے واپسی پر اس نے اپنا عجیب وغریب مشاہدہ اپنے دوستوں سے بیان کیا اور اس طرح برفانی بندروں کی بات چلتے چلتے حکومتی ایوانوں تک جا پہنچی۔ یہ 1964ء کا ذکر ہے جب حکومت نے ان بندروں کے غسل کے لیے یہاں ایک بہت بڑا تالاب تعمیر کروایا جس میں قدرتی چشموں کا گرم پانی جمع ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا پارک بھی تعمیر کروایا۔مرکزی شاہراہ سے ہٹ کے دشوار گزار راستوں کے باوجود یہاں ہزاروں کی تعداد میں ملکی وغیر ملکی سیّاح روزانہ آتے ہیں۔ بالخصوص سردیوں کے موسم میں جب آنکھیں بند کیے ہوئے گرم پانی میں کھڑے بندروں کا صرف سر پانی سے باہر ہوتا ہے اور سر پر برف گر رہی ہوتی ہے۔بعض اوقات تو ایسا لگتا ہے جیسے بندروں نے سفید ٹوپیاں پہن رکھی ہوں۔غسل کی یہ سہولت بھی تمام بندروں کے لیے نہیں ہے بلکہ سردار اور اس کے خاندان کے علاوہ صرف وزیر، مشیر اور ان کے اہل خانہ ہی اس سردی میں گرما گرم پانی میں نہانے کے اہل ہیں۔اگر کوئی عام بندر جو نجیب الطرفین نہیں ہے اس گرم پانی کے تالاب میں گھسنے کی کوشش کرے تو یہ سب مل کر فوراً اسے بھگا دیتے ہیں۔اس پر ہمارے دائیں بازو کے دانشور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ سوشلزم تو بندروں میں بھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔کہانیوں جیسی اس خوبصورت وادی کا نام ''وادیٔ جہنم'' ہے۔ سننے میں تو بڑا عجیب لگتا ہے کہ اتنی خوبصورت جگہ اور نام دوزخ!!! لیکن اس کی وجہ وادی کے پہاڑوں میں آتش فشاں کا موجود ہونا ہے۔ پہاڑوں کے اندر پکنے والا لاوہ ہی ہے جو کہ برف پوش پہاڑوں کے سینے سے ابلتے گرم پانی کا موجب ہے۔اسی نسبت سے اس وادی کو دوزخ کی وادی کہا جاتا ہے۔

ذکر بندروں کا ہو رہا ہے اس لیے آج کے اخبارات کے فرنٹ پیج پر چھپنے والی اس شرارتی بندر کی خبر کا بھی تذکرہ ہو جائے جس نے ہزاروں گھروں کو بجلی کی فراہمی معطل کر دی۔ تفصیل اس خبر کی کچھ یوں ہے کہ گزشتہ روز یہاں کے ایک ضلع آئوموری میں سات ہزار کے قریب گھرانوں کو ساڑھے تین گھنٹے بجلی کی بندش کا سامنا کرنا پڑا۔ صبح دس بجے شروع ہونے والی بجلی کی معطّلی کا سبب ایک شرارتی بندر تھا جو کہ چار میونسپل کمیٹی کے علاقوں کو بجلی فراہم کرنے والے گرِیڈ اسٹیشن میں گھس گیا اور بجلی کی تاروں اور ٹرانسفارمز سے چھیڑ خانی کرتا رہا جس کے نتیجے میں سرکٹ بریک ہو گیا۔ جب پاور کمپنی کے اہلکاروں نے بندر کو بھگانے کی کوشش کی تو انہیں بھرپور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ گھنٹہ بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد بجلی سپلائی کمپنی کے اہلکار بندر کو اس وقت پکڑنے میں کامیاب ہوئے جب وہ خود ہی بجلی کی تاروں میں بری طرح پھنس گیا لیکن بجلی کی معطّلی کو بحال کرنے میں پاور کمپنی کو ساڑھے تین گھنٹے لگے۔

اطلاع ملی ہے کہ بندر کے ہاتھوں اور ٹانگوں پر معمولی زخم آئے تھے جن کو طبی امداد دے کر بندر کو جنگل میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ جاپان میں بجلی معطل ہو جانا کوئی معمول کی بات نہیں ہے سالہا سال میں کہیں چند منٹ کے لیے بجلی کی بندش بھی ایک خبر بنتی ہے۔ ایسے عالم میں کام کے اوقات میں تین چار گھنٹے کا بلیک آؤٹ ایک غیر معمولی بات ہے۔

یہ مضمون پڑھنے کے بعد میرے شاعر دوست میجر شہزاد نیئر نے یہ تصحیح کروائی کہ HotSpring کا اردو ترجمہ ''گرم چشمہ'' ہونا چاہیے کیونکہ بہار کو 'چشمہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

محبت کی سائنس

سنا تو یہی تھا کہ محبت منطق سے بالاتر کوئی چیز ہے۔ مگر کیا کیا جائے اوسا کا شہر کی واسیدا یونیورسٹی کا جس نے محبت کا مطالعہ کے عنوان سے پیار پڑھانا اور محبت کرنے کے طریقے سکھانا شروع کیا ہوا ہے۔ واسیدا یونیورسٹی کے متعلقہ شعبے میں رومانیت کا منطقی اور سائنسی انداز میں تجزیہ کیا جاتا ہے اور اس تجزیے کو باقاعدہ تعلیمی مضامین کے طور پر طلباء و طالبات کو پڑھایا جاتا ہے۔ اس شعبۂ تعلیم کی دن بدن بڑھتی ہوئی مقبولیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں نا صرف جنس مخالف سے بات چیت کے گُر سکھائے جاتے ہیں، بلکہ تبادلۂ خیال کرنے کی صلاحیت کو بہتر بنانے کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔

اس باب میں اردو شاعروں کی وساطت سے جو ناقص معلومات ہم تک پہنچی تھیں ان کا خلاصہ تو کچھ یوں تھا کہ

مکتب عشق کا دستور نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

مگر یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ٹھہرا۔ محبت میں مبتلا ہونے کی ترکیبیں سیکھنے کے بعد طلباء و طالبات دھڑا دھڑ فارغ التحصیل بھی ہو رہے ہیں۔ تازہ خبر یہ پہنچی ہے کہ ''محبت کی سائنس'' نامی اس شعبے میں صنفِ نازک کی تعداد بڑھتے بڑھتے اسّی فیصد ہوگئی ہے، جبکہ لڑکے بیس فیصد ہی داخلے کے لیے اہل قرار پا سکے ہیں۔ اسی خبر کے سبب سے یہ دوستوں کی محفلوں میں گفتگو کا محبوب موضوع بنا ہوا ہے۔ آیئے ہم آپ کو عشق کا ہنر سکھانے والے اس

شعبے کی تھوڑی سی سیر کرواتے ہیں اور محبت کا درس دینے والے ایک پریم گرو سے آپ کی ملاقات کرواتے ہیں۔ ''ساتھی کے انتخاب کی تھیوری'' کے موضوع پر لیکچر دیتے ہوئے واسیدا یونیورسٹی کے پروفیسر تھومونوری میل ملاپ کے مجوزہ طور طریقوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب محبوب، بلکہ مجوزہ محبوب کو دعوت طعام دی جائے تو انداز کلی طور پر مثبت ہونا چاہیے۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ مثلاً فلاں فرانسیسی ریستوران میں کھانا کھائیں یا پھر فلاں اطالوی ریستوران کھانا کھانے کے لیے بہتر رہے گا؟ یعنی دعوت دیتے ہوئے انتخاب کے لیے ہاں یا پھر ناں کا سوال نہیں کرنا چاہیے بلکہ دونوں صورتوں میں ''ہاں'' میں سے کسی ایک کی چوائس رکھی جائے۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ اگر اس انداز میں کھانے کی دعوت دی جائے تو انسان کے لیے انکار کرنا مشکل تر ہو جاتا ہے۔ اس تفصیل میں جانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو بھی کورس کا اندازہ ہو سکے اور پتا چل سکے کہ محبت کے نام پر کیا خرافات پڑھائی جارہی ہے۔ ہمارے ممدوح پروفیسر، جنہیں بے ساختہ ناہنجار کہنے کو جی چاہتا ہے، سال 2008 سے یونیورسٹی میں یہی الٹی پٹّی پڑھا رہے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے طلباء و طالبات میں بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔اس سال داخلے کے خواہشمند ایک ہزار طلباء و طالبات نے درخواستیں جمع کروائیں، جبکہ داخلہ فقط ڈھائی سو لوگوں کو مل سکا، جن میں سے اکثریت، جیسا کہ پہلے عرض کیا، خواتین کی تھی۔لڑکوں کے برعکس لڑکیوں کے لیے زیادہ معاشقوں میں ناکام ہونا یہاں بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔شاید اسی سبب سے وہ معاملات عشق کے متعلق کامل آگاہی حاصل کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہیں، تاکہ ناکامی کے امکانات کم سے کم باقی رہ جائیں۔

مذکورہ پروفیسر صاحب اپنے تئیں تو قوم کی خدمت کر رہے ہیں، فرماتے ہیں ملکی آبادی مسلسل گھٹتی جارہی ہے۔لوگوں میں تمام عمر کنوارے رہنے کا رجحان فروغ پاتا جارہا ہے۔ایسے عالم میں لوگوں کی پسندیدگی کے معیار کا تجزیہ کرتے ہوئے، بیالوجی، نفسیات

اور معاشیات کے پہلوؤں کو ساتھ ملا کر موجودہ نوجوان نسل کو محبت کی جانب مائل کرنا ایک نیک کام ہے۔ میں طلباء و طالبات کو محبت میں کامیابی کے کلیدی طریقے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں، اس سے بہتر کام بھلا کیا ہوسکتا ہے؟

بات اگر یہاں تک ہی رہتی تو پھر شاید یہ کالم لکھنے کی نوبت نہ آتی، ستم ظریفی یہ ہے کہ اس پروگرام کو حکومت کی آشیر باد اور سرپرستی حاصل ہوگئی ہے اوساکا شہر کی مقامی حکومت سرکاری خرچ پر ہمارے ممدوح پروفیسر نانجار سمیت ''محبت کی سائنس'' کے شعبے سے وابستہ دیگر تمام پروفیسروں کے کئی لیکچرز کا اہتمام کر چکی ہے۔ مقامی حکومت ان خطبات میں شرکت کرنے کے لیے تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے مرد و زن کو دعوت دیتی ہے، تشہیری مہم کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے جس میں نوجوان لوگ توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔ حکومت کے لیے مسلسل گرتی ہوئی آبادی کا رجحان ایک مستقل دردِ سر بنا ہوا ہے۔ ضلعی حکومت کے ترجمان کا موقف یہ ہے کہ نوجوان نسل میں اجنبی اور نئے لوگوں کے ساتھ گپ شپ اور تبادلۂ خیال کرنے کی صلاحیت زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ اسی لیے یہ ناکافی ہے کہ ان کو باہم میل جول کا موقع فراہم کر دیا جائے اور باقی کام ان پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ خود ہی محبت میں گرفتار ہو جائیں گے اور اس سے آگے کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ حکومت کے ترجمان کا خیال ہے کہ متذکرہ پروگرام سے نوجوانوں کو مکالمہ کرنے کی اہلیت اور صلاحیت کو بہتر بنانے کا موقع ملنے کے علاوہ جنسِ مخالف کو بہتر انداز میں سمجھنے کے لیے بھی مدد ملے گی، نیز نوجوان زیادہ پراعتماد اور پرکشش انداز میں خود کو پیش کر سکیں گے۔

میرے خیال میں محبت کے نام پر جو یہ سب کچھ سکھایا جا رہا ہے خالصتاً دنیاداری ہے، محبت تو ہرگز نہیں ہے۔ درس گاہوں میں دنیاداری ہی سکھائی جا سکتی ہے چاہت تو سکھائی نہیں جا سکتی۔ محبت بھی اگر دیگر علوم کے تعلیمی نصاب اور کتابی اصولوں کے عین مطابق کی جائے تو وہ محبت کہلوانے کی حقدار ہی نہیں ہے۔ تاہم مجھے اصل اعتراض اس شعبے کے نام پر ہے، کہ جس میں محبت کو سائنس کہا گیا ہے، جبکہ

اس مضمون پر پوری دنیا میں سب سے مقبول اور شہرہ آفاق کتاب ''آرٹ آف لونگ'' کے جرمن مصنف ایرک فرام سے لے کر محبت کے موضوع پر لکھنے والے تمام جید مصنفین نے محبت کو آرٹ مانا ہے سائنس نہیں۔ ویسے بھی پاکستانی ہونے کے ناتے ہم سائنس سے ذرا بدکتے ہیں، خواہ وہ محبت کے نام پر ہی کیوں نہ ہو۔ سائنس کا نام سن کر ہماری قوم کو ذرا خشکی کا احساس ہوتا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے گورنمنٹ کالج لاہور سے بائیوکیمسٹری میں گریجوایشن کرنے کے بعد بھی اس خشکی کے احساس سے نجات نہیں مل سکی اور ابھی تک سائنس کے ساتھ بے تکلفی پیدا نہیں ہو سکی ہے۔

دوسرا اعتراض نما خدشہ ابن انشاء کے اس زریں قول سے پیدا ہوتا ہے کہ جس تحریر سے پوری ایک نسل کو بیزار اور متنفر کرنا مقصود ہو اسے درسی نصاب میں شامل کر دیا جائے۔ یوں اس تیر بہدف نسخے کی روشنی میں یہ اندیشہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ محبت کی سائنس کا مطالعہ کرنے کے بعد طلباء و طالبات کہیں جذبۂ عشق سے ہی دست بردار نہ ہو جائیں۔ ان اطلاعات سے گمان تو یہی جنم لیتا ہے کہ اب محبت بھی کمرشل ہو گئی ہے، بلکہ اس قدر کمرشل ہو گئی ہے، مگر دل یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اس طرح کے یونیورسٹی کورسز سے جذبۂ محبت کو پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ جاپانی طبعاً شرمیلے اور کم آمیز ہیں، پھر بھی محبت کو درسی مضمون کے طور پر پڑھنا، پڑھانا ایک غیر فطری سا عمل لگتا ہے۔ یہ بات بہر حال باعث اطمینان ہے کہ چلیں محبت کی سائنس ہی پڑھائی جا رہی ہے نفرت کا مطالعہ تو نہیں کروایا جا رہا۔

علامہ اقبالؒ اور جاپان

پاکستان کا وجود علامہ اقبال کی دوراندیشی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔اس فلسفی شاعر اور درویش سیاستدان کی مستقبل شناسی کا ایک دلچسپ حوالہ جاپان کے متعلق ہے۔1906ء میں تحریر کردہ اپنے مضمون ''قومی زندگی'' میں علامہ اقبال نے جاپان کو ایشیا کے ابھرتے ہوئے ستارے سے تعبیر کیا ہے۔یہاں آپ کو یہ بتا تا چلوں کہ جاپان کے تین بڑے شہروں کی یونیورسٹیوں،ٹوکیو یونیورسٹی،اوساکا یونیورسٹی اور دائتو بنکا یونیورسٹی میں شعبہ اردو موجود ہے اور جاپانی طلباء کی اچھی خاصی تعداد اردو زبان کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ان تینوں یونیورسٹیوں میں اقبالیات پر بہت سارا کام ہو چکا ہے۔تینوں یونیورسٹیوں میں شعبہ اردو کے انچارج اردو زبان پر مکمل دسترس رکھتے ہیں اور علامہ اقبال کی تمام اردو شاعری کا جاپانی زبان میں ترجمہ کر چکے ہیں اور گاہے گاہے یہاں اقبال ڈے کا بھی اہتمام کرتے رہتے ہیں۔اردو زبان جاپان میں نہ تو اجنبی ہے اور نہ ہی نئ ہے بلکہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مضمون ''جاپان میں اردو'' کے مطابق یہاں اردو کی تاریخ 1796 میں اردو کی ایک لغت کی تیاری سے شروع ہوئی۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری برس ہا برس اوساکا یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے رہے ہیں آج کل ڈاکٹر انوار احمد ان کی جگہ یہ ذمہ داری نبھا رہے تھے جو حال ہی میں پاکستان واپس لوٹے ہیں اور وہاں مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین متعین ہوگئے ہیں۔جاپان میں اقبالیات کے حوالے سے ایک اہم نام کاگایا صاحب کا ہے جنہوں نے بارہا جاپان میں اقبال ڈے کا اہتمام کرنے کے علاوہ 1989ء میں سپین کے شہر قرطبہ میں منعقد

ہونے والے اقبالیات کے جلسے میں شرکت کر کے ''علامہ اقبال کے افکار'' کے موضوع پر مضمون پڑھا۔ اس جلسے کی تاریخی اہمیت علامہ اقبال کی اس شہر کے ساتھ وابستگی اور قرطبہ کی مسجد کے متعلق نظم کی وجہ سے بھی ہے۔1904 میں شاعرِ مشرق نے جاپان کے متعلق ایک مضمون تحریر کیا جسے پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے بالکل تازہ ہے اور گمان بھی نہیں گزرتا کہ اسے ضبطِ تحریر میں آئے ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔اس مضمون کا ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے۔

''جاپانیوں کو دیکھو! کس حیرت انگیز سرعت سے ترقی کر رہے ہیں۔ابھی تیس چالیس سال کی بات ہے کہ یہ قوم قریباً مردہ تھی۔36 سال کے قلیل عرصے میں مشرقِ اقصیٰ کی اس مستعد قوم نے، جو مذہبی لحاظ سے ہندوستان کی شاگرد تھی، دنیوی اعتبار سے ممالک مغرب کی تقلید کی اور ترقی کر کے وہ جوہر دکھائے کہ آج دنیا کی سب سے بڑی مہذب اقوام میں شمار ہوتی ہے اور محققین مغرب اس کی رفتارِ ترقی کو دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں۔جاپانیوں کی باریک بین نظر نے اس عظیم الشان انقلاب کی حقیقت کو دیکھ لیا اور وہ راہ اختیار کی جو ان کی قومی بقا کے لیے ضروری تھی۔افراد کے دل و دماغ دفعتاً بدل گئے اور تعلیم و اصلاحِ تمدّن نے پوری قوم کو، اور سے کچھ اور بنا دیا اور چونکہ ایشیا کی قوموں میں سے جاپان نے رموزِ حیات کو سب سے زیادہ سمجھا ہے، اس واسطے یہ ملک دنیوی اعتبار سے ہمارے لیے سب سے اچھا نمونہ ہے۔ہمیں لازم ہے کہ اس قوم کے فوری تغیر کے اسباب پر غور کریں اور جہاں تک ہمارے ملکی حالات کی رو سے ممکن و مناسب ہو اس جزیرے کی تقلید سے فائدہ اٹھائیں۔''

علامہ اقبال کے جاپان کے بارے میں تاثرات پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے

آج کل کے حالات کے متعلق ہی بات کی جا رہی ہے حالانکہ اس تحریر کے بعد جو ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر رہا ہے اس دوران جاپانی قوم نے نہ جانے کتنے انقلابات دیکھے ہیں۔ 1915 میں روس کے ساتھ جنگ جس میں جاپان کو فتح حاصل ہوئی اور پھر دو عظیم جنگیں دوسری جنگ عظیم میں اسے امریکہ کے ہاتھوں شکست ہوئی بلکہ ایٹمی بمباری کا سامنا بھی کرنا پڑا اور پھر بادشاہت کی جگہ برطانوی طرز کا پارلیمانی نظام آ گیا۔ جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد ایک طویل عرصہ تعمیر نو کے عمل سے گزرنا پڑا لیکن اس قوم نے اقبالؔ کے اس نظریے کو بھی سچ کر دکھایا کہ "افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر" میرے لیے ایک دلچسپ انکشاف حکیم الامتؒ کی شاعری میں جاپان کا تذکرہ بھی ہے۔ یہ اشعار انہوں نے اس وقت کے مشترکہ ہندوستان کی صنعتی زبوں حالی کے تناظر میں کہے تھے لیکن ہمارے موضوع سے مطابقت رکھتے ہیں۔

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک
چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسّال کابل سے کفن جاپان سے

علامہ اقبال کے انتقال کی خبر یہاں کے پہلے جاپانی اردو دان پروفیسر گاموؔ نے تحریر کی تھی جو کہ جاپان میں علامہ کی شخصیت کے متعلق پہلے نوٹ کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ اگست 1938 میں یہاں ایک رسالے میں شائع ہونے والے اس تعزیتی نوٹ کی ایک تاریخی اہمیت ہے جس کے سبب میں اس کا اردو ترجمہ آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔ پروفیسر گامو نے اس تعزیتی نوٹ کا عنوان "ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کا انتقال" تحریر کیا تھا جس کی تفصیل میں وہ لکھتے ہیں کہ

"ہندوستان کے مسلمانوں میں سب سے عظیم شخص، جو نہ صرف فلسفی کے طور پر مشہور ہے بلکہ شاعر کے طور پر بھی۔ ڈاکٹر محمد اقبال نے

گزشتہ 21 اپریل کو صوبہ پنجاب کے لاہور شہر میں اپنی شاندار زندگی کو پورا کر لیا۔ ان کے انتقال کی خبر سے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ باشعور ہندوؤں کو بھی شدید دکھ ہوا تھا۔ محمد اقبال جرمنی اور انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے والے اور مشرق و مغرب کی روح کو اپنانے والے ایک عظیم پڑھے لکھے شخص تھے۔ وہ پین اسلام ازم کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک محبّ وطن شاعر بھی تھے اور ایرانی زبان میں سارے مسلمانوں کی روح کے ترجمان بن کر انہوں نے کئی تصانیف لکھی ہیں۔ انکی اہم تصانیف کے عنوانات یہ ہیں ''بانگِ درا'' ''اسرارِ خودی'' ''رموزِ بے خودی'' ''بال جبریل'' ''پیام مشرق'' "Six Lectures on the Reconstruction of Religious thought in Islam." وغیرہ شامل ہیں۔ اب ''پیام مشرق'' میں سے چند اشعار پیش کر کے ان کے انتقال کے موقع پر غم کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کے بعد اقبالؔ کے چند اشعار کا جاپانی زبان میں ترجمہ تحریر کیا گیا ہے۔ جاپان میں اردو کی آبیاری میں جن لوگوں نے بنیادی اور اہم کردار ادا کیا ہے ان میں پروفیسر گاموسرِ فہرست ہیں جو عمر کا بیشتر حصہ ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ ''قصہ چہار درویش'' جیسی اردو کتابوں کے جاپانی زبان میں تراجم بھی کرتے رہے۔

مولانا عبدالمجید سالک نے اپنی کتاب ''ذکرِ اقبال'' میں لکھا ہے کہ 1912 کے لگ بھگ علامہ اقبال کا جاپان جانے کا منصوبہ بن رہا تھا۔ جس کی تجویز مولانا ظفر علی خان نے دی تھی۔ اقبالؔ کا جاپان کے دورے کا منصوبہ تو بوجوہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا لیکن ان کا ذکر آج ایک صدی بعد بھی جاپان میں جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔

جگنو کہاں گئے؟

جاپان کے مضافاتی علاقوں میں اس موسم کا سب سے مقبول میوزک، چاول کے کھیتوں سے مینڈکوں کی کورس میں ٹرانے کی آواز کی صورت میں برآمد ہورہا ہے۔تاروں کا تیوہار گزر چکا ہے، جو اس ماہ کے کیلنڈر میں سب سے اہم ثقافتی موقع ہوتا ہے۔اس اساطیری تیوہار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہماری کہکشاں Milky Way کے مخالف کناروں پر واقع دوستاروں کی دھرتی پر، دوپریمی بستے ہیں۔ وہ پورا سال جدائی کا کرب جھیلتے ہوئے الگ الگ ستارے پر قیام پذیر رہتے ہیں مگر ساتویں مہینے کی سات تاریخ کی شب، اس پیار کرنے والے جوڑے کو ایک رات کے لیے ملنے کی اجازت ملتی ہے۔ملن کی ان شبھ گھڑیوں میں آسمان کے تمام ستارے مسکراتے اور کھلکھلاتے ہیں۔

تاروں کے تہوار کو یوں منایا جاتا ہے کہ جگہ جگہ کرسمس ٹری کی طرح بانس سجائے جاتے ہیں، جن کی شاخوں پر محبت کرنے والے لوگ اپنی اپنی خواہش، منتیں اور پیار بھری شاعری، رنگ برنگے کاغذوں پر لکھ کر اس طرح باندھ دیتے ہیں، جیسے ہمارے ہاں بعض درگاہوں کے درختوں پر منّت کے دھاگے، دھجیاں، کپڑوں کے لیر اور گھنٹیاں باندھی جاتی ہیں۔ یہ تہوار اس سال بھی روایتی جوش وجذبے سے منایا گیا۔اس تیوہار کے بعد کوئی اہم ثقافتی، سیاسی، سماجی پروگرام اس مہینے تو متوقع نہیں تھا، مگر ہفتے کی شب جب میں ایک ساحلی شہر کے چڑیا گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا تو وہاں پر، رات ہونے کے باوجود گاڑیوں کا بے پناہ رش دیکھا۔ میں نے دور تک نظر دوڑائی مگر کہیں روشنیاں دکھائی نہ دیں اور فضا میں

کسی ساز و نغمے کی آواز کے بجائے، بہت پراسرار خاموشی تھی۔ لوگوں کی بھیڑ مسلسل بڑھ رہی تھی اور وہ اندھیرے کی جانب چل رہے تھے۔ میں اکثر اس راستے سے گزرتا رہتا ہوں مگر اس جگہ پر ایسا رش پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ خاموشی اور اندھیرے میں لوگوں کا بڑھتا ہوا اجتماع دیکھا تو میرا تجسس بڑھ گیا۔ اختتامِ ہفتہ کی شب ہونے کے سبب میں بھی ذہنی طور پر فارغ تھا، اس لیے میں نے وہاں رکنے کا فیصلہ کیا۔ گاڑی چڑیا گھر کی پارکنگ میں کھڑی کر دی۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آئی کہ یہ کس قسم کا میلہ ہے؟ اتنی سی بات خلاف معمول ضرور تھی کہ چڑیا گھر کا مرکزی دروازہ رات کے اس پہر بھی کُھلا ہوا تھا، ورنہ سرِ شام یہ گیٹ بند ہو جاتا ہے۔ یا مظہر العجائب! یہ معاملہ کیا ہے؟ لوگ قطار در قطار چڑیا گھر میں داخل ہو رہے ہیں اور چڑیا گھر کے اندر گھپ اندھیرا نظر آ رہا ہے۔ تمام بتیاں بجھی ہوئی ہیں۔ آخر ماجرا کیا ہے؟ یہی دیکھنے کے لیے میں نے ٹکٹ گھر سے داخلے کا ٹکٹ حاصل کیا اور چڑیا گھر کے اندر گھس گیا۔

سبھی جانور حسبِ معمول اپنے اپنے پنجروں اور مخصوص احاطوں میں موجود تھے، لیکن حیرت انگیز طور پر لوگ کسی بھی چرند، پرند میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ سب لوگ پگڈنڈیوں پر خراماں خراماں چلے جا رہے تھے۔ پتا نہیں یہ سب کیا ٹونا کر رہے تھے؟ بہر حال میری سمجھ سے بالاتر معاملہ تھا۔

آہستہ آہستہ میں نے پگڈنڈیوں کے گرد جگنوؤں کی موجودگی کو محسوس کیا۔ رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جگنوؤں کی روشنی بڑا ہی مسحور کن منظر پیش کر رہی تھی۔ اب احساس ہوا کہ یہ ساری خلقت جگنو دیکھنے کے لیے یہاں جمع ہوئی ہے۔ بہت دیر تک منظر کی دلکشی میں کھویا رہا، ذہن میں سوال ابھرا کہ اب پاکستان میں جگنو نظر کیوں نہیں آتے؟ حالانکہ آج کل ہمارے ملک میں لوڈ شیڈنگ کی فراوانی کے باوصف، راتوں کو اندھیروں کی تو کوئی کمی ہی نہیں ہے۔

بچپن میں گرمیوں کی راتوں میں، اگر کمرے میں لیٹے ہوئے ہوتے تو کبھی کبھی

بارش کے دوران جگنو، سر چھپانے کے واسطے، کمرے میں گھس آتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے ہم کمرے کے اندر نہیں بلکہ کھلے آسمان تلے، تاروں کی چھاؤں میں لیٹے ہوئے ہیں۔ اب مگر کئی سالوں سے میں نے پاکستان میں کوئی جگنو نہیں دیکھا، حالانکہ میں تو رہتا بھی میاں چنوں میں ہوں، جس کا ماحول بڑے شہروں کی نسبت فطرت کے زیادہ قریب ہے۔ سونے سے پہلے یہ سوال ذہن میں گھومتا رہا کہ کیا واقعی ہمارے ہاں سے جگنو غائب ہو گئے ہیں؟ یا کہ میرا وہم ہے؟ دیر تک سوچتا رہا کہ جگنوؤں کو فقط میں نے فراموش کر دیا یا کہ وہ واقعی ہمارے دیہاتوں اور شہروں سے کوچ کر گئے ہیں۔ دوستوں سے اس بارے میں بات چیت ہوئی تو سب نے اثبات میں جواب دیا کہ جگنوؤں کو دیکھے عرصہ ہو گیا ہے۔

آخر جگنو کہاں چلے گئے؟ کیوں چلے گئے؟ منّو بھائی کہتے ہیں کہ فصلوں پر زہریلی زرعی ادویات کے چھڑکاؤ نے مضر کیڑے، سنڈیوں کے ساتھ ساتھ جگنوؤں جیسی خوبصورت مخلوق کا بھی خاتمہ کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہی وجہ ہو، یا پھر کسی دوسری وجہ سے جگنو ہماری بستیوں کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ ہم بڑے بڑے موضوعات پر بڑی بڑی باتیں کرنا پسند کرتے ہیں، اس لیے جگنو کا ناپید ہو جانا ہو سکتا ہے کوئی بڑا المیہ نہ ہو، مگر میری نظر میں صرف ہمارے شاعر ہی ایک حسین استعارے سے محروم نہیں ہوئے، ہمارے بچے ایک خوبصورت نعمت سے محروم ہو گئے ہیں۔

مزیدار کھانوں کا شہر

ٹوکیو کا نام سن کر کئی چیزیں ہمارے ذہن کی سکرین پر نمودار ہوتی ہیں جن میں سے زیادہ تر کا تعلق ٹیکنالوجی سے ہونے کا امکان ہے مگر ٹوکیو کا ایک تعارف ایسا ہے جس کو عام طور پر ہمارے ہاں نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور وہ ہے دنیا میں مزیدار کھانوں کا مرکز ہونا۔ تازہ ترین خبر یہ ہے کہ دنیا میں کھانوں کے معیار اور مزہ کے اعتبار سے شہروں کی درجہ بندی کرنے والے ادارے میکلین گائیڈ نے ٹوکیو کو مسلسل چوتھے سال دنیا میں سب سے اچھے کھانے بنانے والا شہر قرار دیا ہے۔ بدھ کے روز میکلین گائیڈ کے اگلے سال کے لیے شائع ہونے والے کتابچے کے مطابق ٹوکیو کے بعد دوسرے نمبر پر مزیدار کھانے بنانے والا شہر پیرس ہے۔ روایتی تصور تو یہی ہے کہ جاپان میں کھانے پھیکے، ابلے اور بے مزہ ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں اب ایسا نہیں ہے، آج کے حالات اس تصور سے بہت مختلف ہیں جس کا تازہ ثبوت میکلین گائیڈ کی طرف سے ٹوکیو کو کھانوں کے اعتبار سے دنیا کا اول نمبر شہر قرار دینا ہے۔

میکلین کمپنی دنیا میں اپنی طرز کی منفرد اور انوکھی کتابیں شائع کرتی ہے جن میں صرف ریستوران اور ان کے کھانوں کے ساتھ ساتھ سروس اور ماحول کا ذکر بھی رہتا ہے اور انہی بنیادوں پر ریستورانوں کی ریٹنگ ہوتی ہے جو کہ ہر سال بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے۔ اپنی انفرادیت کی بنیاد پر میکلین گائیڈ دنیا بھر کے اہم شہروں میں بسنے والے کھانے کے شوقین حضرات کے لیے ایک مستند حوالہ سمجھی جاتی ہے۔ دنیا بھر کے ریستورانوں کے گاہکوں سے

انٹرویوز کے علاوہ میکلین گائیڈ کے اپنے اہلکار بھی پورا سال گاہکوں کے بھیس میں پوری دنیا کے اہم ریستورانوں کا دورہ کرتے رہتے ہیں جنہیں عرف عام میں ٹیسٹر (Tester) کہتے ہیں۔

یہاں کے روایتی اور مقامی کھانے تو بہت سادہ ہیں۔ بنیادی خوراک میں ابلے ہوئے چاول اور کچّی مچھلی سب سے مقبول خیال کیے جاتے ہیں لیکن بدلتے ہوئے وقت اور سمٹتی ہوئی دنیا جسے گلوبل ویلیج بھی کہا جاتا ہے کوئی بھی معاشرہ باقی دنیا کے اثرات سے بچ کر نہیں رہ سکتا۔ یہاں بھی ایسی ہی صورت حال ہے اور آج جاپان دنیا بھر کے مقبول کھانوں کا مرکز بن گیا ہے۔ اس کی بے شمار وجوہات بیان کی جاتی ہیں جن میں سے ایک دلچسپ وجہ جاپانیوں کا تاریخی اعتبار سے پست قامت ہونا بھی ہے۔ یہاں یہ خیال مقبول ہے کہ باہر کی دنیا کے رنگ برنگے کھانوں کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کے اوسط قد میں قابل ذکر اضافہ ہوا ہے۔ نوجوان نسل واضح طور پر بزرگ نسل کی نسبت طویل قامت نظر آتی ہے۔ میکلین گائیڈ کی جانب سے حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب ''ٹوکیو'' آج کے جاپان میں لوگوں کے کھانے کے متعلق رجحانات کو واضح کرتی ہے۔

پاکستانی کھانے بھی یہاں بہت شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ ہمارے مرچ مصالحہ والے چٹ پٹے کھانوں کی مقبولیت مقامی لوگوں میں دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ یہاں پاکستانی ریستورانوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان ریستورانوں کے گاہکوں کی غالب اکثریت جاپانیوں پر مشتمل ہے۔ ویسے تو یورپ اور امریکہ میں بھی بہت سے پاکستانی ریستوران موجود ہیں لیکن میرے مشاہدے کے مطابق ان ریستورانوں کے گاہک بھی عموماً برصغیر سے ہی تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کو مذاقاً دیسی بھی کہتے ہیں۔ گورے مجھے مرچ مصالحے سے خوفزدہ محسوس ہوئے لیکن جاپانی ہماری خوراک کو مزیدار چیلنج سمجھتے ہیں۔

پاکستانی کھانوں کی یہاں مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ پاکستان سے تعلق رکھنے والے ہمارے دوست بزنس مین رمضان صدیق صرف ٹوکیو اور اس کے گرد

ونواح میں ''صدیق ریستوران'' کے نام سے 25 پچیس کے قریب ریستوران چلا رہے ہیں اسی طرح ایک انڈین پنجابی کی بھی ''سمراٹ ریسٹورنٹ'' کے نام سے دیسی کھانوں کی ایک چین ہے۔

صرف ٹوکیو ہی تک یہ بات محدود نہیں اگر دیگر شہروں کی بات کریں تو وہاں بھی پاکستانی لوگ دھڑا دھڑ ریستوران کھول رہے ہیں۔ ساحلی شہر نیگاتا میں ''نائیل'' کے نام سے سات ریستوران چلانے والے پاکستانی چوہدری کفیل سے جب میں نے یہ پوچھا کہ پاکستانی کھانوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی کیا وجہ ہے جبکہ قیمت کے حساب سے بھی یہ جاپانی کھانوں کی نسبت خاصے مہنگے ہیں تو وہ جواب میں جاپانی میڈیا کے شکر گزار نظر آئے جس میں وقتاً فوقتاً یہ ذکر ہوتا رہتا ہے کہ پاکستانی کھانے دماغ اور دانتوں کے لیے بہت اچھے ہیں جس کی وجہ سے بہت سے لوگ جو دماغ اور دانتوں کے بارے میں ذرا حساس ہیں ہمارے ریستورانوں کا رخ کرتے ہیں اور اس چکر میں ہمارے چٹ پٹے کھانے دھڑا دھڑ بک رہے ہیں۔ اب اللہ جانے یہ بات کہاں تک درست ہے؟ ایک منفرد پہلو یہ بھی ہے کہ امریکہ اور یورپ کے برعکس دیسی کھانوں کے کاروبار میں یہاں ہندوستانیوں کی نسبت پاکستانیوں اور نیپالیوں کی تعداد زیادہ ہے۔

کھانے کا ذکر چلا ہے تو گزشتہ روز ٹوکیو میں کھانا کھلانے والے روبوٹ کی نمائش کا تذکرہ بھی قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ Secom کمپنی کی ایجاد یہ ربورٹ دیکھنے میں ٹیبل لیمپ کی طرح لگتا ہے۔ گزشتہ روز مائی سپون (My Spoon) نامی اس روبوٹ نے عملی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کمپنی کے ایک ملازم کو کھانا کھلایا جسے نمائش کے تمام شرکاء نے بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ مائی سپون نامی یہ روبوٹ واقعی ایک چمچ کا کام کرتا ہے بس اس کو استعمال کرنے کے لیے آپ کو ہاتھوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کے سنسر آپ کے منہ کی حرکت کے ساتھ ساتھ چمچ کو حرکت میں لاتے ہیں اور یہ نرم گرم ہر طرح کی چیزیں کھلانے کی صلاحیت رکھے ہوئے ہے۔

اس ایجاد کا بنیادی مقصد معزور اور بیمار افراد کو سہولت پہنچانا ہے جو کھانا کھانے کے لیے بوجہ ہاتھ استعمال نہیں کر سکتے۔ جاپان اور خصوصاً یورپ میں معذور افراد کی دیکھ بھال کے متعلق ادارے اس ایجاد کو ایک انقلاب قرار دے رہے ہیں۔ اپنی نمائش کے پہلے دن ہی مذکورہ کمپنی نے 300 کی تعداد میں My Spoon روبوٹ فروخت کیے ہیں۔ اس روبوٹ کی قیمت پاکستانی روپوں میں تقریباً چار لاکھ روپے بنتی ہے۔ کھانے پینے کی اشیاء کے معیار کا یہاں کتنا خیال رکھا جاتا ہے اس کا اندازہ اس خبر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جس کے مطابق وزارتِ خوراک اگلے سال کی ابتدا سے بازار میں فروخت ہونے والے گوشت کا DNA ٹیسٹ کرے گی تاکہ پتا چلایا جا سکے کہ گوشت جاپان کے اندر پیدا ہونے والے جانور کا ہے یا پھر باہر سے آیا ہے۔ حال ہی میں کیوٹو یونیورسٹی کی طرف سے کی جانے والی تحقیق کے مطابق جاپان میں پیدا ہونے والی گائے کا DNA آسٹریلیا یا امریکہ جو کہ جاپان کو گوشت برآمد کرنے والے سب سے بڑے ممالک ہیں ان میں پرورش پانے والی گائے کے DNA سے مختلف ہے۔ اس ٹیسٹ کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہاں مقامی گوشت کی مانگ میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی قیمت بھی بیرون ملک سے درآمد شدہ گوشت سے زیادہ ہے اس لیے باہر سے گوشت درآمد کرنے والی بعض کمپنیاں اس پر جاپانی لیبل لگا کر بیچ رہی تھیں۔ وزیرِ خوراک نے نیا قانون پیش کرتے ہوئے بڑا دلچسپ جملہ کہا کہ لوگ گوشت کا لیبل تو تبدیل کر سکتے ہیں لیکن اس کا DNA تو تبدیل نہیں کر سکتے۔

جاگتا جہنم

آج کل یہاں کے کاروباری حلقوں میں جس خبر نے دھوم مچا رکھی ہے وہ جاپان کی مشہور توشیبا کمپنی اور امریکہ کے سب سے امیر آدمی بل گیٹس کی کمپنی ٹیرا پاور(Terra Power) کے درمیان ہونے والا ایٹمی ٹیکنالوجی کے متعلق اشتراک کا معاہدہ ہے۔بل گیٹس کے پاس ایک دہائی سے زیادہ عرصہ تک دنیا کے امیر ترین آدمی ہونے کا اعزاز رہا ہے لیکن اس سال دولت کے اعتبار سے میکسیکو کے کارلوس سالم نے انہیں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ہمارے بعض قارئین کے لیے شاید یہ نیا انکشاف ہو کہ کمپیوٹر کی دنیا میں ونڈوز پروگرام Windows کے ذریعے انقلاب لانے والے مائیکروسافٹ کمپنی کے سابق چیئرمین بل گیٹس ایٹمی توانائی کے حصول کے لیے استعمال ہونے والی ٹیکنالوجی فراہم کرنے والی کمپنی Terra Power کے بھی مالک ہیں۔توشیبا کارپوریشن ایٹمی ٹیکنالوجی کے حوالے سے نا صرف جاپان میں سرِ فہرست ہے بلکہ تمام دنیا میں توانائی کے لیے ایٹمی ٹیکنالوجی فراہم کرنے میں لیڈر مانی جاتی ہے۔ مذکورہ بالا دونوں کمپنیوں کے درمیان طے پانے والے معاہدے کے مطابق وہ مشترکہ طور پر ایک ایسا جدید ترین ایٹمی ری ایکٹر بنائیں گی جسے سو سال تک مرمت نہ کرنا پڑے اور وہ بغیر کسی وقفے کے سو سال تک توانائی فراہم کرتا رہے گا۔

آج کل دنیا میں استعمال ہونے والے ہر ایٹمی ری ایکٹر کا چند سال بعد ایٹمی ایندھن تبدیل کرنا پڑتا ہے۔بل گیٹس نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ وہ فوری طور پر اس پروگرام میں کئی ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تاہم

اس مشترکہ منصوبے کے لیے طے پانے والے معاہدے کی قریبی خبر رکھنے والوں کا یہ کہنا ہے کہ جدید نیوکلیئرری ایکٹر کا کام ابھی تک توشیبا اور Terra Power کے درمیان معلومات کے تبادلے کی حد تک ہے۔سوسال تک توانائی فراہم کرنے والے اس مجوزہ نیوکلیئرری ایکٹر کے خیال کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے ابھی بہت ساری عملی مشکلات سے نمٹنا ہوگا اور ابھی کئی امتحان راستے میں حائل ہیں جن سے اگر کامیابی سے نمٹ لیا گیا تب بھی کم از کم دس سال کا عرصہ درکار ہوگا۔ان تمام باتوں کے باوجود امیر ترین بل گیٹس اور نیوکلیئر ٹیکنالوجی کی لیڈر کمپنی توشیبا کے درمیان طے پانے والا معاہدہ غیر معمولی نوعیت کا ہے اور اس بات کی امید کی جاسکتی ہے کہ اس معاہدے کے نتیجے میں بننے والا ایٹمی ری ایکٹر بھی غیر معمولی نوعیت کا ہوگا اور دنیا کو درپیش توانائی کے بحران کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

امریکی اور جاپانی کمپنی کے درمیان ایٹمی ٹیکنالوجی کے معاہدے کا ذکر کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر خیال جنگ عظیم دوم کی طرف بھی چلا جاتا ہے۔1945 میں جنگ عظیم کے آخری دنوں کا تذکرہ ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکی ایٹمی بمباری اب کچھ ہفتوں کی دوری پر ہے۔10 مارچ1945 کو ہونے والی امریکی بمباری جسے تاریخ کی کتابوں میں ''ٹوکیو کی عظیم بمباری'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، گزر چکی ہے اور اس بمباری کے نتیجے میں ایک لاکھ سے زیادہ لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔اس بمباری کے دو مہینے بعد 25 مئی 1945 کو ایک دفعہ پھر امریکہ کی طرف سے فضائی بمباری ہوئی جسے تاریخ میں ''جاگتا جہنم'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس حملے میں 32000 بتیس ہزار افراد نے زندگی کی بازی ہاردی۔ جاگتی جہنم نامی اس بمباری سے زندہ بچ جانے والا ایک عینی شاہد یوشی زاوا تھا۔دو دہائیاں قبل 78 سال کی عمر میں فوت ہو چکا ہے۔گزشتہ مہینے اس کے بیٹے کو اپنے باپ کی تحریر کردہ 1945ء کے امریکی حملے اور اثرات کے متعلق بیس صفحات پر مشتمل یاداشتیں ملی ہیں۔جاگتا جہنم کے نام سے تحریر کردہ ان یاداشتوں کا آج کل یہاں کے اخبارات میں کافی چرچا ہے: ان میں امریکی حملے کا تفصیلی ذکر ملتا ہے جس میں امریکی

طیاروں نے ٹوکیو کے رہائشی علاقے کے ساتھ ساتھ شاہی محل کو بھی نشانہ بنایا تھا۔ اپنی یاداشتوں میں 25 مئی 1945 کی رات کا ذکر کرتے ہوئے یوشی زاوا جو کہ اس وقت ٹوکیو اسٹیشن کی طرف پیدل جا رہا تھا یوں لکھتا ہے کہ میں گھر جانے کے لیے ٹوکیو اسٹیشن سے ٹرین پکڑنا چاہتا تھا اور تیز قدموں سے اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا کہ میں نے دھماکوں کی آوازیں سنیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر آگ کے ایک بہت بڑے گولے میں تبدیل ہو گیا۔ امریکی جہاز ایک کے بعد ایک ہمارے سروں سے گزر رہے تھے اور اندھا دھند بارودی گولے برسا رہے تھے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ٹوکیو اسٹیشن مکمل طور پر آگ کی زد میں آ گیا اور اس کی چھت سے گہرا سیاہ دھواں اٹھ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ میں مکمل طور پر جل جاؤں گا اور میرا جسم راکھ بن جائے گا۔ شعلوں سے بچتے بچاتے میں نے بھاگ کر قریبی دریا میں چھلانگ لگا دی اور باقی لوگوں کو بھی دریا میں کود جانے کا مشورہ دیا۔

علی الصبح اس نے گھر پیدل جانے کا فیصلہ کیا جب ارد گرد کی آگ مدھم پڑنے لگی۔ اسٹیشن سے اس کا گھر 12 کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ ''جاگتا جہنم'' دراصل اسی مسافت کو طے کرنے کے دوران گرد و پیش کے مناظر اور حالات سے متعلق دستاویز ہے جو اس نے اسٹیشن سے گھر پیدل جاتے ہوئے راستے میں دیکھے۔ اس کے بیان کے مطابق کہیں بچے اپنی ماؤں کی جلی ہوئی لاشوں سے لپٹ کر رو رہے تھے تو کہیں لوگ خون کی قے کر رہے تھے یا پھر خون میں لتھڑے اور آگ کے شعلوں سے بھسم وجود ہر طرف بکھرے نظر آ رہے تھے اور لاشوں کے ساتھ ساتھ وہ لوگ جو مرنے کے انتظار میں تھے۔ ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو ابھی زندہ تھے لیکن ماحول کی وحشت کے سبب خود کو مردہ تصور کیے ہوئے تھے۔ یہ یاداشتیں اس نے اپنی بیوی کے لیے لکھی تھیں جو اس وقت اپنے والدین کے پاس کسی دوسرے شہر میں مقیم تھی لیکن یوشی زاوا کے بیٹے نے انہیں شائع کروا دیا ہے جب اس سے پوچھا گیا کہ اس نے اپنے باپ کی یاداشتوں کو کیوں شائع کروایا تو جواباً اس نے بتایا کہ یہ مسودہ برآمد ہونے کے بعد جب میں نے پڑھا تو پہلے میں نے اپنے والد کی تقلید میں ٹوکیو

اسٹیشن سے اپنے گھر تک کا سفر پیدل طے کیا اس دوران میں نے
محسوس کیا کہ گو آج یہاں لوگوں کی زندگی بہت پر سکون ہے لیکن اس عظیم جنگ کا ریکارڈ رکھنا ہماری ذمہ داری ہے تا کہ آنے والی نسلیں جنگ سے دور رہیں۔اسی تناظر میں ''جاگتا جہنم'' کے نام سے امریکی بمباری کی یاداشتوں کو شائع کر کے تاریخ کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔

جاپان میں رمضان المبارک

جاپان میں مقیم مسلمان برادری روایتی مذہبی جوش وخروش سے رمضان المبارک مناتی ہے۔ یہاں رمضان کا مہینہ دیگر ملکوں سے اس لحاظ سے منفرد ہوتا ہے کہ یہاں اس کی حیثیت ایک تہوار کی سی بھی ہے۔ ملک کی تمام مساجد میں افطار کا اہتمام ہوتا ہے اور زیادہ تر لوگ مسجد ہی میں افطار کو ترجیح دیتے ہیں، جو کہ یہاں مقیم مسلمان برادری کے باہمی میل جول اور تعلق کا اہم ذریعہ بھی ہے۔ جاپان کے تقریباً تمام اہم شہروں میں مساجد موجود ہیں اور جن یونیورسٹیوں یا کالجز میں مسلمان طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں وہاں بھی مسجد یا مصلیٰ کا انتظام ضرور موجود ہے۔ رمضان کی نسبت سے پاکستان اور دیگر کئی ممالک سے حفّاظ کرام تراویح پڑھانے کے لیے رمضان میں یہاں آئے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ زیادہ تر مساجد کا انتظام وانصرام پاکستانیوں کے ہاتھ میں ہے بلکہ نصف سے زیادہ مساجد تو تعمیر بھی پاکستانیوں نے ہی کی ہیں۔ یہاں کی سب سے قدیم مسجد کوبے شہر کی جامع مسجد ہے جسے 1935 میں متحدہ ہندوستان سے آئے ہوئے تاجروں نے تعمیر کیا تھا۔ جاپان کی سب سے بڑی مسجد ٹوکیو میں واقع ترک مسجد ہے جس کا انتظام ترکی کی حکومت چلاتی ہے۔ یہ مسجد بھی خاصی قدیم ہے۔ مسلمان ممالک میں سے روایتی طور پر ترکی کے ساتھ جاپان کے تعلقات سب سے زیادہ مضبوط رہے ہیں۔ جنگ عظیم اول میں دونوں ممالک حلیف بھی تھے اور جغرافیائی حوالے سے ان کی شراکت داری کی وجہ دونوں کا مشترکہ دشمن روس رہا ہے۔ یاد رہے کہ جاپان اور ترکی نے روس کے خلاف کئی جنگیں لڑی ہیں اور جاپان

کے چار جزیرے اب بھی روس کے قبضے میں ہیں۔ جاپان میں سب سے پہلے مقامی مسلمان بھی وہ لوگ تھے جو کہ ترکی میں جاپانی سفارتی عملے میں شامل تھے۔ انیسویں صدی کے آخری عشرے میں ان لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ ٹوکیو کی ترک مسجد کی زمین بھی جاپانی شہنشاہ نے تحفے میں ترکی کو دی تھی۔ ایک دلچسپ تحقیق یہ بھی سامنے آئی ہے کہ یہاں پہلی مسجد 1905 میں روسی جنگی قیدیوں نے قید کے دوران تعمیر کی تھی یا ان سے تعمیر کروائی گئی تھی۔ 1905 میں روس اور جاپان کی جنگ کے دوران تیس ہزار کے قریب روسی فوجی جنگی قیدی بنا لیے گئے تھے جن میں سے ایک ہزار کے قریب مسلمان تھے۔ یہ لوگ ایک سال کے قریب جاپان میں قید رہے اور بعض جنگی قیدی دوران قید ہی وفات پا گئے۔ جن کی قبریں اب بھی اوساکا شہر (Osaka) کے نواح میں موجود ہیں جن کے کتبوں پر قرآنی آیات اور ہلال کا نشان انہیں مسلمان ثابت کرتا ہے۔ ان قبروں کے پاس ہی ایک یادگاری مینار بھی موجود ہے جس پر عیسائی اور یہودی دعاؤں کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات اور دعائیں بھی کنداں ہیں۔ مذکورہ مسجد کے وجود کا ثبوت جاپانی شہنشاہ کا 1905 میں روسی بادشاہ زار کو لکھا گیا وہ خط بھی ہے جس میں زارِ روس کو یہ یقین دلایا گیا ہے کہ جاپان کی قید میں موجود اٹھائیس ہزار فوجیوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے اور عیسائی و مسلمان و یہودی قیدیوں کے لیے عبادت خانے تعمیر کیے گئے ہیں اور وہ اپنی عبادت گاہوں میں کامل آزادی کے ساتھ اپنی مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں، اسی سلسلے میں روس کی نیم خودمختار ریاست تاتارستان کے سابق گورنر یاشن سانخ نے ایک مضمون بھی تحریر کیا ہے جس میں جاپان کی اس پہلی مسجد کے متعلق تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ بدقسمتی سے اب یہ مسجد معدوم ہو چکی ہے۔

روایت کا نیا رنگ

یہ بات درست ہے کہ آج کی دنیا ایک عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے جس کی وجہ سے دنیا کے کسی بھی کونے میں ہونے والے اہم واقعہ کی اطلاع بغیر کسی تاخیر کے کرہ ارض پر ہر جگہ اسی طرح پہنچ جاتی ہے جیسے کسی چھوٹے سے گاؤں میں ہونے والا کوئی بھی واقعہ چھپائے نہیں چھپتا بلکہ فوراً ہی گاؤں کے ہر فرد کے علم میں آجاتا ہے۔شاید اسی لیے دنیا کو عالمی گاؤں کہتے ہیں عالمی شہر نہیں کہتے۔ اس حقیقت کے باوجود مشرق اور مغرب کے معاشروں میں زندگی گزارنے کے طریقوں میں اب بھی بہت بڑا فرق ہے اور اب تک دنیا میں کوئی مشترکہ عالمی ثقافت وجود میں نہیں آئی ہے۔اس کی ایک بڑی مثال شادی بیاہ کے معاملات ہیں۔مغرب میں شادی کے معاملے میں والدین کا کردار اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے لیکن یہاں ایسا معاملہ نہیں ہے۔مشرقی روایات کے مطابق بچوں کے والدین ان کے جیون ساتھی کے انتخاب میں اثر انداز اور معاون تو ہوتے ہی ہیں اس کے ساتھ ساتھ پچھلے چند سالوں سے جاپان کے بڑے شہروں میں ''شادی میٹنگ'' کی مقبولیت میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔

''شادی میٹنگ'' کے نام سے ہونے والی ان تقریبات میں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے والدین اپنے بچوں کے لیے مناسب رشتے تلاش کرنے کے لیے آتے ہیں۔ایسی تقریبات کا اہتمام عام طور پر شادی گھر چلانے والی کمپنیاں کرتی ہیں۔ان رشتے تلاش کرنے کی تقریبات میں اکثریت ان والدین کی ہوتی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے بچوں کی

شادی کی عمر ہو چکی ہے لیکن ان کے بچے شادی کرنے کی جلدی میں نہیں ہیں۔اپنے بچوں کی شادی کی عمر گزرتے دیکھ کر والدین معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ان تقریبات کا احوال بھی خاصا دلچسپ ہوتا ہے۔عام طور پر سو کے قریب والدین شریک ہوتے ہیں جن میں سے 50 لڑکوں کی طرف سے اور 50 لڑکیوں کی طرف سے آئے ہوتے ہیں۔لڑکوں کی نمائندگی عام طور پر ان کی مائیں کرتی ہیں۔سب شرکاء اپنے بچوں کی تصاویر اور ان کے متعلق بنیادی معلومات ساتھ لے کر آتے ہیں۔ تقریب کے آغاز میں لڑکے والوں اور لڑکی والوں کو الگ الگ کھڑا کر دیا جاتا ہے اور پھر دونوں اطراف کے والدین گھل مل جاتے ہیں۔ ہاتھوں میں اپنے بچوں کی تصاویر لیے ایک دوسرے سے معلومات کا تبادلہ اور گپ شپ کرتے ہیں۔تصاویر کا تبادلہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ٹیلی فون نمبر لیتے ہیں اور اس طرح شادی کے متعلق معاملات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ایسی ہی ایک تقریب میں شریک ایک خاتون بتاتی ہیں کہ جب بچوں کے والدین آپس میں ملتے ہیں تو اس سے ان کو ایک دوسرے کے گھر کے ماحول کا اندازہ ہوتا ہے۔میں اپنی بیٹی کے لیے رشتے کی تلاش میں آئی تھی جب میں لڑکے کے والدین سے ملی تو مجھے وہ بہت مہذب اور شریف لگے جس سے میں نے اندازہ کیا کہ ان کا بیٹا بھی غالب امکان یہی ہے کہ ان جیسا ہی ہوگا کیونکہ انہی لوگوں نے اس کی تربیت کی ہے۔اس خاتون کو امید تھی کہ اس کی بیٹی اور ان کا لڑکا ایک دن میاں بیوی ہوں گے۔رشتوں کی تلاش کے لیے ہونے والی ان تقریبات کے نتائج کافی مثبت ہیں۔ایسی ہی ایک تقریب کے نتیجے میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے والی ایک 37 سالہ خاتون اپنا احوال سناتی ہیں کہ ان کی والدہ کہ یہ رائے تھی کہ وہ تیس سال سے پہلے شادی نہ کرے لیکن جب وہ زندگی کی تیس بہاریں دیکھ چکی تو اس کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اب اس سے شادی کے خواہش مندوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔تین سال پہلے اس کی ماں نے شادی میٹنگ کی کچھ تقریبات میں شرکت کی جس کے نتیجے میں ایک لڑکا ملا جو کہ اب مذکورہ خاتون کا شوہر ہے۔ اور یہ سارا کچھ چار ماہ کے اندر اندر ہو گیا، گویا چٹ منگنی پٹ

بیاہ۔اس کا کہنا تھا کہ اگر میں خود لڑ کا تلاش کرتی تو ممکن ہی نہ تھا کہ اتنے مختصر عرصے میں اس سے شادی تک بات پہنچتی۔اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے کہا کہ شادی میٹنگ کا مطلب یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکی دونوں کے خاندان شادی پر آمادہ ہیں اور لڑکا لڑکی بھی ازدواجی زندگی شروع کرنے میں سنجیدہ ہیں۔ ہماری شادی ہونے سے پہلے ہی ہمارے خاندان ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے۔

ایسی تقریبات کی مقبولیت کی وجہ اور والدین کی بڑھتی ہوئی بے چینی اس لیے قابلِ فہم ہے کہ جاپان میں تیس سال کی عمر سے پہلے شادی کرنے والے افراد کی شرح پچھلے پچیس سالوں میں تین گنا کم ہوگئی ہے۔ وزارتِ داخلہ کے اعداد وشمار کے مطابق جاپان میں 30 سال سے زائد عمر کی خواتین میں سے 32% فیصد غیر شادی شدہ ہیں اور مردوں میں یہ شرح 47% فیصد ہے۔

شادی کا ذکر کرتے ہوئے جی تو نہیں چاہتا کہ طلاق کا لفظ لکھا بھی جائے لیکن لفظ تلخ صحیح مگر ایک ناخوشگوار حقیقت تو بہر حال ہے۔خبر یوں ہے کہ ٹوکیو میں ایک شخص نے دنیا کا پہلا ''طلاق مینشن'' قائم کیا ہے۔جس میں ناآسودہ جوڑے اپنی شادی ختم کرنے کی تقریب منعقد کرتے ہیں۔ اس انوکھی تقریب کا ماحول بالکل شادی کی طرح ہی ہوتا ہے جس میں شوہر اور بیوی کے دوست رشتہ دار بن سنور کر شریک ہوتے ہیں۔ ہال کو بھی شادی کی طرح ہی سجایا جاتا ہے جس میں شادی شدہ جوڑے طلاق کا اعلان کرتے ہیں اور شادی کی انگوٹھی پر ایک ہتھوڑی سے معمولی سی ضرب لگاتے ہیں۔ ہتھوڑی پر کچھوے کا نشان بنا ہوا ہے۔ کچھوا یہاں تبدیلی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔طلاق مینشن کے مالک ہیروکی نے بتایا کہ پہلے سال کے دوران اس کے طلاق مینشن میں 25 جوڑوں نے علیٰحدگی کی تقریبات کا انعقاد کیا اور وہ فی جوڑا پچاس ہزار روپے وصول کر رہا ہے۔اس کا یہ مینشن اتنا مقبول ہوا ہے کہ 9 ہزار افراد نے طلاق مینشن کے متعلق معلومات حاصل کی ہیں۔اس منفرد مینشن کے قیام کی وجہ بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ طلاق کے لیے تقریب کے اہتمام کا بنیادی خیال یہ

تھا کہ اس سے علیٰحدگی اختیار کرنے والا جوڑا اپنے فیصلے کو خوشی کا رنگ دے سکتا ہے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ عالمی مالیاتی بحران نے یہاں کے لوگوں کی ازدواجی زندگی پر بھی انتہائی منفی اثرات مرتب کیے ہیں اور صرف گزشتہ برس ڈھائی لاکھ سے زیادہ شادی شدہ جوڑوں کے درمیان طلاق ہوئی ہے۔

اولاد کی جنس کا انتخاب ممکن ہوگا؟

پنجاب کی سڑکوں کے دائیں بائیں واقع دیواریں اکثر حکیموں اور عاملوں کے جن دعوؤں سے بھری نظر آتی ہیں، ان میں سے ایک نمایاں دعویٰ اولادِ نرینہ کی فراہمی کے متعلق ہوتا ہے۔ میڈیکل سائنس ابھی اس شعبے میں کافی پیچھے نظر آتی ہے۔ مگر لگتا ہے کہ اب زیادہ دیر تک اس شعبے پر ہمارے حکیموں، عاملوں اور پیر صاحبان کی اجارہ داری قائم نہیں رہے گی۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ جاپان کی ہوکائیدو یونیورسٹی کے سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے طویل تحقیق اور محنت کے بعد، ایک کامیاب تجربہ کے ذریعے مرغی کے ایسے 33 انڈوں سے، جو کہ مادہ چوزے کو جنم دینے جا رہے تھے، انڈوں کے اندر ان کی جنس تبدیل کر دی گئی اور ان سے نر چوزوں نے جنم لیا ہے۔ یہاں یہ ذکر کرتا چلوں کہ پرندوں کے انڈوں میں نر اور مادہ انڈے الگ الگ ہوتے ہیں جنہیں با آسانی الگ کیا جا سکتا ہے۔ یہ شناخت قطعی مشکل نہیں ہے۔

تفصیل کچھ یوں ہے کہ ممالیا جانوروں میں جنسیات پر تحقیق کے شعبے کے لیے مخصوص یونیورسٹی کے پروفیسر آساتو کی سربراہی میں قائم ایک تحقیقاتی ٹیم نے چند روز پہلے اپنے تجربات کے نتائج کا اعلان کیا ہے۔ امریکی اکیڈمی آف سائنس کے جریدے نے اس تحقیق کے نتائج کی جزیات کو من وعن شائع کیا ہے جس نے سائنس کے شعبے میں بالعموم اور جینیاتی انجینئرنگ کے شعبے میں بالخصوص تہلکہ مچا دیا ہے۔ میں زوالوجی کی پیچیدہ اصطلاحات استعمال کر کے قارئین کو بور کرنا تو نہیں چاہتا مگر یہ ذکر ضروری ہے کہ ہوکائیدو یونیورسٹی کے سائنس دانوں کی یہ ٹیم اس بات پر تحقیق کر رہی ہے کہ وہ اپنے کامیاب تجربے،

جس میں مادہ انڈوں کی جنس تبدیل کر کے نر انڈوں اور پھر چوزوں میں تبدیل کیا گیا ہے، کیا اس عمل کو ریورس بھی کیا جا سکتا ہے؟ یعنی، نر انڈوں کو مادہ میں بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے کہ نہیں۔ اگلے مرحلے میں اس تحقیقاتی ٹیم کا ارادہ ممالیا جانوروں پر یہ تجربہ آزمانے کا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جو ''جین'' پرندوں میں جنس کا تعین کرتا ہے، جانوروں میں بھی وہی جین، جسے ''ہیموجین'' کہتے ہیں، نومولود کی جنس کے تعین میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے، اسی لیے قوی امکان ہے کہ جانوروں میں بھی یہ تجربہ کامیاب رہے گا۔ لمبی کہانی کو مختصراً بیان کیا جائے تو سائنس دان مادہ ''ایمبریو'' کو نر ''ایمبریو'' میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب ہمارے لوگ جو فرمائشیں حکیموں، عاملوں اور روحانی شخصیات سے کرتے ہیں، اولاد کی جنس کے متعلق ان خواہشات کا اظہار ڈاکٹر حضرات سے کیا کریں گے۔

میں جن دنوں گورنمنٹ کالج لاہور سے بیالوجی کے شعبے میں گریجوایشن کر رہا تھا، میرا ایک دوست اور ہم جماعت حُسین صلواتی جینیاتی انجینئرنگ کا عاشق تھا، وہ اس شعبہ میں پی ایچ ڈی کا ارادہ رکھتا تھا، وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ مستقبل میں بچے کی جنس کا چناؤ تو بڑی آسان چیز ہو گی، والدین اپنی اولاد کی آنکھوں، بالوں اور جلد کے رنگ کا انتخاب بھی خود کیا کریں گے۔ حُسین رضا صلواتی جو کہ جینیات میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد آج کل برطانیہ میں مقیم ہے، اس کی باتیں اس وقت تو بیوقوفانہ لگتی تھیں لیکن آج محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ تو سچ ہی کہہ رہا تھا، ہمیں ہی اتنی سمجھ نہیں تھی۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ میں حکیموں، پیروں اور عاملوں کے خلاف ہرگز نہیں ہوں، یہ لوگ ہمارے معاشرے کا قابل قدر حصہ اور ہمارا تاریخی ورثہ ہیں۔ جہاں تک ان سے منسوب جعل سازی اور دھوکہ دہی کے واقعات کا تعلق ہے تو عرض ہے کہ بازار میں جعلی کرنسی نوٹوں کی گردش بذاتِ خود اصلی کرنسی نوٹوں کے وجود کی دلیل ہے، کھرے سکے ایک حقیقت ہیں، اسی لیے تو کھوٹے بھی چل جاتے ہیں۔ معاشیات کا قدیم اصول ہے کہ کھوٹے سکے، کھرے سکوں سے بھی زیادہ تیزی سے چلتے ہیں بلکہ بازار میں غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔

جاپان کا پرائمری نظامِ تعلیم

تھانیدار خان سے میری کوئی زیادہ دوستی نہیں ہے۔ ہمارا کاروبار کیونکہ ایک ہی نوعیت کا ہے، اس لیے اکثر ملاقات ہو جاتی ہے۔ پچھلے سال فاٹا کے حالات سے تنگ آ کر، جہاں ایک طرف ڈرون طیارے بمباری کرتے ہیں اور دوسری طرف طالبان نامہربان ہیں، اپنی بیوی بچوں کو وہ جاپان لے آیا۔ اس کے چار بچوں کا داخلہ میرے شوروم سے ملحقہ سرکاری پرائمری سکول میں ہوا ہے۔ اب کبھی کبھی سکول سے چھٹی کے وقت وہ بچوں کو لینے کے لیے آتا ہے تو پہلے میرے پاس آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ جب بچوں کو لینے کے لیے سکول جاتا ہے، تو اپنی گاڑی میرے شوروم پر ہی چھوڑ جاتا ہے۔ میں یہ بات شاید نوٹ نہ کرتا مگر میرے ایک اور پاکستانی دوست بھی یہی عمل کیا کرتے تھے، ملک صاحب نے اب تو اپنی فیملی پاکستان شفٹ کر دی ہے، مگر جب ان کی بچی اس سکول میں پڑھتی تھی تو وہ بھی جب اسے لینے کے لیے آتے تو اپنی گاڑی میرے پاس کھڑی کر جاتے تھے، بچی کو سکول سے لے کر آتے اور پھر یہاں سے اپنے گھر یا دفتر کا رُخ کیا کرتے تھے۔ عقدہ یہ کھلا کہ پرائمری سکول میں بچوں کے والدین انہیں گاڑی میں لے کر آ یا پھر واپس لے جا نہیں سکتے۔ ذاتی سواری پر بچوں کی آمد و رفت پر پابندی ہے۔ ایک انکشاف یہ بھی ہوا کہ والدین اپنے بچوں کے لیے مرضی کا سکول بھی منتخب نہیں کر سکتے۔ بچے کی رہائش گاہ کے قریب ترین سکول کا انتخاب بلدیہ کرتی ہے۔ جب بچہ چھ سال کا ہو جائے تو بذریعہ ڈاک بلدیہ کی طرف سے والدین کو اطلاع ملتی ہے کہ اپنا بچہ فلاں سکول میں فوراً داخل

کروائیں، سبلد یہ کی طرف سے ملنے والی اس اطلاع کو حکم نامہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ نو سال تک تعلیم حاصل کرنا قانوناً لازم ہے اور خلاف ورزی کی صورت میں آئینی سزا مقرر ہے، مگر اس حکم کی خلاف ورزی ہوتی نہیں کیونکہ جاپان میں شرح خواندگی عملاً صد فیصد ہے، میں نے آج تک یہاں ایک بھی شخص ایسا نہیں دیکھا جسے پڑھنا، لکھنا نہ آتا ہو۔ صبح آٹھ بجے گھر سے بچے پیدل سکول پہنچتے ہیں اور پھر اسی طرح سر پر پیلی ٹوپی پہنے ساڑھے تین بجے واپس اپنے قدموں پر چل کے گھر پہنچتے ہیں۔ اس پابندی کا مقصد بچوں کو جسمانی طور پر مضبوط اور صحت مند بنانا ہے۔ صبح سویرے بچے اپنی رہائش گاہ سے نکل کر ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں اور پھر سڑک کے کنارے لائین میں پیدل چلتے ہوئے سکول کا سفر یوں طے کرتے ہیں کہ بڑی جماعتوں کے لڑکے، لڑکیاں آگے آگے ہوتے ہیں اور چھوٹی جماعتوں کے بچے ان کے پیچھے چلتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ بچوں کا خیال رکھنے والا کوئی نہیں ہوتا، ہر محلے میں روزانہ دو ماؤں کی ڈیوٹی لگتی ہے کہ وہ سکول جاتے ہوئے بچوں پر نظر رکھیں، جب تک کہ وہ اگلے محلے میں داخل نہ ہو جائیں، اگلے محلے میں بھی دو طالب علموں کی مائیں پیدل چلتے ہوئے بچوں کی راہ میں کھڑی ہوتی ہیں اور سکول تک بچے اپنی ماؤں کی نظروں میں ہی راستہ طے کرتے ہیں۔

پرائیویٹ سکول یہاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایک فیصد سے تو یقیناً کہیں کم ہیں، جو سکول نجی شعبے میں موجود ہیں وہ بھی غیر ملکیوں، یا پھر کسی اور ناگزیر وجہ سے قائم ہیں، بہر حال پورے جاپان کے معیاری نجی سکول انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ سرکاری سکولوں میں تعلیم بالکل مفت ہے، البتہ دوپہر کا کھانا بچوں کو سکول کی طرف سے مہیا کیا جاتا ہے جس کے معمولی سے اخراجات وصول کیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی بچہ یہ واجبات ادا نہ کر سکتا ہو، یا پھر نہ کرنا چاہے تو یہ بھی معاف کر دیے جاتے ہیں۔ گھر سے ٹفن میں کھانا لانے پر سخت پابندی ہے۔ مسلمانوں کے بچے کیونکہ صرف حلال کھاتے ہیں، ان کے لیے حلال کھانا بھی سکول والے ہی مہیا کرتے ہیں، گھر سے لے کر نہیں آ سکتے۔ کھانا تمام بچے اپنے اساتذہ کے ساتھ کمرۂ جماعت میں ہی کھاتے ہیں اور اس کے بعد آدھ گھنٹہ آرام کرتے ہیں۔ چھوٹے بچے

چونکہ جلدی تھک جاتے ہیں اس لیے ان کو ہر گھنٹے کے بعد دس منٹ کی چھٹی ہوتی ہے، ایک بار بیس منٹ اور پھر ایک گھنٹے کی لنچ بریک جسے ہم آدھی چھٹی کہتے ہیں۔ جس میں آدھا وقت کھانے کے لیے اور آدھا آرام کے لیے اور ہاں! بچوں کو کھانا تقسیم بھی بچے ہی کرتے ہیں۔ پرائمری سکول کے بچوں کا کوئی مخصوص یونیفارم نہیں ہوتا، صرف پیلے رنگ کی ٹوپی ہوتی ہے۔ ہفتے میں دو دن سکول سے چھٹی ہوتی ہے، یہ تعطیل بروز ہفتہ اور اتوار ہوتی ہے۔

یہاں سکول میں بچے کے فیل ہونے کا تصور نہیں ہے۔ تمام طلباء تعلیمی سال مکمل ہونے پر، جو کہ ہماری طرح مارچ کے مہینے میں ہوتا ہے، اگلی کلاس میں ترقی پا جاتے ہیں۔ پرائمری سکول چھ سال کا ہوتا ہے اور مڈل تین سالہ، یہ نو سالہ تعلیم لازمی ہے۔ دلچسپ بات ہے کہ اگر آپ کسی بچے سے اس کی عمر پوچھیں تو جواب میں وہ اپنی سکول کی کلاس بتاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ ہر جماعت کے تمام بچوں کا سنِ پیدائش یکساں ہوتا ہے، لہٰذا اگر کوئی بچہ کہہ رہا ہے کہ وہ تیسری جماعت کا طالب علم ہے تو وہ لازمی طور پر نو سال کی عمر کو پہنچا ہے۔ تمام بچوں کو اگلی جماعت میں ترقی دینے کا فائدہ یہ ہے کہ کوئی بھی بچہ احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوتا۔ ہر جماعت میں لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد برابر ہوتی ہے، جو کہ عموماً پچیس اور پینتیس کے درمیان ہوتی ہے۔ اساتذہ میں مرد اور خواتین معلمین کی تعداد بھی برابر ہوتی ہے۔ کلاس روم میں کمپیوٹر، ٹی وی کے علاوہ ویڈیو گیمز بھی بچوں کے لیے مہیا ہوتے ہیں۔ سکول کی ڈسپنسری میں ڈاکٹر ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ اساتذہ کا والدین سے قریبی رابطہ ہوتا ہے۔

میاں چنوں کے جس ایم سی پرائمری سکول میں میں نے تعلیم پائی وہاں کے اساتذہ بڑے شفیق اور محنتی تھے، طالب علموں سے ان کا رویہ اپنی اولاد جیسا تھا، اس کے باوجود ڈنڈے کا خوف ہمیشہ ہمارے سروں پر سوار رہتا تھا۔ ''مار نہیں پیار'' کی پالیسی کے تحت نونہالوں کو جسمانی سزاؤں کے خوف سے تو نجات مل چکی ہے، کئی مسائل مگر حل طلب ہیں۔ سردیوں میں ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھائی کرتے ہوئے ہمیں بڑی ٹھنڈ لگتی تھی، یقیناً اب بھی سرما میں بچوں کے لیے ٹاٹ پر بیٹھنا مشکل ہوگا۔ حکومت اگر ٹاٹ کی جگہ

سرکاری سکولوں میں ڈیسک یا کرسیوں کا بندوبست کر دے تو طلباء بہتر ماحول میں پڑھائی کر سکیں گے۔ دانش سکول ایک اچھا منصوبہ ہے جسے چاروں صوبوں تک پھیلانا چاہیے مگر اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ دیگر سرکاری سکولز میں بہتری لائی جائے جس میں اولین ترجیح پرائمری سکول ہوں۔ گزشتہ ایک صدی سے ہمارے سرکاری سکولوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔ مسجدوں میں نمازیوں کے لیے تو ٹھنڈے پانی کے کولر عموماً موجود ہیں، کیونکہ اہل ایمان اپنی مدد آپ کے تحت ان کا انتظام چلاتے ہیں مگر سرکاری سکولوں میں ننھے بچوں کو ٹھنڈے پانی کی نعمت میسر نہیں۔ اپنی حکومت سے جاپان کے سکولوں کے برابر سہولیات طلب کرنا تو حقیقت پسندانہ مطالبہ نہیں مگر گرمیوں کے موسم میں معصوم طلباء کو ٹھنڈا پانی اور ان کے پنکھوں کو بجلی فراہم کرنا تو سرکار کی ذمہ داری بنتی ہے۔

جاپان بھارت بُلٹ ٹرین معاہدہ

بہار کا استقبال جاپانی لوگ بڑے پر جوش انداز میں کرتے ہیں۔اس موسم میں چیری کے پھول کھلتے ہیں جنہیں جاپان کی روح بھی کہا جاتا ہے۔سال بھر انتظار کے بعد تین، چار دن کے لیے جب یہ پھول کھلتے ہیں تو لوگ چیری کے درختوں کے نیچے چٹائیاں بچھا کر ان پھولوں کے حُسن کی داد دیتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، دوستوں اور رشتہ داروں سے گپ شپ لڑاتے ہیں،ہنسی مذاق کرتے ہیں۔آج کل اخبارات کی سرخیوں میں، ہر دوسرے، تیسرے دن یہ خبر نظر آرہی ہے کہ فلاں شہر میں چیری کے پھول کھل اٹھے ہیں۔محکمہ ریلوے نے بہار کو خوش آمدید کہنے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ دنیا کی تیز ترین ٹرین سروس کا آغاز کر دیا ہے۔''ہایابوسا'' نامی اس ٹرین نے سفر کی اوسط رفتار 320 کلومیٹر فی گھنٹہ مقرر کر کے فرانس کی TGV ٹرین سے تیز ترین ہونے کا اعزاز چھین لیا ہے۔

تازہ خبر یہ ہے کہ جاپان اور ہندوستان کی حکومت کے درمیان عنقریب اس بلٹ ٹرین کے متعلق ایک معاہدہ طے پانے جا رہا ہے اس معاہدے کے تحت جاپان اپنی تیز رفتار ٹرین کی ٹیکنالوجی، جسے ''شن کان سین'' کہا جاتا ہے اور مذکورہ بالا ریکارڈ بنانے والی ٹرین بھی اسی بلٹ ٹرین سیریز کا حصہ ہے، بھارت کو فراہم کرے گا۔ یہاں کے سرکاری ذرائع بتاتے ہیں کہ مئی کے مہینے میں بھارتی وزیراعظم جاپان کا دورہ کریں گے،منموہن سنگھ اپنے اسی دورے کے دوران بلٹ ٹرین کے بارے معاہدے پر دستخط کریں گے، جس کے مطابق جاپان ہندوستان کے دو اہم شہروں، احمد آباد اور ممبئی کے درمیان ریلوے لائین بچھائے گا۔

یہاں آپ کو یہ بتا تا چلوں کہ بلٹ ٹرین، ریل کے عام ٹریک پر نہیں چل سکتی۔اس کے لیے خصوصی طور پر ٹریک بنایا جاتا ہے جسے مخصوص دھاتوں کی آمیزش سے، سطح زمین سے کم از کم بیس فٹ اونچا تعمیر کیا جاتا ہے تاکہ زمین کی سطح پر ہونے والی نقل وحرکت اور ٹریفک کی آمد ورفت سے ٹرین کی رفتار میں خلل نہ پڑے۔پہلی نظر میں تو یہ ریل ٹریک اوور ہیڈ برج ہی نظر آتا ہے، بالکل ایسے جیسے کنکریٹ کا کوئی طویل پُل ہو۔مغربی ہندوستان کے مذکورہ دوشہروں کا درمیانی فاصلہ پانچ سوکلومیٹر ہے، اس پانچ سو کلومیٹر کے فاصلے کو طے کرنے کے لیے اس وقت دس گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔ بلٹ ٹرین کی سروس شروع ہونے سے یہ فاصلہ دو گھنٹے میں سمٹ جائے گا۔ڈھائی سوکلومیٹر فی گھنٹہ کی یہ مجوزہ رفتار جس پر ٹرین سفر کرے گی، انتہائی محفوظ مگر سست خیال کی جاتی ہے۔جاپان میں اس وقت اسی ٹریک پر ٹیسٹ سپیڈ 580 کلومیٹر فی گھنٹہ ہے مگر اس رفتار پر حفاظت کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

اس منصوبے کی لاگت کا تخمینہ، پاکستانی کرنسی میں بات کریں تو 900 ارب روپے سے ایک کھرب روپے کے درمیان لگایا گیا ہے۔اس منصوبے میں جاپانی حکومت کے علاوہ دو بڑی پرائیویٹ کمپنیاں بھی شامل ہیں، کاواساکی ہیوی انڈسٹریز اور ایسٹ جاپان ریلوے کمپنی۔یوں تو متذکرہ کمپنیاں اور ''شن کان سین'' عالمی سطح پر کسی تعارف کی محتاج نہیں، مگر یہ پہلا موقع ہے کہ جاپان اس ٹیکنالوجی کو اپنے ملک سے باہر کسی دوسرے ملک کو بیچ رہا ہے۔جاپان اس منصوبے کی پہلی اینٹ رکھنے سے لے کر تکمیل اور پھر ریل کو چلانے تک کے تمام مراحل کو اپنی نگرانی میں مکمل کروائے گا۔ بھارت کے ساتھ اس ڈیل کو یہاں کا میڈیا ''پیکج انفراسٹرکچر ایکسپورٹ'' کے نام سے گفتگو کا موضوع بنائے ہوئے ہے۔ ریل کی بوگیاں، ریلوے لائین سے لے کر تمام انفراسٹرکچر اور ہندوستانی سٹاف کی تربیت سے لے کر نگرانی تک اس معاہدے کا حصہ بنیں گے۔

جاپان اور ہندوستان کے درمیان اس منصوبے پر پچھلے سال اکتوبر میں مذاکرات شروع ہوئے تھے۔امید ہے 2015 تک اس منصوبے کی تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا۔ انڈین

گورنمنٹ اس عرصے میں منصوبے کے لیے درکار زمین کی خریداری کا عمل مکمل کرے گی۔

ہندوستان اور پاکستان میں ریل کا آغاز انگریز کے دور میں ایک ساتھ ہوا تھا۔ اپنی تعمیر کے وقت ہمارا ریلوے نظام دنیا کا جدید ترین نظام تھا۔ برطانیہ اور برصغیر میں ریل کا یہ نظام یکساں تھا۔ افریقہ اور ویسٹ انڈیز میں ریلوے کی تعمیر پاک و ہند کے کاریگروں کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ افریقہ میں بسنے والے، برصغیر کا پس منظر رکھنے والے لوگوں میں اکثریت آج بھی انہی لوگوں کی ہے جن کے آباء و اجداد انگریز کے دور میں ریلوے تعمیر کرنے کے لیے وہاں لائے گئے تھے۔ آج بھی پاکستان ریلوے اور انڈین ریلوے کے انفراسٹرکچر میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ کہ آزادی کے بعد ہم ریلوے کو اس طرح ترقی نہیں دے سکے جس طرح ہندوستان نے اپنے ریلوے نظام کو ترقی دینے کی کوشش کی، اس کے باوجود دونوں ممالک میں ریلوے کا نظام اور حالت ملتی جلتی ہی ہے۔ مگر بلٹ ٹرین منصوبے کی تعمیر سے انڈین ریلوے ایک نئے عہد کا آغاز کر رہی ہے۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ دنیا بھر میں ریل مسافروں کی محفوظ اور تیز رفتار سفر کے لیے ترجیح ہے۔ پاکستان کا جغرافیہ ایسا ہے کہ اگر یہاں بلٹ ٹرین کا آغاز ہو جائے تو ملک کے درمیان کوئی بھی سفر چار، چھ گھنٹے سے زیادہ کا نہیں رہ جائے گا۔ ہماری موجودہ اور آنے والے حکومت کو سوچنا چاہیے کہ پاکستان معاشی طور پر کب تک اس قابل ہو جائے گا کہ اس کے عوام کو بھی بلٹ ٹرین کی سہولت فراہم کی جا سکے۔ ہمارا ملک قدرتی وسائل سے مالا مال اور جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے آئیڈیل خطہ ہے۔ ہمارے مسائل بھارت کی نسبت کم پیچیدہ ہیں۔ ہمارے ہاں لوگوں کا کم از کم معیارِ زندگی ہندوستان سے قدرے بہتر ہے۔ حالیہ عالمی سروے کے مطابق پاکستانی عوام بھارتی عوام سے زیادہ خوش ہیں۔ خوش باش ملکوں کی عالمی فہرست میں پاکستان کا سولہواں نمبر ہے، بھارت کا اس فہرست میں 32 واں نمبر ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہم لوگ بھارتیوں سے دوگنا خوش رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جنوبی ایشیاء کے ممالک کا انفراسٹرکچر اور معاشی فرق مستقبل میں بس اتنا ہی ہوگا، جتنا کہ یورپی

یونین کے کسی ایک ملک کا کسی دوسرے ملک کے ساتھ ہوسکتا ہے۔سارک ممالک کا باہمی فرق کبھی بھی امریکہ اور میکسیکو کے درمیانی فرق جیسا نہیں ہوسکتا۔امید کی جاسکتی ہے کہ بھارت کے بعد آئندہ دہائی میں پاکستان سمیت جنوبی ایشیاء کے دیگر ممالک کے لوگوں کو بھی بلٹ ٹرین کی سہولت میسر ہوگی۔جس طرح ہم عسکری شعبے اور کھیل کے میدانوں میں بھارت سے مقابلہ کرتے ہیں، معاشی اور سماجی میدان میں بھی ہمیں پیچھے رہنا گوارا نہیں ہونا چاہیے۔

سائبر کرائم کا نیا چیلنج

انٹرنیٹ نے ہماری دنیا بدل کر رکھ دی ہے۔ زندگی کا کون سا ایسا شعبہ ہے جس پر اس نے اپنے منفرد اثرات مرتب نہیں کیے ہیں؟ کچھ ماہرین کے خیال میں تو پہیے کی ایجاد کے بعد انٹرنیٹ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ایجاد ہے۔ صحافت کے شعبے کو ہی لے لیجئے! ہمیشہ سے قرطاس وقلم اس شعبہ کا علامتی نشان چلے آرہے ہیں، دنیا کے قدیم اور موثر ترین اشاعتی اداروں میں سے ایک ہفت روزہ ''نیوز ویک'' میگزین ہے، جو گزشتہ اسی سال سے انگریزی زبان میں دنیا کا سب سے مقبول ہفت روزہ پرچہ ہے۔ حال ہی میں نیوز ویک کی انتظامیہ نے یہ اعلان کیا ہے کہ اس سال کے خاتمے کے بعد ان کا پرچہ صرف انٹرنیٹ پر ہی پڑھا جاسکے گا۔ اگلے برس وہ نیوز ویک کو کاغذی پیراہن میں، جسے صحافتی زبان میں ہارڈ کاپی کہا جاتا ہے، شائع نہیں کریں گے۔

اطلاعات ونشریات کے شعبے میں جہاں انٹرنیٹ نے بے پناہ سہولتیں پیدا کی ہیں، وہاں اس ٹیکنالوجی کی وجہ سے دنیا بھر میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کو نت نئے چیلنجز کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ دنیا بھر میں انٹرنیٹ سے منسلک جرائم کے سلسلے میں نئی قانون سازی کی جارہی ہے۔ جس طرح نیکی انسانی سرشت کا حصہ ہے، اسی طرح برائی کی طرف مائل ہونے کی صلاحیت بھی انسانی ذہن کی کمزوری ہے جو اسے جرائم کی طرف لے جاتی ہے۔ حالات تو تبدیل ہوتے رہتے ہیں مگر انسانی جبلت قدیم ہے، انسان کے سوچنے کا ڈھنگ بھی ہمیشہ سے ایک جیسا ہے جس کے بارے میں سلطان باہُوؒ کا کہنا ہے کہ

خالق نے نے اسے تخلیق ہی ایسے کیا کہ:

نفی اثبات دا پانی ملیا، ہر رگ ہر جائی ہو

جرم کے بارے میں ایک ضرب المثل عالمی طور پر تسلیم شدہ اور مشہور ہے کہ کسی بھی سماج میں جرم کو کم تو کیا جا سکتا ہے، اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کرۂ ارض پر اس وقت، اور نہ ہی ماضی میں کبھی کوئی ایسا معاشرہ گزرا ہے جو جرائم کی آلائشوں سے بالکل پاک ہو۔ ہاں! وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ ان کی نوعیت، ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے، طریقۂ واردات بدل جاتا ہے۔ پہلے گائے، بھینس کی چوری کا تدارک بڑا چیلنج تھا تو ان دنوں آن لائین کریڈٹ کارڈ نمبروں کی چوری اہم مسئلہ بنا ہوا ہے۔ انٹرنیٹ جرائم سے جڑے ہوئے ایسے ہی ایک تازہ اور انتہائی سنجیدہ مسئلے کی طرف آپکی توجہ دلانا ہی اس تحریر کا بنیادی مقصد ہے۔

کمپیوٹر کی ہائی جیکنگ اور ریموٹ کنٹرول وائرس کی اصطلاح شاید آپ کے لیے نئی ہو......

چلیں بات اس طرح سے شروع کر لیتے ہیں کہ گزشتہ ہفتے پولیس ایک انیس سالہ نوجوان کو گرفتار کر لیتی ہے۔ اس پر الزام یہ عائد کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے کمپیوٹر سے مقامی بلدیہ کے دفتر کو ایک دھمکی آمیز خط ارسال کیا ہے۔ تفتیش کے دوران یہ نوجوان طالب علم اس جرم میں کسی بھی طرح ملوث ہونے سے انکار کرتا ہے، مگر پولیس تفتیش میں بعدازاں لڑکا اقبال جرم کر لیتا ہے۔ اقبالی ہوئے دو دن گزرتے ہیں تو یہ لڑکا پھر کسی بھی طرح کی دھمکی ای میل کرنے سے انکاری ہو جاتا ہے۔ اسی دوران ایک دوسرے شہر میں پولیس ایک انتیس سالہ بے روزگار شخص کو گرفتار کر لیتی ہے۔ اس شخص پر بھی ملتا جلتا الزام یہ عائد کیا جاتا ہے کہ اس کے کمپیوٹر سے ایک ایسی ای میل بھیجی گئی ہے جس میں طالبان طرز پر بچوں کا سکول بم سے اڑا دینے کی دھمکی دی گئی ہے۔ یہ بے روزگار نوجوان بھی پہلے جرم کا مرتکب ہونے سے انکار کرتا ہے، بعدازاں پولیس اس سے اقبال جرم کروا لیتی ہے۔

پولیس چاہے جاپان کی ہی کیوں نہ ہو، ہوتی تو بہرحال پولیس ہی ہے۔ روس میں مثل مشہور ہے کہ

پولیس چاہے کسی بھی علاقے کی ہو، اس کی وردی میں بسی بُو ایک جیسی ہوتی ہے۔ پولیس کہیں کی بھی ہو، کسی بھی شخص سے کچھ بھی منوا سکتی ہے، اس حقیقت کے باوجود کہ جاپانی پولیس جسمانی تشدد نہیں کرتی ہے۔

یہاں ایک نوجوان پولیس انسپکٹر میرے جاننے والا ہے۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ تم لوگ تشدد کیے بغیر ہی مجرموں سے اقبال جرم کیسے کروا لیتے ہو؟ پولیس انسپکٹر نے بتایا کہ اس کا والد بھی پولیس میں ملازمت کرتا تھا، کہنے لگا کہ والد صاحب کے زمانے میں جاپان میں بھی جسمانی تشدد معمول کی بات تھی اور تفتیش کا لازمی جزو بھی، مگر اب تو ترقی کا دور دورہ ہے، وقت کے ساتھ ایسے طریقے، تکنیکی و نفسیاتی حربے دریافت ہو چکے ہیں کہ تشدد کے بغیر بھی سچ اگلوایا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کچھ ایسے ہی نفسیاتی حربوں سے پولیس نے مذکورہ احباب سے اقبال جرم کروایا ہو۔ میرے اس انسپکٹر دوست کا یہ گلہ، شکوہ اپنی جگہ کہ جاپان میں پولیس والوں کو کوئی رشتہ نہیں دیتا، کوئی لڑکی ڈیٹ پر جانے کے لیے تیار نہیں ہوتی، اسی وجہ سے وہ اب تک کنوارہ ہے جو کہ انتہائی زیادتی ہے مگر یہ موقع خانگی مسائل پر گفتگو کا نہیں ہے۔

اسی اثنا میں وزیراعظم کے دفتر کو سرکاری ویب سائیٹ کے ذریعے دھمکی موصول ہوتی ہے...... ایک انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والے گروپ کو اسی انداز میں خوفناک انجام سے دوچار ہونے کی تنبیہ کی جاتی ہے۔ دو اور افراد کو پولیس حراست میں لے لیتی ہے، اس نوع کے پیغامات کی تعداد بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور تیرہ تک پہنچ جاتی ہے۔ دفاعی تحقیقاتی ادارے اور پولیس جب ان معاملات کی بغور چھان بین کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ اس معاملے میں گرفتار کیے گئے تمام افراد بے قصور ہیں، کسی تیسرے آدمی نے ان گرفتار شدگان کے کمپیوٹرز کا ریموٹ کنٹرول وائرس کے ذریعے کنٹرول حاصل کر کے دھمکی آمیز پیغامات ارسال کیے ہیں۔ دریں اثناء ایک نجی ٹیلی وژن اسٹیشن اور کئی اخبارات کو ایک ای میل پیغام موصول ہوتا ہے جس میں مبینہ دھمکی آمیز خطوط بھیجنے کی ذمہ داری قبول کرنے کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر ہائی جیک کرنے کا وائرس ایجاد کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ پیغام بھجوانے

کی طرف سے یہ چنوتی بھی دی جاتی ہے کہ تم لوگ مجھے کبھی گرفتار نہیں کر سکتے کیونکہ میں ایک ہائی جیک شدہ کمپیوٹر کے ذریعے یہ ای میل پیغام بھیج رہا ہوں۔

یہاں قارئین کی سہولت کے لیے بتا تا چلوں کہ ہر کمپیوٹر کا ایک آئی پی ایڈریس ہوتا ہے۔آئی پی، انٹرنیٹ پروٹوکول کا مخفف ہے جسے ہم انٹرنیٹ صارف کا شناختی نمبر بھی کہہ سکتے ہیں اور مستقل پتہ بھی کہا جاسکتا ہے۔موجودہ درپیش مسئلے میں کوئی تیسرا فریق وائرس کے ذریعے آپ کا انٹرنیٹ پروٹوکول ایڈریس ہائی جیک کر لیتا ہے، باالفاظ دیگر آپ کے کمپیوٹر کو اغوا کر لیتا ہے اور اس ریموٹ کنٹرول وائرس کے ذریعے سے آپ کے کمپیوٹر سے کوئی بھی ای میل بھیج سکتا ہے، نا صرف یہ بلکہ آپ کے کمپیوٹر میں موجود و محفوظ تمام مواد چرا کر کہیں بھی منتقل کر سکتا ہے۔

سائبر کرائمز سے نمٹنے والے اداروں کے لیے تمام دنیا میں یہ ایک نیا چیلنج ہے۔ہائی جیک شدہ کمپیوٹر کے ذریعے بھیجی گئی یہ دھمکیاں اب جاپان تک محدود نہیں رہیں۔اطلاع یہ ہے کہ ناروے، ہالینڈ، امریکہ اور سویڈن میں بھی ایسی نوعیت کی دھمکیاں مختلف اداروں اور شخصیات کو موصول ہوئی ہیں، جن کی تحقیق کرنے پر پتا چلا ہے کہ آئی پی ایڈریس ریموٹ کنٹرول وائرس کے ذریعے استعمال کیا گیا ہے۔ پولیس کی تحویل سے بے قصور گرفتار افراد کو رہائی تو مل چکی ہے، رہائی کے علاوہ حکومت کی جانب سے ان بے گناہ لوگوں سے معافی بھی مانگ لی گئی ہے مگر اصل مسئلہ وہاں کا وہیں ہے۔اس تحریر کا مقصد پاکستان کے تحقیقاتی اداروں کو خبردار کرنا بھی ہے کہ اگر کسی شخص کے کمپیوٹر سے کوئی بھی مجرمانہ فعل سرانجام پاتا ہے، چاہے وہ چوری شدہ کریڈٹ کارڈ سے شاپنگ ہو یا پھر کسی کو قابل اعتراض پیغام بھیجنا ہو یا غیر قانونی ویب سائیٹس کو دیکھنا ہو، ضروری نہیں ہے کہ کمپیوٹر کے صارف نے ہی یہ کاروائی سرانجام دی ہو۔عین ممکن ہے کہ اس شخص کا کمپیوٹر ہائی جیک کیا گیا ہو اور وہ بالکل بے خبر اور معصوم نکلے۔حفاظتی تدابیر کے طور پر اب تک یہی اقدام سامنے آیا ہے کہ ایپل کا نیا سافٹ ویئر پروگرام استعمال کیا جائے اور فلیش ڈسک کے استعمال سے اجتناب کیا جائے،

مگر یہ بھی سو فیصد محفوظ نہیں ہیں۔ انٹرنیٹ صارفین ابھی تک ای میل اکاؤنٹ ہیک ہونے سے ہی باخبر تھے مگر پورے کمپیوٹر کا اغوا ہو جانا ایک نیا معاملہ ہے۔ فی الوقت تو قانون نافذ کرنے والے ادارے کمپیوٹر ہائی جیکنگ کے اس نئے چیلنج کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں، دیکھتے ہیں اس مسئلے کا کیا حل نکلتا ہے۔

جاپان کا معاشی ارتقاء

روایت اور جدّت پسندی کسی معاشرے میں کس طرح باہم شیر وشکر رہ سکتے ہیں اس کی ایک عمدہ مثال جاپان ہے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ جاپان کی تاریخ میں کبھی کوئی عوامی انقلاب نہیں آیا اور نہ ہی عوامی احتجاج کے نتیجے میں کوئی ایسی ٹھوس سیاسی تبدیلی ظہور پذیر ہوئی جسے انقلاب کہا جا سکے۔ زیادہ بے تکلفی سے بات کروں تو کسی عوامی تحریک کا کبھی یہاں وجود ہی نہیں رہا۔ جاپان کے صنعتی فروغ کی ابتدا بھی باقی دنیا خصوصاً یورپ کے صنعتی انقلاب سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ کسی زرعی سماج کا صنعتی معاشرے میں تبدیل ہونا بلاشبہ انقلابی تبدیلی ہے مگر معروف معنوں میں اسے انقلاب کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہماری سیاست میں چونکہ اکثر ''خونی انقلاب'' کا ذکر ہوتا رہتا ہے جسے سُن کر یہ لگتا ہے کہ شاید انقلاب صرف خونی ہی ہوسکتا ہے لہٰذا یہ لفظ کمزور دل کے لوگوں کے لیے گھبراہٹ کا سبب بنتا ہے۔

کیا انقلاب اور خون لازم وملزوم ہیں؟ میرے خیال میں تو ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ انقلاب کے ساتھ ''خونی'' کا لفظ چپکانا ایک بے بنیاد الزام کے مترادف ہے۔ گزشتہ صدی کو سیاسی اعتبار سے اگر کیمونسٹ انقلابات کی صدی کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں روس کے اندر ظہور پذیر ہونے والا انقلاب پہلا بھی تھا اور سب سے اہم بھی تھا۔ اکتوبر 1917 کے اس انقلاب کو تاریخ دان بیسویں صدی کا سب سے اہم واقعہ مانتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک دو عظیم جنگیں پچھلی صدی کا سب سے اہم وقوعہ ہیں، بہر حال

بالشویک انقلاب کی اہمیت کا کوئی بھی صاحبِ مطالعہ شخص منکر نہیں ہے۔آپ کو شاید حیرت ہو کہ انقلابِ روس کے دوران صرف نو افراد ہلاک ہوئے تھے۔خونی انقلاب کی اصطلاح استعمال کرنے والے لوگ عموماً تاریخ سے ناواقف ہوتے ہیں یا پھر دانستہ طور پر لوگوں کو انقلاب سے ڈرانے کی کوشش میں ہوتے ہیں۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا قوموں کی معاشی ترقی کے لیے کوئی انقلاب ناگزیر ہوتا ہے؟ یا پھر ارتقائی عمل کے ذریعے کسی انقلاب کے بغیر بھی معاشی و سماجی ترقی سے ہمکنار ہوا جا سکتا ہے؟ صنعتی انقلاب کا تمام دنیا میں طریقہ کار تقریباً یہی رہا ہے کہ بنیادی صنعت کاروں اور تاجروں پر مشتمل ایک نیا طبقہ جاگیردار سماج میں جنم لیتا ہے۔ پھر تاجر،صنعتکار اور بے کار لوگ مل جُل کر جاگیرداروں اور زراعت پیشہ لوگوں سے خود کو علیحدہ کر لیتے ہیں اور یہ علیحدگی اس زور سے ہوتی ہے کہ سماج زرعی اور صنعتی دو علیحدہ طبقوں میں بٹ جاتا ہے اور یہ طبقے ایک دوسرے کے لیے عموماً حریفانہ جذبات رکھتے ہیں،مگر جاپان میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ معاشرہ زراعت سے صنعت کی طرف گیا لیکن ''صنعتی انقلاب'' کا گزر اس طرف نہیں ہوا۔ باقی دنیا کی نسبت یہاں صنعت کاری کا آغاز بہت تاخیر سے ہوا اور جن حالات میں ہوا وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔تین سو سال تک جاپان ایک مکمل طور پر بند ملک رہا جس عرصے میں ملک سے نہ کوئی چیز باہر جا سکتی تھی اور نہ ہی باہر کی دنیا سے کوئی چیز ملک کے اندر داخل ہو سکتی تھی۔اس کی ایک وجہ تو نوآبادی بنا لیے جانے کا خوف بھی ہو سکتا ہے کیونکہ سولھویں صدی سے انیسویں صدی تک کا یہ زمانہ وہ تھا جب یورپی ممالک دھڑا دھڑ ایشیاء، امریکہ، افریقہ اور باقی دنیا میں اپنی نوآبادیاں قائم کر رہے تھے۔دوسری وجہ ہمسایہ ملک چین میں لڑی جانے والی ''افیونی جنگیں'' جن کے تناظر میں نوآبادی بنا لیے جانے کے امکانات بڑھتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔تین صدیوں پر محیط تنہائی کی یہ صورت حال اس وقت تبدیل ہوئی جب چار جہازوں پر مشتمل امریکی بحری فوج کے مشن نے 1853 میں جاپان کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتے ہوئے تین مطالبات پیش

کر دیے۔ امریکی کموڈور میتھیو پیری کے پیش کردہ مطالبات میں پہلا نقطہ یہ تھا کہ تمام جاپانی بندرگاہوں کو غیر ملکی تجارت کے لیے کھلا رکھا جائے۔ دوسرا یہ کہ غیر ملکی بحری جہازوں کو خوراک اور ایندھن فراہم ہونا چاہیے اور آخری یہ کہ جاپان آنے والے غیر ملکیوں سے اچھا برتاؤ کیا جانا چاہیے۔ امریکی کموڈور نے ان مطالبات پر غور و فکر کرنے کے لیے ایک سال کا وقت دیا اور اگلے سال اپنی آمد پر سفید پرچم لہرا کر مطالبات تسلیم کیے جانے کا عندیہ دینے کے لیے کہا۔ بلکہ وہ نگوڑا تو سفید جھنڈے بھی دے کر گیا تھا۔ بصورتِ دیگر کیا ہوتا؟ اس کا ذکر کتابوں میں تو موجود نہیں ہے لیکن جاپانی شروع سے ہی ایک سمجھدار قوم واقع ہوئے ہیں۔ اگلے سال یعنی 1854ء امریکی جہاز آئے تو ان کا سفید جھنڈوں اور کھلے بازوؤں سے استقبال کیا گیا۔ یوں ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ 1868ء میں بادشاہت بحال کر دی گئی اور اس کے ساتھ ہی صنعتی فروغ کی ابتدا بلکہ صنعت سازی شروع ہوئی۔ ان لوگوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ بیرون ملک سے متعلق کوئی بات ہو یا پھر نظام، اگر یہ سمجھیں کہ وہ ان سے بہتر ہے تو اسے فوراً اپنا لیتے ہیں۔ سیکھنے کے عمل کو عار نہیں سمجھتے اور اچھی بات کی نقل کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔ جاپانی زبان کا رسم الخط اور اکثریتی مذہب ''بدھ مت'' دونوں چیزیں ہی چھٹی صدی میں چین سے درآمد کی گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اشرافیہ کے نوجوان طالب علم پڑھنے کے لیے چین جایا کرتے تھے۔ چین کو انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا تک معاشی اور سماجی اعتبار سے جاپان پر برتری حاصل تھی۔

یہاں صنعت کاری اور تکنیکی مہارت سے متعلق کوئی بھی بات ریاست کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ ریاست نے معیشت کی نگرانی اور ترقی میں بہت بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ باہر سے دیکھنے پر منڈی میں حکومت کا کہیں کوئی کردار نظر نہیں آتا۔ شروع میں حکومت اور سمورائی طبقہ جو کسان تنظیموں پر مشتمل تھا صرف وہی صنعتی عمل میں دلچسپی لے رہا تھا اور ریاست کو ہی صنعتی ادارے قائم کرنا پڑے۔ 1870 کی دہائی میں حکومت نے ریل کے شعبے میں سرمایہ کاری کرنے

کے علاوہ سیمنٹ، فولاد اور شیشہ سازی کے کارخانے قائم کردیے۔ اسی دوران NEC اور توشیبا کمپنی نے امریکیوں کے اشتراک سے کام کرنا شروع کیا اور اس کے بعد متسوئی اور سومی موٹو کمپنیاں بھی صنعتی عمل میں شامل ہوئیں مگر جاپانی حکومت معاشی ترقی کے عمل کو منڈی کی قوتوں کے سپرد کرنے پر کبھی بھی تیار نہیں تھی۔ آج تک بھی یہ صورتِ حال کم وبیش قائم ہے اور اب بھی معیشت میں ریاست کا کردار بڑا بنیادی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک زراعت کا حصہ مجموعی قومی پیداوار کا 42 فی صد تھا اور ایک صدی بعد دنیا میں صنعت وتجارت ہی اس ملک کی پہچان ہیں۔ انقلاب تو شاید یہ بھی ہے لیکن اسے معاشی ارتقاء کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

معاشیات کا موضوع زیر بحث ہے اس لیے آج کے تازہ ترین کاروباری حالات کا ذکر کرنے میں بھی مضائقہ نہیں، جن میں اس خبر نے تہلکہ مچا رکھا ہے کہ جاپان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ چین اس کا سب سے بڑا تجارتی پارٹنر بن گیا ہے۔ گزشتہ برس کے آخر تک امریکہ اور جاپان کے درمیان دوطرفہ تجارت کا حجم جاپان کی معیشت کا سب سے بڑا حصہ تھا اور یہ عمل کئی دہائیوں سے جاری تھا جبکہ اس برس جاپان کی برآمدات اور درآمدات کا 20.4 فیصد چین کے ساتھ منسلک ہے جبکہ امریکہ کے ساتھ تجارت 13.7 فیصد رہ گئی ہے۔ جاپان کا تیسرا تجارتی حلیف جنوبی کوریا ہے جو کہ جاپان کی کل عالمی تجارت کے 6 فیصد حصے پر مشتمل ہے اور کاروبار کے متعلق ہی یہ خبر بھی اہم ہے کہ جاپان کی سب سے بڑی کار ساز کمپنی ٹویوٹا نے اعلان کیا ہے کہ وہ اپنی سالانہ پیداوار میں سات لاکھ گاڑیوں کی کمی کرے گی۔ ٹویوٹا اس وقت سالانہ ایک کروڑ گاڑیاں بناتی ہے موجودہ کٹوتی کی وجہ عالمی سطح پر گاڑیوں کی فروخت میں مسلسل کمی کا رجحان ہے اور مسلسل بگڑتی ہوئی معیشت بھی اس پیداواری کمی کی وجہ بیان کی گئی ہے ٹویوٹا جو کہ ہینو (Hino) اور ڈائی ہاتسو (Daihatsu) کے نام سے بھی گاڑیاں بناتی ہے، اس کا اس سال فروخت کا تخمینہ ستر لاکھ گاڑیوں کے قریب ہے جو کہ پیداوار سے کافی کم ہے۔ اس لیے اس نے کئی پلانٹ مستقل

بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور کئی پلانٹ مرمت کے لیے بند کرنے کا منصوبہ ہے اس کے علاوہ برطانیہ میں ڈربی شائر پلانٹ اور امریکہ میں کیلی فورنیا پلانٹ بھی اب بند کردیے جائیں گے۔

موجودہ عالمی معاشی بحران سے صرف ٹیوٹا کمپنی ہی متاثر نہیں ہوئی بلکہ جن شعبوں کو عالمی معاشی بحران نے متاثر کیا ہے ان میں کارسازی کا شعبہ سرِ فہرست ہے۔امریکہ کی تینوں بڑی کارساز کمپنیاں تو دیوالیہ ہوگئی ہیں جن میں جنرل موٹرز جیسا ادارہ بھی شامل ہے جو کہ پچھلے 70 سال سے نا صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا کا سالانہ سب سے زیادہ گاڑیاں بنانے اور فروخت کرنے والا ادارہ تھا۔ جنرل موٹرز اور ٹویوٹا مشترکہ کارسازی بھی کرتے تھے لیکن جنرل موٹرز کے دیوالیہ ہونے کے بعد کیلی فورنیا میں واقع ان کا مشترکہ پلانٹ بھی فروخت کیے جانے کی اطلاع ہے۔ادھر کرائسلر اور جاپانی کارساز نسان (Nissan) نے بھی مشترکہ کارسازی کا معاہدہ ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔2008 میں ہونے والا یہ معاہدہ جس کے تحت مذکورہ کمپنیوں نے ایک دوسرے کے لیے گاڑیاں بنانا تھی اور مشترکہ کارسازی کا منصوبہ تھا، امریکی کارساز ادارے کے دیوالیے ہونے کے باعث یہ منصوبہ ختم کرنا پڑا ہے۔

ٹوکیو سے کراچی تک......!

کراچی کے نشتر پارک یا پھر مزارِ قائد سے ملحقہ گراؤنڈ میں اگر کوئی سیاستدان، جلسے میں کھڑا ہوکر آج یہ کہہ دے کہ یہ شہر دنیا کا سب سے سستا شہر ہے! تو پھر کیا ہوگا؟ لوگ ایسے سیاست کار کو کم ازکم ہرگز ووٹ نہیں دیں گے، جو عوام کے مسائل سے اس قدر بے بہرہ و لاتعلق ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی غالبًا ایسے ناخلف لیڈر کے بارے میں یہی رائے ہوگی کہ اسے زمینی حقائق کا قطعی کوئی علم نہیں ہے، مہنگائی نے تو عوام کا جوس نکال دیا ہے۔ تیرِ الزام سے لے کر سنگِ دشنام تک سب کچھ ایسے ناہنجار پر آزمایا جا سکتا ہے۔ لیکن کیا کہیں گے اگر اس شخص کی بات سچ ثابت ہوئی؟

دنیا بھر میں مرسَر گروپ ایک ایسے ادارے کے طور پر پہچانا جاتا ہے جو بنیادی اخراجات زندگی کو پیمانہ بنا کر 197 ملکوں کے چیدہ چیدہ شہروں میں مہنگائی اور ارزانی کا حساب رکھتا ہے۔ حال ہی میں شائع کردہ مرسَر گروپ کے اعداد و شمار کے مطابق ٹوکیو دنیا کا سب سے مہنگا شہر ہے اور کراچی اس عالمِ رنگ و بو میں سب سے سستا نگر قرار پایا ہے۔ امریکی ادارے مرسَر گروپ کا اتنا تعارف کافی ہو گا کہ وہ اپنے شعبے میں سب سے معتبر ادارہ ہے۔ مہنگائی و ارزانی ماپنے کے معاملے پر اس ادارے کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

اس سال کے متعلق اس کی سالانہ رپوٹ چند دن پہلے ہی شائع ہوئی ہے جس کے مطابق شہرِ قائد کراچی، بنیادی ضروریات زندگی کی قیمتوں کے اعتبار سے، ٹوکیو شہر سے تین گنا سستا ہے۔

آپ یہ مت سمجھئے گا کہ ٹوکیو میں چونکہ لوگوں کی آمدن زیادہ ہے اس لیے مہنگائی محسوس نہیں ہوتی ہوگی۔ معیشت کی مضبوطی یا تنخواہوں کی شرح کا مہنگائی کیساتھ کوئی بھی براہِ راست تعلق نہیں ہوتا ہے۔ٹوکیو سے پیشتر، مرثر گروپ کی پچھلے سال کی رپوٹ کے مطابق دنیا کا سب سے مہنگا شہر افریقی ملک انگولا کا دارلحکومت لیوآنڈا تھا۔انگولا کے معاشی حالات تو زیادہ تفصیل سے بتانے کی ضرورت نہیں ہے، کہ وہ تو ملک کے نام سے ہی چھلک رہے ہیں، پھر اشیاء کی قیمتیں وہاں کیسی ہیں؟ مجھے لیوآنڈا میں اشیاء کی آسمان سے باتیں کرتی قیمتوں کا، تھوڑا سا اندازہ اس لیے بھی ہے کہ پچھلے برس میرے بڑے بھائی کاروباری سلسلے میں انگولا میں کچھ دن گزار کر آئے ہیں۔ان کے بقول اشیاء کی قیمتوں میں گرانی کے سبب جنوبی افریقہ یا پھر موزمبیق سے ٹرک کے ذریعے سامان کی فقط ترسیل کا کرایہ اتنا زیادہ تھا کہ ایک ہی چکر لگانے سے ٹرک کی اپنی قیمت پوری ہو جاتی تھی۔راستوں کی حالت یہ ہے کہ سینکڑوں میل تک ملک میں سڑک کا نام ونشان ہی نہیں ہے، جنگلوں اور بیابانوں میں سے گزر کر جانا پڑتا ہے۔کسی بھی دوسرے ملک سے آنے والا سامان کا ٹرک اگر خوش قسمتی سے لیوآنڈا پہنچ ہی جائے تب بھی سات دن تو کم ازکم لگ ہی جاتے ہیں۔بہرحال اب یہ شہر دنیا میں مہنگائی میں دوسرے نمبر پر چلا گیا ہے، تیسرے نمبر پر بھی جاپان ہی کا شہر اوسا کا ہے جبکہ دنیا میں چوتھا سب سے مہنگا شہر ماسکو ٹھہرا ہے۔

یورپ میں مالیاتی بحران کی وجہ سے، اس سال وہاں کے قریباً تمام شہروں میں ہی مہنگائی میں واضح طور پر کمی آئی ہے۔اشیائے ضرورت کی رسد کے حوالے سے تو حالیہ تاریخ میں یورپ کبھی بھی مشکل کا شکار نہیں ہوا مگر موجودہ اقتصادی بحران نے لوگوں کی طلب وقوت خرید کو مجروح کر کے رکھ دیا ہے۔سوئیٹزرلینڈ کا جینوا اب بھی مگر اس جہان کا پانچواں مہنگا ترین شہر ہے۔

نیویارک شہر کو مرکز ومعیار مان کر، ہر سال کیے جانے والے اس سروے کا مقصد دنیا بھر کے نجّی ملازمین کے، مختلف انواع کے الاؤنسز اور تنخواہوں میں کمی بیشی کرنے کے لیے

کاروباری اداروں کو معاونت فراہم کرنا ہے۔ دنیا کے مختلف شہروں میں دوسو اشیائے ضرورت کی قیمتوں کا تقابلی جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس لسٹ میں رہائش، خوراک اور ذرائع آمدورفت پر اٹھنے والے اخراجات سب سے بنیادی ہیں۔ اس تحقیق کے مطابق تو وطن عزیز کا سب سے بڑا شہر دنیا کا سب سے غریب پرور اور سستا شہر قرار پایا ہے۔

اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے، ہمارے ہاں بعض اوقات گھر میں ایک کمانے والا فرد ہوتا ہے اور دس افراد کھانے والے ہوتے ہیں، ایسی صورتِ حال میں ثقافت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے علاوہ معاشیات بھی ملوث ہے۔ یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ ایک فرد کی کفالت میں دس افراد کا گزارہ، اقتصادی طور پر، ہمارے ملک میں ممکن ہے۔ گزارہ اس لیے ہو جاتا ہے کہ مہنگائی قابلِ برداشت ہے۔ میں پاکستان میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں، جنہوں نے پوری زندگی کوئی کام نہیں کیا، اور بڑی بھرپور زندگی گزاری ہے، بلکہ گزار رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ بیرونی دنیا کے لوگوں کا فارغ رہنے کو دل نہیں چاہتا، دل تو مشرق و مغرب کے تمام ترقی یافتہ ممالک کے باشندوں کا فارغ پھرنے کو چاہتا ہے مگر وہ یہ عیاشی افورڈ نہیں کرتے۔ اگر جاپان میں لوگ مشینوں کی طرح کام کرتے نظر آتے ہیں تو وجہ صرف شوق نہیں ہے، کام کرنے کے علاوہ زندہ رہنے کا کوئی چارہ بھی نہیں ہے، مہنگائی ہی اس قدر شدید ہے۔ حنیف رامے مرحوم پاکستانی قوم کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ ''ہم لوگ شکوہ تو کرتے ہیں مگر شکر نہیں کرتے۔'' پاکستان میں رہنے والے لوگوں کو بے شمار آسانیاں اور نعمتیں میسر ہیں، کبھی کبھی ان پر خدا کا شکر بھی ادا کرنا چاہیے۔

جاپانیوں کی جانوروں سے عقیدت

دوپہر کا وقت تھا۔ ایک ادھیڑ عمر جاپانی عورت میرے دفتر کے دروازے کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ مجھے لگا شاید ڈاک دینے آئی ہے؟ یا پھر بدھ مت، عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلے میں بھٹک کر یہاں آ پہنچی ہے؟ جب کافی وقت گزر گیا اور اس نے نہ تو دفتر کے دروازے پر دستک دی اور نہ ہی اپنی جگہ سے ہٹی تو میں نے خود اٹھ کر دروازہ کھول دیا دریافت کیا کہ میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟ اس نے انگریزی زبان میں تحریر کردہ ایک رنگین اشتہار، جس پر بھورے رنگ کی بلی کی دور اور نزدیک کی دو تصاویر موجود تھیں، مجھے تھما دیا۔ غمزدہ چہرہ لیے خاتون نے بتایا کہ تصویر میں نظر آنے والی سات سالہ پیاری سی بلّی میری ''وابی'' ہے اور گزشتہ ہفتے سے گمشدہ ہے۔ اگر آپ کو 3.8 کلوگرام وزنی یہ معصوم ''وابی'' کہیں نظر آئے یا آپ کے شوروم کی طرف آ نکلے تو اشتہار میں درج فون نمبرز یا ای میل پر اطلاع ضرور کریں۔

اس نے انعام واکرام کا بھی ذکر کیا اور وابی نامی بلی کی عادات واطوار کو بھی بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا جو اس کے نزدیک تمام تر حسین تھیں۔ مختصراً بیان کروں تو اس بلّی میں تمام وہ خوبیاں تھیں جو اگر انسان میں موجود ہوں تو وہ عظیم انسان قرار دیا جا سکتا ہے۔ متذکرہ خاتون کا دفتر کے دروازے پر کھڑا رہنا اور دستک نہ دینے کا عمل غیر ارادی یا خارج از حکمت مت سمجھئے گا۔ اس کے پیچھے ایک فلسفہ ہے، جس کے سوتے مذہب سے پھوٹتے ہیں۔ اکثریت یہاں چونکہ بدھ مت کی پیروکار ہے، بدھ بھکشو جب صبح سویرے بھکشا لینے

جاتے ہیں تو کسی کے دروازے پر دستک نہیں دیتے اور نہ ہی صدا لگاتے ہیں۔ بھکشا پاتر تھامے خاموشی سے دہلیز کے پاس کھڑے ہو جاتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں۔ اگر کوئی دیکھ لے اور کچھ مل جائے تو ٹھیک، ورنہ خاموشی سے آگے نکل جاتے ہیں۔

بریکنگ نیوز یہ ہے کہ ہمارے نیپالی ملازم راجو نے کل شام اس بلی کو دفتر کے پچھواڑے چہل قدمی کرتے دیکھا ہے۔ بلی اور کتے کے علاوہ جاپان کے گلی، کوچوں میں کوئی تیسرا جانور ملنا محال ہے، کم از کم میں نے تو آج تک نہیں دیکھا۔ ہاں! ان دونوں جانوروں کی خوب آؤ بھگت ہوتی ہے۔ تکریم کا یہ عالم ہے کہ کتے اور بلیوں کے ریستوران کھلے ہوئے ہیں، جہاں ان کے قیام وطعام کا بندوبست ہوتا ہے۔ جانوروں کو ان کے ہم ذاتوں سے ملوانے کے لیے مالکان کے نزدیک یہ سب سے بہتر جگہ ہے۔ جو لوگ یہاں کسی مجبوری کی بناء پر کتا یا بلی نہیں پال سکتے مگر انہیں پالنے کا شوق دل میں پالتے ہیں، ان کے لیے ریستوران کی جگہ کیفے موجود ہیں۔ جی ہاں! بلیوں اور کتوں کے کیفے ٹیریا۔ ان میں کوئی بھی شخص پیسے ادا کر کے مخصوص وقت کے لیے بلی و کتے سے کھیل سکتا ہے۔

جون کا مہینہ مگر مذکورہ ریستوران و کیفے مالکان کے لیے ذرا بھاری ثابت ہوا ہے۔ محکمہ انسداد بے رحمی حیوانات نے اس مہینے سے اک نیا قانون نافذ کر دیا ہے، جس کے مطابق کسی جانور کو رات آٹھ بجے کے بعد نمائش کے لیے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ کیفے و ریستوران مالکان اس کرفیو آڈر پر سراپا احتجاج ہیں، ان کا موقف یہ ہے کہ یہ دونوں جانور رات کو جاگتے ہیں اور دن کو سونے والے ہیں، رات 8 بجے سے صبح آٹھ بجے تک کا کرفیو آڈر غیر منطقی اور عقل سے بالاتر ہے۔ ایک دفعہ ایسے ہی ایک کیفے ٹیریا میں جانے کا اتفاق ہوا تو دیکھا کہ لوگ، جن میں سے زیادہ تر نوجوان تھے، ان پالتو جانوروں کی اپنے موبائل فون کیمروں سے تصویریں بنا رہے تھے، کچھ پلاسٹک کے کھلونوں سے ان کو کھیلانے میں مشغول تھے۔ ریستوران کا نظام ذرا سا مختلف ہے، آپ وہاں اپنا کتا و بلی جمع کروا کر آ جاتے ہیں اور بعد میں مقررہ وقت پر، اسے واپس لے جاتے ہیں۔ اندر کا منظر وہاں بھی

خوب ہوتا ہے، ایک دفعہ میں نے پندرہ کے قریب کتوں کو ایک ریستوران کے اندر میٹنگ کرتے دیکھا مگر وہ حیرت انگیز طور پر سب خاموش بیٹھے تھے۔اب ان ریستورانوں میں رات آٹھ بجے سے صبح آٹھ بجے تک کرفیو نافذ رہے گا، اس دوران نہ کوئی جانور اندر آئے گا اور نہ ہی ریستوران سے باہر جائے گا۔

اسی موضوع پر ''کیٹ کیفے ٹور'' کے نام سے مقبول کتاب کی مصنّفہ کا اس بارے میں خیال یہ ہے کہ اس طرح کے قوانین غیر ضروری ہیں۔ اگر اس بابت کوئی قانون بنانا ہے تو وہ جانوروں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک سے متعلق ہونا چاہیے۔

اس کرفیو کے نفاذ کو یوں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ سرکاران جانوروں کے تحفظ کے بارے میں بے حد حسّاس اور سنجیدہ ہے۔ عام لوگوں کی ان پالتو جانوروں سے محبت کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔ اگر پالتو جانور مر جائے تو اس کا بہت دن تک سوگ ہوتا ہے، کم از کم مالک تو ضرور مناتا ہے۔ آخری رسومات تک ادا کی جاتی ہیں۔ بلی اور کتے کا کریا کرم کرنے کا خرچہ اوسطاً چار لاکھ روپے آتا ہے، جس میں اس کی ارتھی کے علاوہ مذہبی رسومات بھی شامل ہیں۔

بعض دوست شاید حیران ہوں کہ جانوروں کی اس قسم کی رسومات کا بھلا کیا جواز بنتا ہے؟ عرض یہ ہے کہ یہاں کے اکثریتی مذہب کے مطابق انسان اشرف المخلوقات نہیں ہے بلکہ باقی جانداروں کی طرح ایک جاندار ہے، نیز سب میں پائی جانے والی روح یکساں ہے۔ افضل اور کمتر مخلوق کا تصور یہاں نہیں ہے۔

میں نے تو امریکہ کے بارے میں بھی سن رکھا ہے، کہ ایک ارب پتی کا چہیتا کتا مر گیا تو اس نے بھی کتے کی آخری رسومات کی ادائیگی کے لیے پادری سے رابطہ قائم کیا تھا۔ پادری نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ اس نجس جانور کی رسومات ادا کرنا کسی طور پر بھی جائز نہیں ہے۔ ارب پتی تاجر نے پادری کے جواب سے مایوس ہوتے ہوئے کہا کہ میرا اس کتے سے بہت پیار تھا، جو چرچ اس کی آخری

سو مات ادا کرے گا، میرا اسے ایک ملین ڈالر کیش عطیہ دینے کا ارادہ ہے۔ اگر آپ یہ کام نہیں کر سکتے تو کوئی بات نہیں، ایک دوسرا پادری یہ رسومات ادا کرنے کے لیے رضامند ہے۔ آپ چونکہ قریب تھے اس لیے پہلے آپ سے پوچھ لیا۔ ملین ڈالر امداد کا سنتے ہی پادری کے لہجے میں نرمی آ گئی، وہ ارب پتی شخص سے کہنے لگا، جناب! آپ نے یہ پہلے کیوں نہیں بتایا کہ کتا کیتھولک عقیدے کا حامل تھا۔

محو حیرت ہوں کہ..........

اب تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے موبائل فون ہمارے جسم کا ہی کوئی عضو بن چکا ہے۔ اگر موبائل فون پاس نہ ہوتو لگتا ہے کہ بدن کا کوئی حصہ کہیں بھول آئے ہیں۔ پاکستان کی مجموعی آبادی اٹھارہ کروڑ بتائی جاتی ہے اور موبائل فون کے کنکشن دس کروڑ ہیں لہٰذا یہ بات تو اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ اب موبائل فون طبقہ اشرافیہ سے متعلق کوئی موضوع نہیں بلکہ عوامی چیز ہے۔ آج بچوں کو حیرانگی ہوتی ہے اگر یہ بتایا جائے کہ پاکستان میں جب یہ آلہ نیا نیا آیا تو صرف بڑے بڑے سیٹھ اور جاگیردار لوگ ہی اسے رکھنے کی استطاعت وسکت رکھتے تھے اور اسے اٹھانے کے لیے عموماً ایک ملازم ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ اب تو بات سمارٹ فون تک آ گئی، خیر ملازم ساتھ رکھنے کی ان دنوں وجہ شوخی کے علاوہ موبائل سیٹ کا سائز اور وزن بھی تھا جو گزشتہ برسوں میں بتدریج بہت کم ہو گیا ہے۔ ٹیکنالوجی کے اس شعبہ میں پاکستان نے حیران کن ترقی کی ہے۔ مغرب میں تازہ مقولہ یہ ہے کہ سمارٹ فون اب روزمرہ زندگی کا لازمی جزو بن گیا ہے۔ جاپان یوں تو مشرق میں ہے مگر جہاں ٹیکنالوجی کی بات آئے وہاں یہ اکثر موقعوں پر اس دنیا کا لیڈر نظر آتا ہے۔

یوں تو آئے روز کمپیوٹر اور سمارٹ فون کے ایسے ایسے پروگرام منظر عام پر آتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بلاشبہ اس نوع کی تمام ایجادات انسانی زندگی میں بے شمار آسانیاں پیدا کرنے کا سبب بن رہی ہیں مگر میں یہاں جاپان کی ایک بڑی انشورنس کمپنی کی طرف سے متعارف کروائے جانے والے جس سمارٹ فون پروگرام کا ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ

ایسا تہلکہ خیز ہے کہ اب تک کم از کم میری تو سوچ بھی وہاں تک نہیں پہنچی تھی۔ سادہ لفظوں میں اس پروگرام کا استعمال یہ ہے کہ آپ اگر اپنے موبائل فون کو گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ڈرائیونگ کے دوران نصب کر دیں تو حادثہ ہونے کی صورت میں سمارٹ فون کا کیمرہ حادثے سے دس سیکنڈ قبل اور دس سیکنڈ بعد کے مناظر کو خود بخود فلم بند کر لیتا ہے۔ متذکرہ پروگرام کا نام بھی اس کی کارکردگی کی کافی حد تک وضاحت کرتا ہے جو کہ ''سمارٹ فون انشورنس'' رکھا گیا ہے۔

یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ عام موبائل فون کے سیٹ اور سمارٹ فون میں فرق کیا ہے؟ سادہ سی بات یہ ہے کہ سمارٹ فون جیسے ایپل آئی فون، بلیک بیری، اینڈرائیڈ اور ایچ ٹی سی وغیرہ کی سکرین بڑے سائز کی ہوتی ہے اور یہ فون عموماً ٹچ سکرین ہوتے ہیں جبکہ روایتی موبائل سیٹ کے سارے فنکشن بٹنوں کے ذریعے ہی کنٹرول کیے جاتے ہیں۔ گاڑیوں کی انشورنس کمپنی نے اس پروگرام کو اگست کے مہینے سے عام فروخت کے لیے پیش کرنے کا اعلان کیا ہے۔

اس ایجاد کا بنیادی مقصد حادثات کی روک تھام، سرمائے اور انسانی زندگیوں کے ضیاع کا تدارک بیان کرتے ہوئے مذکورہ کمپنی نے یہ بھی اعلان ساتھ ہی کر دیا ہے کہ حادثات میں ملوث ڈرائیور حضرات کی انشورنس کے نرخ اگلے سال کی ابتدا سے بڑھا دیے جائیں گے اور تین سال تک حادثے سے محفوظ رہنے کی صورت میں بیمہ کی رقم خاطر خواہ حد تک کم کر دی جائے گی۔ سمارٹ فون کی مدد سے چلنے والا یہ پروگرام ڈرائیوروں کی حرکات و سکنات کو نوٹ کرتا رہتا ہے۔ ہینڈل کے کنٹرول، رفتار میں کمی بیشی اور بریک کے استعمال کے طریقۂ کار کو بنیاد بنا کر ڈرائیور کو پوائنٹ یا نمبر دیتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آنے والے دنوں میں تمام بڑی انشورنس کمپنیاں ڈرائیور حضرات کے بیمہ کا نرخ ان کے انہی نمبروں پر طے کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں غیر محتاط اور حادثوں میں ملوث ڈرائیوروں کی انشورنس کے نرخ 50% زیادہ ہوں گے۔

یہاں نجی ڈرائیوروں کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہر شخص اپنی گاڑی خود ہی چلاتا ہے۔ میں نے کئی لوگوں سے سنا ہے کہ ایک بڑی کارساز کمپنی کا مالک تو اپنی گاڑی دھوتا بھی خود ہی ہے۔ گزشتہ کئی برسوں کے دوران میں نے صرف ایک مرتبہ ایک موٹے سومو پہلوان کو دیکھا جس نے ذاتی ڈرائیور رکھا ہوا تھا۔ سومو پہلوانوں کے علاوہ مافیا ڈان عموماً ڈرائیورر کھتے ہیں۔ یہاں کروڑوں کی تعداد میں گاڑیاں ہیں مگر نجی ڈرائیور شاید پورے ملک میں چند سو ہی ہوں گے، ٹیکسی اور بس ڈرائیوروں کی بات دوسری ہے۔ اس تفصیل بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب ڈرائیور کا ذکر ہو تو اس سے مراد گاڑی کا مالک ہی لیا جائے۔ مزید اس ملک میں زندگی کا یہ پہلو بتانا بھی ضروری ہے کہ آپ کو یہاں کوئی بھی شخص اور کوئی بھی گاڑی انشورنس و بیمہ کے بغیر نہیں ملے گی۔ قدرتی آفات سے نبرد آزما رہنے کے سبب اس سماج کے لوگوں کا عمومی رویہ احتیاط پسند ہے۔

اس ضمن میں انقلاب لانے اور لیڈر ہونے کا دعویٰ مگر ہنڈا کمپنی نے کیا ہے جو کہتی ہے کہ اس کا بنایا ہوا سمارٹ فون پروگرام اپنی طرز کا دنیا میں پہلا اور واحد پروگرام ہے۔ ہنڈا کمپنی کے بنائے ہوئے پروگرام کے ذریعے بھی ڈرائیور کی عادات و اطوار کو نوٹ کیا جاتا ہے، خصوصاً یہ کہ وہ بریک کس طرح استعمال کرتا ہے۔ ہنگامی حالت میں خود کار بریکوں کا نظام بھی اس پروگرام کا حصہ ہے اور رفتار بھی اسی پروگرام سے کنٹرول ہو گی جس سے سڑکوں پر ٹریفک جام میں واضح کمی آجانے کی توقع کی جا رہی ہے۔ مگر اس کے لیے ہمیں 2015ء تک انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ اس سے پہلے ہنڈا کمپنی موبائل فون کے اس پروگرام کو تجارتی بنیادوں پر فروخت کے لیے پیش کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی ہے۔

ایڈیسن دیوتا

کسی سائنس دان کی بڑی سے بڑی ایجاد یا دریافت کا صلہ سرکاری و غیر سرکاری انعامات و اعزازات کی صورت میں ہی عموماً ہوا کرتا ہے۔عظمت کا اعتراف منصب اور سرکاری عہدہ دینے کی صورت میں بھی کیا جا سکتا ہے۔نوبیل انعام سے زیادہ بھلا اب کسی سائنس دان و موجد کی کیا پذیرائی ہوسکتی ہے۔ امریکی سائنسدان اور موجد تھامس ایڈیسن جس نے برقی بلب ایجاد کیا اس لحاظ سے کچھ زیادہ خوش بخت ثابت ہوا کہ اسے یہاں بہت سے لوگ دیوتا اور خدا کا اوتار مانتے ہیں۔کیوٹو شہر کی کچھ عبادت گاہوں میں اس کی پوجا کی جاتی ہے اور چند ایک معبد تو اس کے نام سے بھی منسوب ہیں۔بانس کے باغات میں واقع یہ عبادت گاہیں جن میں ایڈیسن کو خدا کا درجہ حاصل ہے بنیادی طور پر جاپان کے قدیم اور سرکاری مذہب شنتو ازم سے ہی متعلق ہیں اور ایڈیسن کے پجاری اسی مذہب کا ایک فرقہ شمار کیے جاتے ہیں۔ان ہی عبادت گاہوں کے باہر سجے ہوئے اسٹال جو مختلف مذہبی نوعیت کے لوازمات فروخت کرتے ہیں ان میں بانس کی چھوٹی سی تختی پر بنی ہوئی ایڈیسن کی تصویر بھی ہے جس میں اسے بھگوان دکھایا گیا ہے پہلی مرتبہ سوٹ اور ٹائی میں ملبوس بھگوان دیکھ کر مجھے بھی جھٹکا تو زور کا لگا مگر جب ان لوگوں سے پوچھا جائے جن کو 1949 سے باقاعدہ سرکاری طور پر ایک فرقہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ایک سائنس دان جو کہ آپ کا ہم مذہب بھی نہیں تھا اسے خدا کے درجے پر فائز کرنے کی کیا وجہ ہے تو ان کا جواب عام طور سے یہی ہوتا ہے کہ چونکہ اس نے بلب ایجاد کیا جس سے ہماری تاریک راتیں روشن ہوگئی ہیں اس لیے اسے ''بجلی کا دیوتا'' ماننا منطقی بات ہے۔حقیقت میں مگر ایڈیسن اور ان معبدوں کا تعلق اتنا سادہ اور سطحی نہیں ہے۔بانس کے گھنے باغات میں گھری کیوٹو شہر کی ان عبادت گاہوں اور ایڈیسن کے

باہمی تعلق کی ابتدا کیسے اور کب ہوئی؟ یہ ایک پراسرار سا موضوع لگتا ہے لیکن یہ کوئی راز کی بات تو نہیں ہے البتہ ایک حسین اتفاق ضرور ہے۔

برقی بلب کی ایجاد کے دوران ایڈیسن نے اپنی نیو جرسی میں واقع لیبارٹری سے بہت سارے شاگردوں، رضا کاروں اور معاونین کو دنیا کے مختلف حصوں میں بھیجا تا کہ وہ مختلف مادوں پر تحقیق کریں کہ کون سا مادہ بلب کے فلامنٹ کے طور پر سب سے زیادہ موزوں رہے گا۔ بنیادی کسوٹی فلامنٹ کے جلنے کا دورانیہ تھی۔ جو مادہ سب سے طویل عرصہ جلنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہی فلامنٹ کے طور پر سب سے مناسب گردانا جاتا تھا۔ ایڈیسن کی اس ٹیم نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے چھ ہزار سے زیادہ پودوں پر تجربات کیے اور انہیں بلب کے فلامنٹ کے لیے درکار مادے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اسی ٹیم کے چند ارکان کیوٹو شہر میں بھی آ پہنچے جو کہ کئی صدیوں تک جاپان کا دارلخلافہ رہا ہے۔ اسی شہر میں واقع بانس کے ان باغات پر بھی انہوں نے تحقیق کی جہاں اب ایڈیسن کے پیروکاروں کی عبادت گاہیں ہیں۔

خدا جانے بانس کا روحانیت کے ساتھ کیا تعلق ہے مگر بہت سے صوفیاء کرام اسے بزرگ درخت گردانتے ہیں۔ مثنوی مولانا رومؒ کا پہلا شعر ہی یہ ہے کہ بانسری کی آواز کو ذرا غور سے سنو کہ وہ کیا حکایت بیان کر رہی ہے، اس کی آواز میں اتنا سوز اور درد اس لیے ہے کیونکہ اسے سرکنڈے سے کاٹ کر الگ کیا گیا ہے اور اس کی آواز سے بانس سے جدائی کا دکھ اور کرب ہے جو چھلک رہا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ ایڈیسن کے رضا کاروں کو بانس کے ان باغات سے اپنا گوہر مراد یعنی وہ مطلوبہ مادہ مل گیا جو برقی بلب میں فلامنٹ کے طور پر استعمال کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھا۔ بانس کے ان درختوں میں پایا جانے والا یہ مادہ فلامنٹ کے طور پر گھنٹے یعنی کم و بیش ساڑھے تین ماہ تک جلتا رہنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ دورانیہ دنیا کے کسی بھی مادے سے بنائے گئے فلامنٹ سے زیادہ تھا۔ یہ دریافت بجلی کی دنیا میں ایک انقلاب کا نقطۂ آغاز

ثابت ہوئی۔

پتا نہیں تکنیکی اعتبار سے بانس کو درخت کہنا بھی چاہیے کہ نہیں کیونکہ ماہرین نباتیات کے نزدیک یہ گھاس کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ نباتیات کے شعبہ میں تو میں نے گریجوایشن کر رکھی ہے مگر یہاں معاملہ انشاء پردازی کا ہے اس لیے تھوڑی سی کنفیوژن ہے۔ خیر اس کے بعد ایڈیسن نے اپنی مشہور زمانہ ایڈیسن الیکٹرک کمپنی قائم کی جو بعد ازاں جنرل الیکٹرک کمپنی بن گئی جس نے صنعتی پیمانے پر برقی بلب بنانے شروع کر دیے جن میں کیوٹو کے بانس کو بطور فلامنٹ استعمال کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے تو اس بانس کا بنیادی استعمال تعمیری شعبے میں ہی تھا یا پھر اس سے ٹوکریاں، ہاتھ کے پنکھے، چھتریاں اور ٹوپیاں وغیرہ بُنی جاتی تھیں۔ آج کل تو بانس سے پیزا تک بنایا جاتا ہے جو یہاں کی مقبول خوراک میں شامل ہے مگر مجھے تو اس کا ذائقہ ذرا بھی پسند نہیں آیا، پھیکا میٹھا سا بڑا عجیب پھُس پھسا ذائقہ ہوتا ہے۔ آپ کے لیے تو یہی مشورہ ہے کہ اسے کھانے اور آزمانے کی کوشش نہ کریں ورنہ آپ کو بھی مایوسی اور بدمزگی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ بانس کے باب میں فطرت اور انسانی ذہانت کے جو دیگر حسین امتزاج ہیں بات وہیں تک محدود رکھی جائے۔ مجھے تحقیق کرنے پر پتا چلا کہ صرف تھامس ایڈیسن کو ہی یہاں دیوتا کا درجہ حاصل نہیں ہے بلکہ جرمن سائنس دان ہرٹس کو بھی خدا کا اوتار مانا جاتا ہے۔ اس سے ہمیں یہاں کی صرف روحانیت کی جہتیں ہی معلوم نہیں ہوتی ہیں بلکہ اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت لوگوں کے ذہن میں کتنی زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں اس بات سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ یہاں سائنس دانوں کو کس تکریم اور تقدس سے دیکھا جاتا ہے۔

بدلتے موسم

فروری کا آغاز ہر سال موسم میں تبدیلی کا اعلان سمجھا جاتا ہے۔اس برس مگر یہ مہینہ شروع ہونے سے سردی کی گرفت جاپان پر مزید مضبوط ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ بہار کے آثار نظر آنے کی بجائے برفانی طوفانوں میں شدت آتی جارہی ہے۔اسی سال برفباری کا بیس سالہ ریکارڈ بھی ٹوٹا ہے۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ حالیہ دنوں میں ساٹھ سے زیادہ لوگ سردی سے منسلک اسباب کے ہاتھوں جان کی بازی ہار چکے ہیں اور یہ تعداد بڑھنے کا خدشہ ہے۔عام طور پر دنیا میں سردی سے ہلاک ہونے والوں میں اکثریت بے گھر افراد کی ہوتی ہے لیکن یہاں ایسا معاملہ نہیں ہوا۔اس کی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ یہاں پر بے گھر افراد کا تناسب دنیا کے دیگر ممالک کی نسبت انتہائی کم ہے۔عمومی طور پر ریلوے اسٹیشن پر بسیرا کرنے والے یہ بے گھر افراد بھی اس معاشرے کا ایک قابل ذکر پہلو ہیں جن کی بودوباش کا موضوع ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے۔

اس برس معمول سے زیادہ سردی اور طوالت اختیار کرتے ہوئے موسم سرما کا سبب ''لانینا'' بتایا جارہا ہے۔ اسی وجہ سے پاکستان سمیت جنوبی ایشیا اور باقی دنیا میں معمول سے زیادہ ٹھنڈ پڑی ہے۔ موسمیات سے متعلق ''لانینا'' ایک ایسا عمل ہے جس کے دوران سمندر کا پانی معمول سے زیادہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ایشیا میں سردی کا موسم طویل تر اور شدید ہو جاتا ہے جبکہ یورپ میں، ماہرین کے مطابق، اس کے اثرات الٹے ہوئے ہیں مگر یہ عمل عارضی ہے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی موسمی تبدیلیاں بھی عارضی

نوعیت کی ہی ہوتی ہیں۔ بادیٔ النظر میں تو کرۂ ارض کا درجۂ حرارت مستقل طور پر بڑھ رہا ہے جس کے سبب مستقبل میں گرمی کی شدت میں اضافے کے علاوہ موسم گرما طویل تر ہو جائے گا اور موسم سرما کا دورانیہ بتدریج کم ہوتا چلا جائے گا۔ ہمارے گلیشرز پگھل رہے ہیں جن کی وجہ سے سطح سمندر بلند ہو رہی ہے جس سے ایک طرف تو دنیا میں خشکی کا رقبہ کم ہوتا جا رہا ہے اور سمندر مزید پھیلتا چلا جا رہا ہے، دوسری طرف زراعت اور پینے کے لیے پانی مسلسل کم ہوتا جا رہا ہے۔ پچھلے سال اسی مسئلے پر کیوٹو شہر میں ایک بین الاقوامی کانفرنس انعقاد پذیر ہوئی تھی۔ اس عالمی کانفرنس میں ہالینڈ سے شرکت کے لیے آنے والی ایک خاتون سے ملاقات ہوئی جو کہ متعلقہ شعبے میں عالمی ماہرین کی فہرست میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ مذکورہ خاتون کا کہنا ہے کہ مستقبل میں جن قدرتی وسائل پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے دنیا میں جنگیں ہوں گی وہ تیل سے متعلق نہیں بلکہ پانی کے متعلق ہوں گے۔ کرۂ ارض کا بڑھتا ہوا درجہ حرارت اور اس کے موسم پر اثرات بے حد اہم مسئلہ ہے جس پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے مگر اس وقت میں موسم کا سائنسی جائزہ پیش کرنے کی بجائے اس کا ایک ثقافتی رنگ بیان کرنا چاہوں گا۔

موسم کی تبدیلی کے متعلق یہاں روایتی طور پر لوگوں کے خیالات بہت خوفناک قسم کے ہیں۔ عموماً یہی مانا جاتا ہے کہ جب موسم تبدیل ہونے لگتا ہے تو بدروحیں اور چڑیلیں و بلیّات حرکت میں آ جاتی ہیں۔ ان خبیث روحوں کو دفع کرنے کے لیے فروری کے شروع میں ہی ایک تہوار منایا جاتا ہے جسے رسم کہنا زیادہ مناسب ہو گا اس رسم کو یہاں ''ستسبن'' کہا جاتا ہے جو کہ بہار کے موسم کو خوش آمدید کہنے کا موقع بھی ہے۔ تہوار کے دن تمام لوگ اپنے گھر کے دروازے چوپٹ کھول دیتے ہیں اور دروازوں میں کھڑے ہو کر بُھنے ہوئے سویابین کے بیج گھر سے باہر کی جانب اچھالتے ہیں۔ اکثر اوقات گھر کا ہی کوئی فرد شیطان و بدروح کی اداکاری کرتا ہے چہرے پر ڈراؤنا ماسک پہنے، ابلیس کا گُرز پکڑے اور جنّات کے لباس میں ملبوس شخص شیطان کے روپ میں گھر کے دروازے سے باہر کھڑا ہو جاتا ہے اور

اہل خانہ اس پر بھنے ہوئے سویابین پھینکتے ہوئے منتر پڑھتے ہیں۔اس منتر کے الفاظ کچھ یوں ہوتے ہیں کہ ''ہر بلا اس گھر سے باہر نکل جائے اور خوش بختی اس گھر کے اندر چلی آئے۔'' یہ ورد گھر کو پاک کرنے کے علاوہ بیماریوں اور بدروحوں سے بچاؤ کے لیے پڑھا جاتا ہے۔

رسم کے آخری حصے میں خوش قسمتی اور بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لیے گھر کا ہر فرد سویابین کے اتنی تعداد میں بیج کھاتا ہے جتنے برس اس کی عمر ہے یعنی کہ سات سال کا بچہ سات بیج کھائے گا اور سو سالہ بوڑھا سو بیج کھاتا ہے۔ ہوسکتا ہے بعض دوستوں کے نزدیک اس قسم کی رسوم دقیانوسی ہوں مگر میں سمجھتا ہوں کہ اسے موسمی تہوار اور فطرت سے محبت کے اظہار کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ''ستسبن'' جیسی رسوم سے محسوس ہوتا ہے کہ جاپان اپنی تمام چکا چوند اور خیرہ کن معاشی ترقی کے باوجود ثقافتی و روحانی طور پر اب بھی مشرق کا حصہ ہے، ایشیا سے اس کا تعلق صرف جغرافیے کی حد تک نہیں ہے۔

چلتے چلتے بتا تا چلوں کہ اس سال پاکستان اور جاپان کے سفارتی تعلقات کو قائم ہوئے ساٹھ برس مکمل ہو رہے ہیں۔ دونوں ممالک نے دوستی کے ساٹھ سالہ سفر کی تکمیل کے موقع کو یادگار طریقے سے منانے کا عزم ظاہر کیا ہے۔ اسی سلسلے میں یہاں کئی سماجی و ثقافتی تقریبات منعقد کیے جانے کا منصوبہ ہے۔ علاوہ ازیں دونوں ملکوں کے درمیان اعلیٰ سطحی سفارتی، سیاسی و سماجی وفود کے تبادلے کا بھی پروگرام ہے مگر ابھی تک ان کی کوئی حتمی تفصیل سامنے نہیں آئی ہے۔

جوا- کسی کا نہ ہوا

بہت دنوں سے یہاں کی نجی محفلوں میں اس بگڑے رئیس جواری کا بہت ذکر ہے جس نے چین کے جزیرے مکاؤ کے ایک جوا خانے میں دس ارب روپے کی رقم ہار دی۔ محفل محفل گفتگو کا موضوع بننے والے شخص کے یہ تذکرے بے سبب بھی نہیں ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جوئے میں ہار دی گئی رقم ادھار میں لی گئی تھی جس وجہ سے یہ واقعہ خبر بنا ورنہ تو جوئے کے سمندر میں بے شمار ٹائی ٹینک خاموشی سے ڈوب جاتے ہیں اور کسی کو کان و کان خبر نہیں ہوتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ادھار لی گئی رقم جعلسازی سے ادھار لی گئی تھی جس کے سبب مذکورہ شخص جیل میں پڑا ہے۔ ایکاوا نامی سینتالیس سالہ اس جواری کے احوالِ پر ملال کی تفصیل ہر پہلو سے دلچسپ اور سبق آموز ہے، جو ایک ارب پتی باپ کی اکلوتی اولاد اور جاپان کے چند بڑے کاغذ ساز کارخانوں میں سے ایک کا مالک تھا، مگر اس سے پہلے مکاؤ کے بارے میں مختصراً بتا تا چلوں کہ سو سال تک پرتگال کے زیر تسلط رہنے کے بعد کچھ سال پہلے چین کو واپس ملنے والا یہ جزیرہ عالمی سطح پر امریکی ریاست لاس ویگاس کی طرح اپنے جوا خانوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ مختصر سی آبادی پر مشتمل مکاؤ کے بارے میں یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ وہاں کی مائیں جس بچے کو بازار سے سودا سلف لانے کے لیے پیسے دیتی ہیں وہ بچہ بھی پیسے لے کر پہلے کسینو جاتا ہے بعد میں گھر کا سامان خریدنے کے متعلق سوچتا ہے۔ مکاؤ کے علاوہ دائیو پیپرز کارپوریشن کے اس سابق مالک نے کئی ارب روپے سنگاپور کے ایک کسینو میں بھی حالیہ دنوں کے دوران ہار دیے تھے جو ادھار کے دس ارب روپوں

کے علاوہ ہیں۔ سنگاپور کے اس جواخانے کی خصوصیت یہ تھی کہ وہاں پر گاہک زیادہ بڑی رقم کا جوا کھیل سکتے ہیں۔ بیرون ملک جوا کھیلنے کا ممکنہ سبب غالباً جاپان میں کسینو کی عدم موجودگی تھی۔ گو کہ گھڑ دوڑ، لاٹری اور پاچنکو سلاٹ کی شکل میں جواخانے تو یہاں پر موجود ہیں لیکن کسینو قانونی طور پر ممنوع ہیں۔

یہاں کسینو اور سلاٹ کا فرق بتاتا چلوں کہ سلاٹ میں جوئے کی خودکار مشینیں رکھی گئی ہوتی ہیں جن میں سکے ڈال کر کھیلتے ہیں جبکہ مقابلے پر کھیلنے والا کوئی نہیں ہوتا اور انفرادی طور پر ہی تمام کھیل سرانجام پاتے ہیں، تاش کے پتے بھی یہاں ممنوع ہوتے ہیں جبکہ کسینو کا حسن ہی تاش کے پتوں سے کھیلے جانے والے کھیل ہوتے ہیں، یا پھر لڈو کے دو دانوں کی گھومتی مشینوں پر اچھل کود کے ساتھ جواریوں کے جتھے میں شامل لوگوں کے چہروں کے ہر آن بدلتے تاثرات ہوتے ہیں کسینو کے قریب قریب تمام اہم آئٹم گروپ کی شکل میں ہی کھیلے جاتے ہیں جن میں ڈیلر کا کلیدی کردار ہوتا ہے جبکہ سلاٹ میں ڈیلر کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ پاچنکو سلاٹ (دروغ برگردنِ راوی) جاپان کی سب سے زیادہ ٹیکس ادا کرنے والی انڈسٹری ہے۔

آج کل یہاں قانون ساز اسمبلی کے اراکین کا ایک گروپ کسینو کو قانونی اجازت دینے کے حوالے سے پارلیمان میں ایک بل پیش کرنے کے لیے جوڑ توڑ میں مشغول ہے۔ دوسری طرف میڈیا خصوصاً اخبارات میں اس امر کی بڑی شدّ و مد کے ساتھ مخالفت کی جارہی ہے۔ مذکورہ بل کے حامی اراکین پارلیمنٹ کا کہنا ہے کہ کسینو کی اجازت دینے سے حکومت کو ٹیکس کی شکل میں خاطر خواہ آمدن ہونے کے علاوہ روزگار کے نئے مواقع پیدا ہوں گے جبکہ مخالفین کا استدلال ہے کہ ممکنہ طور پر کئی کھرب روپے کی اس صنعت سے ملک کو معاشی استحکام تو شاید ملے یا نہ ملے مگر ایک بات یقینی ہے کہ اس سے سماجی عادات واطوار اور مشرقی اقدار ضرور تباہی کا شکار ہوں گی۔ کسینو کے منفی اثرات سے خبردار کرنے کے لیے آج کے جاپان ٹائمز نے اس موضوع پر اداریہ لکھا ہے جس میں بطور مثال ایکاوا

موتو ناکا کو ہی پیش کیا گیا ہے، جو کہ اپنے اربوں روپے ہارنے کے علاوہ قرض میں لیے گئے دس ارب روپے ہار کر اب جیل میں ہے اور عدالتوں میں اپنے اوپر قائم کردہ مقدمات کا سامنا کر رہا ہے۔ دو سال کے قلیل عرصے میں جوئے کے طفیل اپنا کاروبار وزندگی برباد کر لینے والا یہ شخص جب طالب علم تھا تو روزانہ اپنے ذاتی جہاز پر اوساکا سے ٹوکیو کلاس پڑھنے کے لیے پرواز کیا کرتا تھا مگر اب زیرو ہوا ہے تو ایسا کہ کچھ بھی باقی نہیں بچا۔

ایکاوا کا تذکرہ کرتے ہوئے مجھے بار بار اُن شیخ صاحب کا واقعہ یاد آ رہا ہے جو بہت معروف بیوپاری تھے اور مرتے وقت اپنے کاروباری جانشین بیٹے کو نیک چلن کی ہدایت کرنے کے بعد کہنے لگے کہ بیٹا مگر پھر بھی تم برائی سے باز نہ آسکو تو میری اس وصیت پر ضرور عمل کرنا کہ اگر کبھی بدکاری کرنی ہو تو دن کے وقت کرنا اور جوا کھیلنے کو جی چاہے تو کسی استاد جواری سے کھیلنا۔ شیخ صاحب کی وفات کے بعد ان کا نوجوان بیٹا کاروبار سنبھال چُکا تو سفلی جذبات سے مغلوب ہو کر بدکاری کی راہ پر چل نکلا۔ مرحوم والد کی وصیت مگر اسے یاد تھی اس لیے اس وصیت پر عمل پیرا رہا۔ جلد ہی اس نے محسوس کیا کہ دن کے وقت لوگ اسے مشکوک جگہوں اور مشکوک لوگوں کے ساتھ دیکھتے ہیں جس سے وہ اپنی ہی نظروں میں شرمندہ شرمندہ رہتا تھا لہٰذا اس نے یہ راستہ ترک کر دیا۔ اب سوچا کہ جوئے سے جی بہلایا جائے، جوئے کے باب میں بھی والد کی نصیحت یاد آ گئی اس لیے اس وصیت کا پاس کرتے ہوئے وہ جوا خانے گیا تو وہاں موجود لوگوں سے استفسار کرنے لگا کہ تم میں سے سب سے بڑا جواری کون ہے؟ میں نے اس کے ساتھ جوا کھیلنا ہے۔ خیر وہاں موجود ایک شخص جس پر سب متفق نظر آ رہے تھے کہ وہ سب سے بہتر ہے، آگے بڑھا اور اپنا تعارف کروا چکا تو شیخ صاحب کے برخوردار نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارا بھی کوئی استاد ہے؟ مذکورہ جواری نے بتایا کہ فلاں بازار کے فلاں چوک میں بیٹھا شخص میرا استاد ہے۔ یہ اطلاع پا کر برخوردار بغیر مزید وقت ضائع کیے، استاد جواری سے کھیلنے کے لیے چل پڑا۔ جب بتائے گئے پتہ پر پہنچا اور اس جواری سے بھی برخوردار نے استاد کی بابت پوچھا تو وہ مسئلہ سمجھ گیا اور بتانے لگا کہ

اس علاقے میں ہم سب کا استاد جواری شہر سے باہر اک پہاڑی پر خیمہ زن ہے، تم اس سے جا کر مل لو، وہی سب لوگوں کا متفقہ گرو مانا جاتا ہے۔ برخوردار جب بتائی گئی پہاڑی پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ خیمہ پھٹا پڑا ہے اور ممدوح جواری ایک لنگوٹ کے علاوہ لباس سے بھی بے نیاز ہے۔ یہ منظر دیکھ کر برخوردار نے احتیاطاً پوچھ ہی لیا کہ کیا واقعی آپ اس علاقے میں جوئے کے فن میں سب کے استاد ہیں؟ جواری نے اثبات میں سر ہلایا، اس پر برخوردار نے کہا: جناب! مگر آپ تو بڑی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں، تو استاد جواری نے جواب دیا کہ بیٹا جب جوئے میں استادی ہاتھ آتی ہے تو تب تک صرف لنگوٹ ہی باقی بچتی ہے۔

استاد جواری کی یاد کا سبب ایکا وا کا عدالت میں دیا گیا بیان بھی ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ وہ تو صرف اپنا نقصان پورا کرنے کے لیے جوا کھیل رہا تھا اور سوچ یہ تھی کہ میں کسی طرح ایک بار جوئے میں ہاری ہوئی رقم واپس جیت لوں تو پھر کبھی جوئے کے قریب نہیں جاؤں گا۔ بظاہر کتنا معصومانہ بیان لگتا ہے مگر کم و بیش ہر جواری کی یہی سوچ ہوتی ہے کہ کسی طرح پرانا نقصان پورا کر لوں اور اسی چکر میں وہ مزید نقصان کرتا جاتا ہے۔ لاس ویگاس کے مشہور کسینو میں ملازمت کا تجربہ رکھنے والے ایک دوست کی بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کسینو میں کبھی کوئی شخص نہیں جیتتا، ہمیشہ کسینو ہی جیتتا ہے۔

کرسمس اور نئے سال کی روشنیاں

یوں تو سال 2011 میں اس دنیا میں ایسے بے شمار واقعات رونما ہوئے جنہیں تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا مگر جاپان میں یہ برس مارچ میں آنے والے زلزلے، سونامی اور اس کے نتیجے میں فوکوشیما ایٹمی پلانٹ سے تابکاری کے اخراج کے حادثے کے حوالے سے تاریخ کا حصہ بنے گا۔ اسی واقع کے متاثرین کی تفریح طبع اور اشک شوئی کے لیے ایک کاسمیٹک ساز کمپنی نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ فوکوشیما شہر کے مرکزی ریلوے اسٹیشن کے باہر ملک کا سب سے طویل القامت کرسمس ٹری نصب کیا ہے جس کی لمبائی تیرہ میٹر ہے۔ اس الیکٹرک کرسمس ٹری کی تیاری میں چالیس ہزار بلب استعمال کیے گئے ہیں۔ یہاں ہر برس نومبر کے آغاز میں ہی پورے ملک میں نئے سال اور کرسمس کے استقبال کے لیے جگہ جگہ کرسمس ٹری اور چراغاں نظر آنے لگتا ہے۔ گو کہ ملک کی غالب اکثریت بدھ مت اور شنتو مذہب کے پیروکاروں پر مشتمل ہے اور عیسائی برادری کا تناسب ملک کی آبادی میں ایک فیصد سے بھی یقیناً کم ہے مگر کرسمس اور نئے سال کا چراغاں یہاں یورپ سے بھی طویل تر ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کرسمس کا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ فقط ایک سماجی و معاشرتی تہوار ہے۔ اگر بالفرض آپ کسی جاپانی سے یہ پوچھ بیٹھیں کہ کرسمس کے دن کیا ہوا تھا؟ تو نوّے فیصد سے زائد لوگوں کے علم میں بھی نہیں ہو گا کہ یہ حضرت عیسیٰ کا یوم پیدائش ہے مگر شاپنگ مال ہوں کہ ریستوران، کثیر المنزلہ عمارتیں ہوں کہ دفتر ہر جگہ سبز کرسمس ٹری میں رنگ برنگی روشنیاں جگمگاتی نظر آئیں گی اور ان کے ساتھ سبز اور سرخ رنگ

کے کاغذی ڈبوں میں بند چھوٹے چھوٹے تحفے لٹکتے دکھائی دیں گے اور ساتھ ہی سرخ ربن سے بندھی سنہری گھنٹیاں اور کبھی کبھی سانتا کلاز کی تصویر، بازاروں کا رخ کریں تو دکانوں پر کرسمس اور نئے سال کی سیل لگی ہوئی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سال کی سب سے بڑی سیل بھی ہر جگہ کرسمس پر ہی لگائی جاتی ہے۔ کہیں دس فیصد رعایت ہے تو کہیں یہ لوٹ سیل نوے فیصد رعایت تک پہنچی دکھائی دے رہی ہے۔ ہوٹلوں کے استقبالیہ پر نئے سال کے لیے روشنی میں لپٹے استقبالیہ کلمات کے ساتھ ساتھ کرسمس ٹری رنگارنگ روشنیوں اور تحفوں سے اٹے پڑے ہیں جن کے ساتھ سرخ لباس میں ملبوس سانتا کلاز کا مجسمہ کھڑا ہے اور کہیں کہیں تو اصل سانتا کلاز سفید لمبی داڑھی سمیت سفید و سرخ ٹوپی سر پہ رکھے بچوں کے لیے تحفوں کا سنہری تھیلا لیے کھڑا نظر آئے گا۔ میرا مطلب ہے کہ سانتا کلاز کے گیٹ اپ میں اصل آدمی، سرکاری عمارتوں کو بھی نئے سال اور کرسمس کے لیے روشنیوں سے مزین کیا جاتا ہے اور عوامی مقامات و باغات میں بھی چراغاں کیا جاتا ہے۔ گو کہ اس سال ایٹمی بحران کی وجہ سے ملک کو توانائی میں کمی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اس سال چراغاں پچھلے برسوں کے مقابلے میں ماند دکھائی دیتا ہے مگر پھر بھی اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے اور جس علاقہ میں زلزلہ، سونامی اور ایٹمی تابکاری کا حادثہ ہوا، وہاں یہ چراغاں گزشتہ برسوں کی نسبت بہت زیادہ کیا گیا ہے۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں معاملہ صرف کرسمس اور نئے سال کو خوش آمدید کہنے کا ہی نہیں بلکہ روشنی کو امید کا استعارہ مانا جاتا ہے اور یہ چراغاں متاثرین کو زندگی میں خوشیوں اور کامیابیوں کی امید دلانے کی ایک کوشش بھی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ یہاں کرسمس ایک ثقافتی تہوار ہے اور اس کی حیثیت مذہبی نوعیت کی نہیں ہے۔ اگرچہ مسیحی برادری کا تناسب ایک فیصد سے بھی کم ہے مگر ملک کی مجموعی آبادی میں ان کا تناسب مسلمانوں سے بہرحال زیادہ ہے۔ ویسے تو جس طرح کلیسا ملک کے ہر شہر میں موجود ہیں اسی طرح مساجد بھی اب ملک کے کونے کونے میں موجود ہیں مگر جاپان میں بسنے والی عیسائی اور مسلمان آبادی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ عیسائیوں کی اکثریت مقامی لوگوں پر

مشتمل ہے جبکہ مسلمانوں کی غالب اکثریت بیرون ملک سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہونے والے تارکینِ وطن پر مشتمل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عیسائیوں میں بھی اکثریت انہی جاپانیوں کی ہے جو یا تو خود بیرون ملک مقیم رہے ہیں یا پھر ان کے آباء واجداد کی زندگی عیسائی ملکوں میں گزری ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عیسائی ملکوں میں کرسمس ایک گھریلو تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے اور تمام اہل خانہ اکٹھے عشائیہ کرتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں جبکہ جاپان میں کرسمس کے یہ تمام رنگ گھر کے باہر ہی دکھائی دیتے ہیں اور گھروں کے اندر اس تہوار کی نشانیاں کم کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔

نئے سال کا ذکر چلا ہے تو آپ کو بتا تا چلوں کہ یہاں سن عیسوی رائج نہیں ہے بلکہ ان کا اپنا کیلنڈر ہے۔ جاپان میں یہ سال ہیسے 23 ہے اور 24 شروع ہونے جا رہا ہے۔ یہاں پر کیلنڈر کی ابتدا نئے بادشاہ کی تاجپوشی کے ساتھ شروع ہوتی ہے اور شہنشاہ کی موت تک ہر سال اسی کے نام سے جانا جاتا ہے سال میں مہینوں اور تاریخوں کی ترتیب عیسوی کیلنڈر والی ہی ہے۔ یاد رہے کہ موجودہ شہنشاہ اکّی ہیتو 1988 میں تخت نشین ہوا تھا جب شہنشاہ ہیرو ہیتو کا انتقال ہوا۔ جاپانی کیلنڈر کے مطابق 1988 کو نئے عہد کا آغاز ہوا اور ہیرو ہیتو کا عہد مکمل ہوا جو 66 سال پر محیط تھا کیلنڈر کی رو سے اس عہد کو ''شووا'' کہتے ہیں جو کہ ''شووا66 '' تک چلتا ہے۔

آخر میں ادیبوں کے ایک گروپ کی طرف سے دائر کیے گئے ایک اہم مقدمے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو گزشتہ روز ٹوکیو کی ایک عدالت میں دائر کیا گیا ہے۔ اپنی طرز کے منفرد اور اس پہلے مقدمے کو دائر کرنے والے سات ادیبوں میں سے تین ایوارڈ یافتہ ناول نگار ہیں اور ملک میں انتہائی مقبول ہیں۔ اس استغاثہ میں ان ادیبوں نے عدالت سے درخواست کی ہے کہ کتابوں کو سکین کرنے کی سہولت فراہم کرنے والی کمپنیوں پر پابندی عائد کی جائے کیونکہ سکین کرنے سے انٹرنیٹ پر کتاب کی فراہمی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور غیر قانونی طور پر کاپی رائٹ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بلا معاوضہ اس کی دستیابی بھی

آسان ہو جاتی ہے۔ یہاں ایسی کمپنیاں موجود ہیں جو معمولی معاوضہ لے کر آپ کو آپ کی پسند کی کتاب CD پر منتقل کر دیتی ہیں یا پھر آپ کے کمپیوٹر یا فلیش میں آپ کو یہ کتاب فراہم کر دیتی ہیں۔ جاپان کے قانون کے مطابق ذاتی استعمال و مطالعہ کے لیے کتاب کو سکین کرنا جرم نہیں ہے اور یہ کمپنیاں بھی گاہک کی فراہم کردہ کتاب کو ہی سکین کر کے دیتی ہیں لہٰذا بظاہر کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتی ہیں۔ اس عمل کو یہاں ''بُک کلکنگ'' یا کتاب پکانا کہا جاتا ہے جو کہ دن بدن مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ بالخصوص آئی پیڈ اور بک ریڈر کی آمد نے تو اس کاروبار کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

ادیبوں کے گروپ کا عدالت میں بیان تھا کہ قانون کتاب کو سکین کرنے کی اجازت صرف ذاتی استعمال کے لیے دیتا ہے مگر مذکورہ کاروباری ادارے تو اسے تجارتی بنیادوں پر کر رہے ہیں جو کہ قانون کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ عدالت کی کاروائی مکمل ہونے کے بعد ان ادیبوں نے ایک نیوز کانفرنس سے بھی خطاب کیا جس میں ان کا یہ کہنا تھا کہ اگر کاپی رائٹ کی یہ خلاف ورزی ابھی نہ روکی گئی تو پھر مستقبل کے ادیب بھوکے مر جائیں گے۔

سیکنڈ ہینڈ تمبا کو نوشی

وزارت صحت کی ایک تحقیقاتی ٹیم نے یہاں بڑی جانفشانی سے ایک انتہائی فکر انگیز رپورٹ مرتب کی ہے جو سیکنڈ ہینڈ تمبا کو نوشی کے متعلق ہے۔ گو کہ اس رپورٹ میں دیے گئے اعداد و شمار کی بنیاد جاپان کی جغرافیائی حدود تک محدود ہے لیکن چونکہ سیکنڈ ہینڈ تمبا کو نوشی کا مسئلہ ایک بین الاقوامی معاملہ ہے، اس لیے اس رپوٹ کے انکشافات پوری دنیا اور اسی طرح ہمارے لیے بھی چشم کشا اور پریشان کن ہیں۔ تفصیل اس تحقیق کی کچھ یوں ہے کہ یہاں ہر سال سات ہزار لوگ سیکنڈ ہینڈ تمبا کو نوشی سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں تمبا کو نوشی کے مضر صحت ہونے کے متعلق تو حکومت تشہیر کرتی رہتی ہے اور عوامی سطح پر بھی اس بارے میں شعور و آگہی موجود ہے لیکن بالواسطہ یا سیکنڈ ہینڈ تمبا کو نوشی کا مسئلہ حکومت اور عوام، دونوں جانب سے ہی نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ عرف عام میں سیکنڈ ہینڈ تمبا کو نوش ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو خود تو سگریٹ یا تمبا کو کی کوئی اور شکل استعمال نہیں کرتے مگر ایسے ماحول میں رہتے ہیں جہاں تمبا کو نوشی کی جاتی ہے اور یوں یہ لوگ سیکنڈ ہینڈ دھوئیں کے ذریعے تمبا کو نوشی کرتے ہیں۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ استعمال شدہ تمبا کو کا دھواں براہ راست تمبا کو نوشی سے بھی زیادہ مضر صحت ہے اور یہ میری ذاتی رائے نہیں بلکہ ماہرین صحت کا خیال ہے۔ ان سطور کو تحریر کرنے کا مقصد تمبا کو نوشی کی مخالفت یا اس کے نقصانات بتانا ہرگز نہیں بلکہ آپ لوگوں کی توجہ سیکنڈ ہینڈ تمبا کو نوشی سے پیدا ہونے والے مسائل کی طرف دلانا ہے۔ جو شخص اپنی مرضی سے تمبا کو نوشی کر رہا ہے وہ تو اس کے نقصان اور مضر صحت اثرات

سے بھی آگاہ ہوتا ہے اور خود ہی اس کے نتائج کا ذمہ دار ہے۔ میں تمبا کو نوشی کو شخصی آزادی اور بنیادی حقوق کا معاملہ سمجھتا ہوں اور اس پر مکمل پابندی کا قائل تو نہیں ہوں مگر یہاں مسئلہ ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کا ہے جو نہ تو تمبا کو نوشی کا ارادہ رکھتے ہیں اور بعض صورتوں میں تو اس دھواں دار ماحول کے صحت پر مضر اثرات سے بھی آگاہ نہیں ہوتے ہیں۔ متذکرہ تحقیق کے مطابق سالانہ سیکنڈ ہینڈ تمبا کو نوشی سے ہلاک ہونے والے سات ہزار لوگوں میں سے آدھی تعداد ان لوگوں کی ہے جن کے دفاتر یا کام کرنے کی جگہ پر تمبا کو نوشی کی جاتی ہے اور وہ تمبا کو کا دھواں نہ چاہتے ہوئے بھی سانس کے ساتھ کھینچنے پر مجبور ہیں۔ مرنے والوں کی اکثریت پھیپھڑوں کے کینسر یا دل کی بیماریوں میں مبتلا پائی گئی ہے جن میں واضح اکثریت عورتوں کی ہے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ جاپان کی آبادی تیرہ اور چودہ کروڑ کے درمیان ہے جو کہ مسلسل کم ہو رہی ہے اور سن 2050 میں نو کروڑ رہ جانے کی پیش گوئی ہے جبکہ ہماری آبادی اٹھارہ کروڑ سے بھی تجاوز کر چکی ہے، اگر یہاں بالواسطہ تمبا کو نوشی سے سالانہ سات ہزار لوگ لقمۂ اجل بن رہے ہیں تو اس تناسب سے کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں بھی ہلاکتوں کی تعداد کئی ہزار کے قریب ہو سکتی ہے، اگرچہ یہاں سگریٹ خریدنا بیس سال سے کم عمر بچوں کے لیے تو ممکن بھی نہیں ہے، جبکہ ہمارے ہاں تو یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اوقات گھر کے بڑے بوڑھے خود بچوں کو سگریٹ خریدنے کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ قانونی طور پر بیس سال سے کم عمر بچوں کو سگریٹ فروخت کرنے پر پابندی کی وجہ سے کوئی بھی دکاندار تو پہلے بھی کسی کم سن کو شناختی کارڈ دیکھے بغیر سگریٹ نہیں بیچتا تھا مگر وینڈنگ مشین سے کسی بھی عمر کا شخص سگریٹ خرید سکتا تھا لیکن چند سالوں سے اب وہ بھی ممکن نہیں رہا چونکہ وینڈنگ مشین سے سگریٹ خریدنے کے لیے بھی اب شناختی کارڈ درکار ہے۔ اس کا یہ مطلب قطعاً مت سمجھئے کہ یہاں سکول و کالج کے نابالغ لڑکے سگریٹ نہیں پیتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں پاکستان سے بھی زیادہ تعداد میں سکول و کالج کے طلباء سن بلوغت سے پہلے ہی سگریٹ تو سگریٹ شراب تک بھی پیتے ہیں۔ ایک شام میں ریلوے اسٹیشن سے نکلا تو

ایسے ہی سکول کے شرارتی لڑکوں کے ایک گروپ کو میں نے سگریٹ اور شراب پیتے دیکھا تو ان کے سامنے میں نے اپنے جنرل نالج میں اضافے کے لیے یہ سوال رکھا کہ وہ سگریٹ اور شراب خریدتے کیسے ہیں؟ کیونکہ قانونی طور پر تو ان کے لیے نابالغ ہونے کے باعث یہ چیزیں خریدنا ممکن ہی نہیں ہے۔تب ان شریر لڑکوں نے مجھے آگاہی بخشی کہ ہر پانچ سات لڑکوں کے ایسے ناہنجار گروپ میں ایک لڑکا بیس سال سے زائد عمر کا ہوتا ہے جو کہ سب کے لیے شاپنگ کرتا ہے۔علاوہ ازیں نابالغ بچے خفیہ طور پر بھی ان اشیاء کا آپس میں تبادلہ کرتے رہتے ہیں۔

تمبا کو نوشی کا ذکر کرتے ہوئے مجھے صاحب طرز مزاح نگار ضیاء الحق قاسمی مرحوم بہت یاد آرہے ہیں۔آپ سگریٹ نوشی کے نا صرف زبردست حامی تھے بلکہ اس کے حق میں ایسے ایسے دلائل دیتے کہ سگریٹ نہ پینے والا شخص انہیں سُن کر احساسِ محرومی میں مبتلا ہو جاتا۔آخری وقت تک سگریٹ کے دو پیکٹ روزانہ پیتے تھے، حالانکہ دل کے مریض تھے اور ہارٹ اٹیک کے کرب سے بھی گزر چکے تھے۔ایک دفعہ اسی موضوع پر بات ہو رہی تھی کہ انہوں نے سگریٹ نوشی کے حق میں اپنا وہ مشاہدہ پیش کیا جو انہوں نے ہارٹ اٹیک کے بعد دوران علاج ہسپتال میں حاصل کیا۔ بتانے لگے کہ جس دن مجھے ہارٹ اٹیک ہونے پر ہسپتال لے جایا گیا اس روز میرے ساتھ دل کے وارڈ میں نو اور بھی مریض لائے گئے جن میں سے صرف دو لوگ سگریٹ پیتے تھے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمبا کو نوشی نہ کرنے والے لوگوں کو ہارٹ اٹیک ہونے کا امکان سگریٹ نوشی کرنے والوں کے مقابلے میں اسّی فیصد زیادہ ہوتا ہے۔

؎ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

سیکنڈ ہینڈ تمبا کو نوشی کے موضوع پر ہی گفتگو کرتے ہوئے نیشنل کینسر سنٹر کے سربراہ نے بالکل بجا کہا کہ حکومت اور کاروباری لوگوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے کہ ان کے ماتحت کام کرنے والے لوگوں کی صحت کا تحفظ کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔

اس تحقیق کے مطابق گھروں کے اندر بالواسطہ تمبا کونوشی کے نتیجے میں بیماریوں کا شکار ہو کر مرنے والے لوگوں کی تعداد کل تعداد کا بیس فیصد ہے۔ جس طرح تمبا کونوشی کرنا لوگوں کا انسانی حق ہے اسی طرح سے صاف فضا میں سانس لینا بھی دیگر لوگوں کے بنیادی انسانی حقوق میں شامل ہے۔

سیکنڈ ہینڈ تمبا کونوشی کا شکار ہو کر ہلاک ہونے والے لوگ مظلوم ہیں اور حکومت کو ان بے گناہ ہلاکتوں کو روکنے کے لیے عوامی مقامات و دفاتر میں سگریٹ نوشی پر پابندی عائد کرنی چاہیے۔ علاوہ ازیں سرکاری و نجی دفاتر میں سگریٹ نوشی کرنے کے لیے کوئی کمرہ یا جگہ مخصوص ہونی چاہیے تا کہ تمبا کو نوشی کرنے والوں کے حقوق کا بھی تحفظ ہو سکے۔

جدید ٹیکنالوجی

محسوس تو یہی ہوتا ہے جیسے اردو زبان فقط مذہب، سیاست اور ادب کے متعلق معاملات تحریر کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے۔ کم از کم سائنس اور ٹیکنالوجی کے متعلق کچھ تحریر کرنا تو ہمارے اہل قلم شاید بدعت خیال کرتے ہیں۔ اگر بدعت نہیں بھی تو بے ادبی ضرور سمجھا گیا ہے۔ ورنہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ جس آئی پیڈ کی بدولت ایپل کمپنی کے سرمائے کا حجم دنیا کی اکلوتی سپر پاور امریکہ کے زرمبادلہ کے ذخائر سے بھی زیادہ ہو گیا ہو اس کے متعلق اردو زبان میں کہیں ایک مضمون بھی شائع نہ ہوا ہو۔ ارون دھتی رائے کہتی ہے کہ ہم برصغیر پاک و ہند کے لوگ بڑے بڑے موضوعات پر بڑی بڑی باتیں کرنا پسند کرتے ہیں جبکہ چھوٹی موٹی چیزوں کے متعلق گفتگو کرنا اپنی شان کے منافی سمجھتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس نے اپنے عالمی سطح پر مقبول ناول کا نام God of Small Things رکھا تھا جسے ادب کا بکرّ انعام بھی دیا گیا۔

آئی پوڈ کے بعد آئی فون اور پھر آئی پیڈ کے ذریعے دنیا میں تہلکہ مچا دینے والی ایپل کمپنی آج کل کورین کمپنی سام سنگ کے ساتھ حالت جنگ میں ہے۔ یہ جنگ اسلحے بارود سے پہاڑوں اور میدانوں میں نہیں لڑی جارہی بلکہ عدلیہ کے ایوانوں میں برپا ہے اور یورپ و امریکہ سے ہوتی ہوئی یہ اب جاپانی عدالتوں میں بھی پہنچ گئی ہے۔ تازہ اطلاعات کے مطابق کیلی فورنیا کی ایپل کمپنی نے کورین سام سنگ کمپنی کے خلاف دس کروڑ روپے ہرجانے کا دعویٰ دائر کیا ہے کہ اس نے گلیکسی کے نام سے مارکیٹ میں فروخت کے لیے پیش

کی جانے والی کمپیوٹر ٹیبلٹ بنانے میں ایپل کمپنی کے آئی پیڈ اور آئی فون کی نقل کی ہے جس کی وجہ سے وہ کاپی رائٹ قانون کی خلاف ورزی کی مرتکب ہوئی ہے۔ امریکی حکومت سے بھی زیادہ امیر کمپنی کی جانب سے بظاہر دس کروڑ روپے کا دعویٰ اتنی بڑی رقم تو محسوس نہیں ہوتی لیکن اصل معاملہ ہرجانے کی رقم کا نہیں ہے۔ ٹوکیو کی عدالت کی جانب سے سام سنگ کمپنی کے خلاف فیصلہ آنے کی صورت میں خود بخود اس کی پیش کردہ گلیکسی ٹیبلٹ کی جاپان میں فروخت پر پابندی لگ جائے گی۔ گزشتہ ماہ یورپ کی ایک عدالت میں پہلے ہی اس کیس میں ایپل کمپنی کی جانب سے دائر کیے گئے دعویٰ کے نتیجے میں سام سنگ کے خلاف فیصلہ آچکا ہے اور گلیکسی کی فروخت پر پابندی عائد کر دی گئی ہے جبکہ امریکہ میں یہ مقدمہ ابھی جاری ہے۔ یہاں بدھ کے روز اس مقدمے کی پہلی سماعت ہوئی ہے جس میں ایپل کمپنی نے گلیکسی کی فروخت فوری طور پر روکنے کی درخواست کی ہے۔

ایک دہائی سے زیادہ عرصے تک دنیا کے سب سے امیر آدمی ہونے کا اعزاز رکھنے والے بل گیٹس کا یہ کہنا اپنی جگہ ضرب المثل بنتا جا رہا ہے کہ ''وہ وقت اچھے تھے جب ایپل اور بلیک بیری پھلوں کے نام ہوتے تھے'' مگر بل گیٹس کے اس بیان کے پیچھے وہ مسابقت کا جذبہ اور ذہنی تکلیف بھی ہے جو ایپل کمپنی سے انہیں پہنچی ہے۔ ایک تو اس کی کمپنی مائیکروسافٹ کو ایپل نے دیکھتے ہی دیکھتے بہت پیچھے چھوڑ دیا جو ایک طویل عرصے تک بلا شرکت غیرے کمپیوٹر کی دنیا میں اجارہ داری قائم کیے ہوئے تھی اور ناقابل تسخیر محسوس ہوتی تھی۔ دوسرا بل گیٹس سے دنیا کے سب سے امیر آدمی ہونے کا اعزاز بھی چھن گیا اور میکسیکو کے کارلوس سالم نے انہیں دوسرے نمبر پر پہنچا دیا۔ گو کہ یہ کہنا بھی مبالغہ آرائی نہ ہوگی کہ کمپیوٹر کا عوام الناس کے استعمال میں آنا مائیکروسافٹ کمپنی کے ونڈوز 95 پروگرام کی بدولت ہی ممکن ہوا تھا مگر انفارمیشن ٹیکنالوجی کے شعبے میں تبدیلیاں اس قدر تیزی سے آتی ہیں کہ دیگر شعبہ ہائے زندگی میں جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس شعبے میں چیزیں مہینوں اور سالوں میں پرانی نہیں ہوتیں بلکہ گھنٹوں اور دنوں میں اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں۔ ایپل کے

بانی چیئرمین سٹیو جاب مائیکروسافٹ کے بل گیٹس کے تقریباً ہم عمر ہیں اور دونوں نے کم وبیش ایک ہی وقت اس شعبے میں قدم رکھا تھا۔گیٹس کی طرح سٹیو جاب بھی اب اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ وہ ایک عرصے سے کینسر کے مرض میں مبتلا ہیں اور آج کل زیر علاج ہیں۔

ایپل اور بلیک بیری نے تو موبائل فون کے شعبے میں مائیکروسافٹ کو پہلے ہی بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا اب رہی سہی کسر گوگل کے سمارٹ فون سے نکل گئی ہے۔تازہ خبر یہ بھی ہے کہ گوگل نے دنیا میں مائیکروچپ بنانے والی سب سے بڑی کمپنی Intel کے ساتھ شراکت داری کا معاہدہ کیا ہے اور دونوں مل کر سمارٹ فون کو زیادہ جدید اور بہتر بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔یاد رہے کہ مشہور موبائل فون ساز کمپنی موٹرولا کو گوگل پہلے ہی بارہ ارب ڈالر میں خرید چکا ہے۔اب تو یہ عالم ہے کہ عام آدمی کے علم میں بھی یہ بات شاید نہ ہو کہ مائیکروسافٹ کمپنی موبائل فون کے لیے بھی ونڈوز کے نام سے سافٹ ویئر تیار کرتی ہے۔

ایسا بھی نہیں کہ مائیکروسافٹ کمپنی اس صورتِ حال میں سو رہی ہے۔اسی ہفتے امریکہ میں اس نے اپنے نئے سافٹ ویئر پروگرام ونڈوز 8 کی نقاب کشائی کی ہے جس کا بنیادی ہدف آئی پیڈ ہوگا۔ونڈوز 8 کو کمپیوٹر لیپ ٹاپ اور ٹیبلٹ دونوں طرح استعمال کیا جا سکے گا۔یہ پہلی مرتبہ ہے کہ مائیکروسافٹ نے ٹچ سکرین پروگرام متعارف کروایا ہے۔امید ہے اگلے برس بہار کے موسم میں اسے مارکیٹ میں فروخت کے لیے پیش کر دیا جائے گا۔پتا نہیں اس نئے پروگرام میں کمپیوٹر وائرس کے مسئلے کا بھی کوئی حل تلاش کیا گیا ہے کہ نہیں کیونکہ ایپل کمپنی کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے کمپیوٹر پروگرامز میں کسی بھی طرح کا وائرس داخل نہیں ہو سکتا جبکہ ونڈوز میں یہ بہت بڑا مسئلہ رہا ہے۔ونڈوز اور ایپل کے سافٹ ویئر کا ایک بنیادی فرق یہ رہا ہے کہ ونڈوز میں آپ نئے پروگرام داخل نہیں کر سکتے، جیسا یہ کمپنی کی طرف سے بنا کر فروخت کیا جاتا ہے وہ کم وبیش ویسا ہی رہتا ہے جبکہ ایپل کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہ خریدنے کے بعد آپ اپنی ضرورت اور پسند کے

مطابق اسے ڈھال سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں مائیکروسافٹ کمپنی صرف اپنے تیار کردہ کمپیوٹر پروگرام ہی پیش کرتی ہے جبکہ ایپل نے تو پروگرامز کا بازار کھول رکھا ہے۔ جسے ایپ سٹور کہتے ہیں۔ اس سٹور میں عموماً لوگوں کے نجی طور پر تیار کیے ہوئے پروگرام فروخت کے لیے پیش کیے جاتے ہیں اور ایپل کمپنی فروخت پر اپنا کمیشن وصول کرتی ہے اس سٹور پر ایسے ایسے ہوشربا پروگرام ہیں کہ یقین ہی نہیں آتا کہ انسان کی عقل یہاں تک پہنچ گئی ہے اور یہ سب کچھ ہماری ہی دنیا میں ہو رہا ہے۔

کتاب پڑھنے کے شوقین لوگوں کے لیے آئی پیڈ کی آمد کسی انقلاب سے کم نہیں ہے۔ ایک تو اس کا سائز کتاب کے سائز سے ملتا جلتا ہے بلکہ پہلی نظر میں تو یہ سکول کے بچوں کی سلیٹ کا کوئی جدید ایڈیشن محسوس ہوتا ہے۔ دوسرا اس کے اندر ایک اچھی خاصی لائبریری بڑے آرام سے سما سکتی ہے۔ سنا ہے پرانے زمانے کے بادشاہ جب سفر یا پھر کسی مہم پر نکلتے تو عام طور پر چند اونٹوں پر تو صرف بادشاہ سلامت کی پسندیدہ کتابیں لادی جاتی تھیں کیونکہ پتا نہیں راستے میں جہاں پناہ کا کب کس کتاب کو پڑھنے کا موڈ بن جائے اس لیے بادشاہوں کی ناراضگی سے بچنے کے لیے ان کے درباری، جو ہمیشہ مزاج شاہی سے خوب آشنائی رکھتے ہیں، سفر میں بھی کتابوں کا یہ اہتمام رکھتے تھے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ایپل کمپنی نے قدیم بادشاہوں کی کتابوں سے لدے ہوئے اونٹوں کو دورِ حاضر کی ضرورت کے مطابق آئی پیڈ میں بند کر کے پیش کر دیا ہے۔

ممکن ہے جس وقت آپ یہ تحریر پڑھ رہے ہوں آپ کو یہ سب باتیں کچھ پرانی پرانی سی لگیں۔ وقت کا پہیہ ایسے ہی گھومتا ہے۔ یہی وقت کا مزاج ہے کہ جدید ترین بات بھی ہمیشہ نئی نہیں رہتی۔ آج جو جدید ہے وہ کل قدیم ہو جائے گا بالکل اسی طرح جیسے کل جو جدید تھا آج وہ قدیم ہو چکا ہے۔ سدا جدید، سدا تازہ اور سدا بہار باتیں تو صرف Self Actualization سے ہی سمجھ میں آتی ہیں۔

پسِ تحریر ایپل کمپنی کے بانی چیئرمین سٹیو جاب کا انتقال ہو گیا۔ موت کی وجہ ان

کی پرانی بیماری جگر کا کینسر بنی جس میں وہ تقریباً پچھلے دس سال سے مبتلا تھے۔انہیں اس عہد کا سب سے بڑا موجد بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔امریکہ کی حکومت سے بھی زیادہ امیر کمپنی کے مالک کو عمر فقط پچاس سال نصیب ہوئی۔ مسلمان والد، جو کہ شام سے تعلیم حاصل کرنے آیا تھا، عبدالفتاح کی سٹیو جاب کی والدہ سے ملاقات دورانِ تعلیم ہوئی اور پڑھائی کے دوران ہی سٹیو پیدا ہوگیا جسے والدین نے باہمی رضامندی سے سلیکان ویلی کے ایک بے اولاد جوڑے کو دے دیا جو کہ بچہ گود لینے کا خواہشمند تھا۔گو کہ بعدازاں سٹیو جاب کے والدین کی آپس میں شادی بھی ہوگئی اور اس کی ایک بہن بھی پیدا ہوئی لیکن والدین سے رابطہ اس قدر محدود تھا کہ بہن جوان ہو چکی تھی جب اسے پتا چلا کہ اس کا کوئی بھائی بھی ہے۔

ہائی سکول میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں جب سٹیو جاب نے ایک ویڈیو گیم بنانے والی کمپنی میں پارٹ ٹائم نوکری کر لی جہاں اسے سٹیو وزنیاک ملا جس کے ساتھ مل کر پندرہ سال کی عمر میں اس نے ایپل کمپنی کی بنیاد رکھی۔سیب دونوں دوستوں کا پسندیدہ پھل تھا۔1974 میں دونوں نے پہلا کمپیوٹر بنا کر فروخت کے لیے پیش کیا اور پڑھائی کو خیر باد کہہ دیا۔اس کے بعد کی کہانی تو سب کو معلوم ہے کہ ماکن ٹوش سے آئی میک اور آئی پوڈ جس نے میوزک سننے کا انداز ہی بدل دیا، گویا پورا میوزک سنٹر ایک ڈبیا میں بند کر دیا۔2007 میں آئی فون سے تہلکہ مچانے کے بعد 2009 میں آئی پیڈ سے انقلاب برپا کرنے والے سٹیو جاب 2011 میں اپنی سالگرہ سے کچھ دن پہلے انتقال کر گئے۔اپنے ہندوستان کے سفر کے دوران اس نے بدھ مذہب اختیار کر لیا تھا اور تادمِ مرگ وہ سبزی خور رہا۔اس کی ایک بات آج بہت یاد آ رہی ہے کہ ”میں قبرستان میں سب سے امیر آدمی ہونے کی بجائے رات کو سوتے وقت اس احساس کو ترجیح دوں گا کہ آج میں نے کوئی تعمیری کام کیا ہے۔“ انسانیت اس صاحبِ نظر کی احسان مند ہے جس نے انسانی زندگی میں بہت ساری آسانیاں پیدا کر دیں۔

رکھ رکھاؤ

ہر معاشرہ خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ کسی بھی معاشرے میں اگر توازن نہ رہے تو وہ بکھر جاتا ہے اور اس کی جگہ ایسا معاشرہ جنم لیتا ہے جو متوازن ہوتا ہے۔ کہیں خوبیاں زیادہ اور خامیاں کم ہوتی ہیں تو کہیں خرابیاں زیادہ اور خوبیاں کم ہوتی ہیں۔ فرق صرف خوبیوں اور خامیوں کے باہمی تناسب کا ہی ہوسکتا ہے۔ خرابیاں ہی خرابیاں یا پھر خوبیاں ہی خوبیاں رکھنے والے معاشرے کا وجود اس دنیا میں نہیں ہے اور نہ ہی شاید انسانی تاریخ میں کبھی رہا ہے۔ جاپانی معاشرے کا ایک خوبصورت پہلو یہاں کا رکھ رکھاؤ اور عاجزی ہے جسے مشرقیت بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ پہلو اتنا اہم ہے کہ اس ذکر کے بغیر یہاں کے متعلق مفصل ترین بیان بھی نامکمل اور تشنہ ہی شمار ہوگا۔ کسی بھی ملک میں سب سے دلچسپ چیز مجھے تو وہاں کے باشندے اور ان کا رہن سہن محسوس ہوتی ہے یا پھر قدرتی مناظر، عمارتیں اور دیگر مادی اشیاء تو پوری دنیا میں اب ملتی جلتی محسوس ہونے لگی ہیں۔ اس معاشرے کا رکھ رکھاؤ ایسا ہے کہ صاف انکار نہیں کیا جاتا بلکہ اشارے کنایہ سے بات کی جاتی ہے۔ عموماً نہیں کی جگہ پر ''ذرا......!'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے یا پھر ''تھوڑا سا مشکل ہے!'' بلکہ پورے فقرے کی جگہ صرف ''تھوڑا سا'' کہہ دیا جاتا ہے۔ یہاں انگریزی پڑھانے کے لیے آئے ہوئے غیر ملکی اساتذہ ملاقاتوں میں اکثر اس مشکل کا ذکر کرتے ہیں کہ یہاں بچوں کو No سکھانا بڑا مشکل ہے۔ جب بچوں کو No کہنا سکھایا جاتا ہے تو وہ

کو بھی ''ہاں! مگر نہیں'' کہتے ہیں۔ سیدھا ''نہیں'' کہنے کا بچوں میں تصور ہی نہیں ہے جس پر غیر ملکی اساتذہ اپنا سر پکڑ لیتے ہیں۔

خدا حافظ کہنے کے لیے یہاں جو لفظ استعمال ہوتا ہے وہ ''سایونارا'' ہے جس کا مطلب ہے کہ اگر یہ ہونا ہی ہے......! یعنی جُدا ہونے کا دکھ اتنا ہے کہ پورا فقرہ بھی نہیں کہا جاتا بلکہ اشارتاً یہی کہا جاتا ہے کہ ''اگر یہی قسمت ہے......! اور جدائی یا بچھڑنے کا لفظ زبان پر نہیں لایا جاتا۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ جنسی عمل و مباشرت کے لیے جاپانی زبان میں کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ خواجہ محمد زکریا چار سال تک جاپان کے مختلف علاقوں میں اردو زبان کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔ اپنے قیام کی یاداشتیں ویسے تو وہ اپنی آپ بیتی میں تحریر کر رہے ہیں لیکن گزشتہ دنوں ہونے والی ایک ملاقات میں انہوں نے اپنے دوست کے ساتھ پیش آنے والا ایک واقعہ سنایا جس سے جاپانی معاشرے کے DNA کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔ خواجہ صاحب کا غیر ملکی دوست جسے یہاں آئے بھی تھوڑا وقت ہی گزرا تھا ان کے قریب ہی ایک کثیر المنزلہ عمارت میں منتقل ہو گیا۔ مذکورہ دوست موسیقی کا دلدادہ تھا۔ رات کو نیند نہ آئی تو وائلن بجانے لگا۔ وہ وائلن بجا رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دوست نے دروازہ کھولا تو ایک ہمسایہ جاپانی باہر کھڑا تھا۔ مسکرا کر کہنے لگا کہ آپ وائلن بڑا اچھا بجاتے ہیں اور یہ کہہ کر چلا گیا۔ غیر ملکی دوست اگلی رات پھر گھر کی تنہائی سے اکتایا تو وائلن بجانے لگا اور پھر اسی جاپانی ہمسائے نے دستک دی اور دوبارہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ آپ وائلن بڑا اچھا بجاتے ہیں جب کئی مرتبہ یہ واقعہ دہرایا گیا تو خواجہ صاحب کے غیر ملکی دوست نے یہ واقعہ خواجہ صاحب کو بتایا کہ میں جب بھی رات کو وائلن بجاتا ہوں تو میرا ہمسایہ آ کر کہتا ہے کہ ''آپ وائلن بڑا اچھے بجاتے ہیں'' جس پر خواجہ محمد زکریا نے اپنے غیر ملکی دوست کو سمجھایا کہ پگلے وہ اصل میں تمہیں شکایت کر رہا ہے کہ تمہاری وجہ سے میں ڈسٹرب ہو رہا ہوں تم وائلن مت بجاؤ۔ ممکن ہے اس معاشرے کی اخلاقیات ترتیب دینے میں مذہب کا بھی کوئی کردار رہا ہو لیکن

فی زمانہ ملکی قانون ہی اخلاقی معیار بھی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں کے قانون تہذیب وتمدن سے اس طرح کشید کیے گئے ہیں کہ قانوناً جرم چیز اخلاقی اعتبار سے بھی غلط اور گناہ سمجھی جاتی ہے اور قانون جس چیز کی تحسین کرتا ہے معاشرہ بھی اسے ہی صحیح اور ثواب سمجھتا ہے۔ یہ معاشرہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ ملکی قانون کو ایک روحانی تقدس بھی حاصل ہے جس کی حالیہ مثال زلزلے اور سونامی کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بجلی کی پیداوار میں کمی کا بحران ہے۔ بجلی کی کمی کو پورا کرنے کے لیے حکومت نے تمام بڑی کمپنیوں کو پندرہ فیصد بجلی کا استعمال کم کرنے کے لیے کہا بصورت دیگر حکومت کا لوڈ شیڈنگ کرنے کا منصوبہ تھا لیکن حکومت کے اس اعلان کے بعد لوگوں نے بجلی کا استعمال رضا کارانہ طور پر اتنا کم کر دیا کہ پورے ملک میں مجموعی طور پر بیس فیصد بجلی کم استعمال ہونے لگی اور پیداوار کی کمی خود بخود پوری ہوگئی جس کی وجہ سے لوڈ شیڈنگ کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ویسے تو برسبیل تذکرہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں اگر کل سے لوگ ایئر کنڈیشن چلانا بند کر دیں تو پرسوں سے ہمارے ملک میں لوڈ شیڈنگ ختم ہو جائے گی مگر

؎ ایں خیال است ومحال است وجنوں است

جاپانیوں کی مشرقی اقدار کی تحسین کرتے ہوئے مجھے ابن انشاء کا وہ تعریفی خط یاد آ رہا ہے جو انہوں نے ایک مرتبہ قاسمی صاحب کے ایک اخباری کالم کے جواب میں لکھا تھا جس کے آخر میں وہ یوں رقم طراز ہوئے کہ ''اس سے زیادہ میں آپ کی تعریف نہیں کروں گا کیونکہ کسی کی پیٹھ پیچھے تعریف کرنا مشرقی آداب کے خلاف سمجھا جاتا ہے'' ویسے تو ابن انشاء کے بقول اس حمام میں سبھی ننگے ہیں کا اردو محاورہ جاپانی ''ساونا'' دیکھنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے۔ اس تمام تذکرے کا سبب جاپانی معاشرے سے مرعوبیت قطعاً نہیں بلکہ یہ فطری خواہش ہے جو کسی بھی معاشرے کی کوئی بھی خوبی دیکھ کر دل میں پیدا ہوتی ہے کہ یہ خوبی پاکستانی معاشرے میں بھی پروان چڑھنی چاہیے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں اس تاثر سے متفق نہیں ہوں کہ ہمارا معاشرہ صرف خرابیوں کا مجموعہ ہے۔ بلکہ پوری دیانت داری سے یہ

سمجھتا ہوں کہ ہم میں بے شمار انمول خوبیاں بھی ہیں اور اقبالؒ کے اس فلسفے کا حامی ہوں کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔ میں اپنے اکثر دانشور دوستوں کے اس نقطۂ نظر سے بھی اختلاف رکھتا ہوں کہ معاشرے سے خرابیاں ختم کرنے سے ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ خرابی ختم کرنے سے خوبی پیدا نہیں ہو جاتی بلکہ خوبیاں پیدا ہونے سے خامیاں اگر ختم نہ بھی ہوں تب بھی دب ضرور جایا کرتی ہیں۔

ٹوکیواولمپک2020ء

ٹوکیو کے گورنر نے2020ء کے اولمپک کی میز بانی کے لیے اپنے شہر کوامیدوار کے طور پر پیش کر دیا ہے۔ یہ اعلان انہوں نے انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کے صدر جیکس روگی کی موجودگی میں کیا جو حالیہ دنوں جاپان سپورٹس ایسوسی ایشن اور جاپانی اولمپک کمپنی کی سوسالہ تقریبات میں شرکت کے لیے ٹوکیوآئے ہوئے تھے۔ مذکورہ تنظیموں کے قیام کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے کی یہ اختتامی تقریب تھی جس میں ٹوکیوکو2020ءاولمپک کی میز بانی کے لیے بطور امیدوار پیش کرتے ہوئے شہر کے گورنر نے کہا کہ حالیہ زلزلے،سونامی اور ایٹمی بحران سے متاثرہ جاپان کے لیےاولمپک تعمیرنو کے لیےایک سنگِ میل ثابت ہوں گے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ کہاں سن 2020ء اور کہاں آج کے مسائل حاضرہ تو گزارش ہے کہ 2020ء کے اولمپک کی میز بانی کے لیے درخواست دینے کی آخری تاریخ چند ہی دنوں میں آنے والی ہے۔ٹوکیو کے علاوہ میڈرڈ، استنبول اور روم پہلے ہی مقابلے کے لیے میدان میں اتر چکے ہیں۔ بلکہ میڈرڈ مسلسل تیسری دفعہ میدان میں ہے کہ شاید اس باراولمپک کی میز بانی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ ویسے تو ٹوکیو بھی پچھلی مرتبہ اولمپک 2016ء کی میز بانی حاصل کرنے کی ناکام کوشش کر چکا ہےلیکن وہ ایک الگ دلچسپ داستان ہے جسے آخر میں بیان کروں گا۔ٹوکیو کی مقامی حکومت اور مقامی اولمپک کمیٹی نے اعلان کیا ہے کہ کامیابی کی صورت میں زلزلے، سونامی اور ایٹمی بحران سے متاثرہ علاقوں سے نا صرف کہ اولمپک مشعل گزاری جائے گی بلکہ اولمپک کے کچھ ایونٹ بھی وہاں

منعقد کیے جائیں گے جن میں فٹ بال سرفہرست ہے۔ جاپان اولمپک کمیٹی کے صدر کا تو یہ کہنا ہے کہ جیسے 1964 کے ٹوکیو اولمپک نے ساری دنیا کو پیغام دیا تھا کہ جاپان دوسری جنگِ عظیم کے اثرات سے باہر نکل آیا ہے بالکل ویسے ہی 2020ء اولمپک یہ ظاہر کردے گا کہ ہم زلزلے، سونامی اور ایٹمی بحران کی تباہ کاریوں کے اثرات سے چھٹکارہ پا چکے ہیں لیکن ایسا نہیں کہ ہر کوئی جاپان کی جانب سے کی جانے والی ان کوششوں سے خوش ہے۔ ایٹمی بحران کے مرکز فوکوشیما کے گورنر سے جب اولمپک 2020ء کے بارے میں رائے مانگی گئی تو ان کا کہنا تھا کہ اس وقت ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ اولمپک کے بارے میں بات کریں۔ میرے شہر کے لوگ ابھی تک دربدر پھر رہے ہیں۔ مجھے تو ان لوگوں کو واپس گھر لانے کی فکر ہے اس لیے اولمپک کا ذکر میرے ساتھ نہ کریں تو بہتر ہے۔ تاہم سونامی سے متاثرہ دوسرے علاقوں کے منتخب نمائندے اولمپک کو امید کی ایک کرن اور تعمیر نو کا موقع قرار دیتے ہیں۔ یہاں اولمپک کی میزبانی حاصل کرنے کے لیے کامیابی میں ایک خدشہ یہ بھی حائل ہے کہ 2018ء کے سرما اولمپک کے مقابلے چونکہ کوریا میں ہو رہے ہیں اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ 2020ء کے اولمپک کی میزبانی کسی دوسرے براعظم کو دی جائے گی۔ جب اس خدشے کا اظہار انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کے صدر جیکس روگی سے صحافیوں نے ان کی پریس کانفرنس میں کیا تو انہوں نے اس تاثر کی نفی کر دی اور ان خدشات کو یکسر مسترد کرتے ہوئے کہا کہ انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی میزبان ملک اور شہر کا انتخاب براعظم کی بنیاد پر نہیں کرتی بلکہ معیار کی بنیاد پر کرتی ہے۔ اپنے بیان کے حق میں دلائل دیتے ہوئے انہوں نے ماضی میں ہونے والے اولمپک مقابلوں کی مثالیں پیش کیں اور کہا کہ ہم اولمپک 2020 مقابلوں کے لیے ٹوکیو کو بحیثیت امیدوار خوش آمدید کہتے ہیں۔ یہاں آپ کو جاپان کی جانب سے اولمپک کی میزبانی حاصل کرنے کی گزشتہ کوشش کا بھی احوال بیان کر دیں۔ اولمپک 2016 کی میزبانی کے لیے برازیل کا شہر ریو ڈی جنیر (Rio de Janero) کامیاب قرار پایا۔ جبکہ ناکام ہونے والے امیدواروں میں شکاگو اور میڈرڈ کے علاوہ ٹوکیو

بھی شامل تھا۔ جاپان کی 2016ء کے اولمپک کی میزبانی کی خواہش تو پوری نہ ہوسکی لیکن بطور امیدوار اس نے جو ابتدائی تیاریاں کی تھیں اُن پر اس کا خرچ 13 ارب روپے سے زائد آیا تھا جو کہ بظاہر ضائع چلا گیا۔ یہاں کی مقامی اولمپک کمیٹی اولمپک 2016ء کی میزبانی حاصل کرنے کی ناکام کوشش کے بعد تندو تیز اور الٹے سیدھے سوالوں کی زد میں رہی۔ سب سے عام سوال یہ تھا کہ 13 ارب روپے کی رقم کیسے خرچ کی گئی اور اولمپک مقابلوں کے لیے رکھی گئی زمین کا اب کیا مستقبل ہو گا؟ کوپن ہیگن میں اولمپک 2016ء کی میزبانی کا فیصلہ ریو دی جینرو کے حق میں ہونے کے کچھ ہی دیر بعد حکمران جماعت کا ایک رکن اسمبلی اکاؤنٹنٹ جمع کرنے میں مشغول نظر آیا اس کا کہنا تھا کہ جیسا کہ ٹوکیو 2016ء اولمپک گیمز کے انعقاد کی جنگ ہار چکا ہے اس لیے ٹوکیو کے شہریوں کا یہ جاننا حق ہے کہ ٹوکیو میونسپلٹی نے ان کی رقم کیسے خرچ کی اور مقامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ واضح کرے کہ اس نے یہ رقم کہاں خرچ کی تھی۔ ٹوکیو کے گورنر بطورِ خاص ہدف تنقید بنے اور ان کے استعفیٰ تک کا مطالبہ سامنے آیا لیکن گورنر نے استعفیٰ دینے کے کسی امکان کو رد کر دیا تھا۔ تاہم اگلی بار گورنر کا انتخاب نہ لڑنے کا اعلان کر دیا۔ یہاں پر گورنر براہِ راست ووٹوں سے منتخب ہوتا ہے۔ خود پر ہونے والی تنقید کے جواب میں گورنر کا کہنا تھا کہ اولمپک 2016ء کے امیدوار کے طور پر کی جانے والی تیاری پر اٹھنے والے اخراجات کے معاملے پر پارلیمنٹ میں بحث ہونی چاہیے۔ مقامی حکومت نے ٹوکیو کے لیے اس وقت بھی اولمپک گیمز 2020ء کی میزبانی کے متعلق بات کی تھی لیکن یہ تو بہت دور کی بات لگتی تھی مگر وقت گزرتے کیا پتا چلتا ہے۔ لندن اولمپک 2012ء اور ریو اولمپک 2016ء کے بعد ہوسکتا ہے 2020 کے اولمپک کے لیے ایک بار پھر ٹوکیو منتخب ہو جائے۔ مگر اس کے فیصلے کے لیے 2013ء تک انتظار کرنا پڑے گا۔ یاد رہے کہ ٹوکیو ایشیا کا پہلا شہر تھا جسے اولمپک گیمز کی میزبانی کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ ٹوکیو اولمپک 1964ء میں حصہ لینے والے مختلف اتھلیٹ بھی ٹیلی ویژن چینلز پر ان دنوں اپنے تاثرات بیان کرنے میں مشغول

نظر آتے رہے۔ انہی میں سے ایک 73 سالہ ناگا شیما کہہ رہے تھے کہ نصف صدی پہلے ٹوکیو اولمپک دیکھنے والی نسل تو معدوم ہو چلی ہے، ہماری یہ خواہش تھی کہ آئندہ نسل یہ اولمپک گیمز ٹوکیو میں دیکھ لیتی جو کہ پوری نہیں ہوسکی۔ کچھ جذباتی قسم کے لوگ اولمپک 2016ء کی میزبانی حاصل کرنے میں ٹوکیو کی ناکامی کو ہزیمت سے تعبیر کررہے تھے۔ لیکن یہ کسی طور پر بھی امریکہ سے بڑی ناکامی نہیں تھی جس کے صدر بارک اوباما اپنی اہلیہ سمیت خود کوپن ہیگن پہنچے تھے تاکہ اپنے شہر شکاگو میں 2016ء اولمپک مقابلوں کا انعقاد یقینی بنایا جاسکے۔ بارک اوباما اولمپک 2016ء کی میزبانی کے لیے ہونے والی دوڑ میں سب سے طاقتور عنصر خیال کیے جارہے تھے لیکن امریکہ تو پہلے راؤنڈ میں ہی اس دوڑ سے باہر ہوگیا۔ ٹوکیو تو پھر بھی دوسرے راؤنڈ میں مقابلے سے باہر ہوا تھا۔ مبصرین کا ٹوکیو کی ناکامی کے بارے میں یہ خیال مضبوط دلیل کی حیثیت رکھتا تھا کہ ٹوکیو یہ ثابت کرنے میں ناکام رہا کہ وہاں دوسری مرتبہ اولمپک مقابلے کس وجہ سے ہونے چاہئیں؟ جبکہ ریو دی جنیرو کے حق میں برازیل کے صدر کی یہ دلیل کامیاب رہی کہ چونکہ جنوبی امریکہ میں کبھی بھی اولمپک گیمز نہیں ہوئیں اس لیے ریو دی جنیرو کو یہ اعزاز ملنا چاہیے۔ مرکزی اولمپک کمیٹی کے وہ ارکان جو ماحولیاتی آلودگی کے متعلق حساس ہیں، ان کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے ٹوکیو اولمپک کمیٹی اپنے استعمال کے لیے بجلی سے چلنے والی کاریں لے کر گئی تھی تاکہ ٹوکیو کو ماحول دوست میزبان کے طور پر پیش کیا جاسکے لیکن اس ساری کاوش کا نتیجہ بس یہی تھا کہ ''کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا بارہ آنہ۔'' مگر اس بار زلزلے، سونامی اور ایٹمی بحران کے بعد تعمیر نو کا موضوع اولمپک کمیٹی کے اراکین کی حمایت کا سبب بن سکتا ہے۔ کھیل سے ہی منسلک ایک اور چھوٹی سی خبر جس سے یہاں کے سماجی ڈھانچے اور دیانت داری کے مروجہ معیار کو سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ گالف یہاں کے مقبول کھیلوں میں سے ایک ہے، گزشتہ دنوں یہاں کیوٹو شہر میں پیناسونک گالف ٹورنامنٹ کا انعقاد ہوا جس میں ملک کے تمام بڑے کھلاڑیوں نے حصہ لیا۔ شائقین کی تعداد بھی چالیس ہزار کے قریب تھی۔ تماشائیوں میں سیکورٹی کے لیے پولیس انچارج

چند دوست بھی شامل تھے۔ میچ کے دوران پولیس افسر کے دوستوں کو دو کلومیٹر کی مسافت پر کسی کام سے جانا پڑا تو پولیس افسر نے دوستی کے ناتے ایک جونیئر افسر کو پولیس کی گاڑی دے کر ان کے ساتھ بھیج دیا۔ پولیس کی گاڑی افسر کے دوستوں کو چھوڑ کر واپس آ گئی لیکن کسی طرح سے یہ واقعہ منظر عام پر آ گیا کہ پولیس افسر نے سرکاری گاڑی کو ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے اور جو جونیئر افسر متذکرہ تماشائی دوستوں کو چھوڑنے گیا وہ اس وقت سرکاری ڈیوٹی پر مامور تھا اس لیے اس خبر پر شور مچ گیا۔ یہ واقعہ جو کہ ہمارے ہاں تو شاید خبر بننے کے لائق بھی نہیں ہے میڈیا میں نشر ہونے کے بعد پولیس کے ضلعی سربراہ کے ساتھ مذکورہ افسروں نے میڈیا کے سامنے آ کر قوم سے معافی مانگی۔ یہاں معافی بس زبانی کلامی نہیں مانگی جاتی بلکہ معافی مانگنے کی تقریب ہوتی ہے جس میں معافی مانگنے والا شخص یا افراد زمین پر دو زانو ہو کر بیٹھتے ہیں اور پھر سر کو جھکاتے ہوئے زمین کے قریب لے جاتے ہیں اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے معافی طلب کرتے ہیں۔ ایسی تقریب کی پوری پوری میڈیا کوریج کی جاتی ہے۔

جدید ٹیکنالوجی اور جدیدیت جس طرح پوری دنیا کے لوگوں کی زندگی پر اثر انداز ہو رہی ہے اسی طرح جاپانیوں کو بھی متاثر کر رہی ہے لیکن یہاں پر ٹیکنالوجی کے اثرات باقی دنیا کی نسبت زیادہ گہرے محسوس ہوتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نئی سے نئی ایجاد ہونے والی چیز بھی یہاں کی غالب اکثریت کی قوتِ خرید میں ہوتی ہے اور روزمرہ زندگی سے متعلق ٹیکنالوجی تو 90 فی صد سے زائد لوگوں کی قوت خرید میں ہے اس کی وجہ لوگوں کی تنخواہوں کی بلند شرح ہے ورنہ مہنگائی تو یہاں بھی بہت ہے۔ آپ یہ پڑھ کر شاید حیران ہوں کہ جاپان میں استعمال ہونے والے کریڈٹ کارڈ، ڈیبٹ کارڈ یا کسی بھی طرح کے الیکٹرک کارڈوں کی تعداد یہاں کی مجموعی آبادی سے بڑھ گئی ہے۔ اب تک جاپان کی مجموعی آبادی تیرہ کروڑ سے تھوڑی سی کم ہے جبکہ پیسوں کے متبادل کے طور پر استعمال ہونے والے الیکٹرک کارڈوں کی تعداد چودہ کروڑ سے زیادہ ہے۔ گزشتہ ماہ ہونے والے ایک سروے کے مطابق 18 سال یا اس سے زیادہ عمر کے 60 فی صد لوگوں کے پاس سمارٹ کارڈ یا کوئی بھی پیسوں کی جگہ استعمال

ہونے والا الیکٹرک کارڈ موجود ہے۔ رواں مالی سال کے دوران الیکٹرک کارڈ سے کی جانے والی ادائیگیوں کا اندازہ 100 کھرب روپے سے زیادہ کا ہے۔

<u>پسِ تحریر</u>

ٹوکیو 2020 اولمپک کی میزبانی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

بلٹ ٹرین

جاپان کا نام سنتے ہی کسی بھی غیر ملکی کے ذہن میں جو چند چیزیں فوری طور پر آتی ہیں ان میں سے ایک تیز ترین ریل گاڑی بھی ہے۔ بلٹ ٹرین جسے عرف عام میں شن کان سین کہا جاتا ہے۔ ہر روٹ کے لیے یہاں ایک الگ نام رکھتی ہے۔ان میں سے ایک معروف نام ''خیال'' بھی ہے۔شاید یہ خیال کی طرح تیز رفتاری سے سفر کرتی ہے اسی سبب سے اسے یہ نام دیا گیا ہے۔

تازہ خبر یہ ہے کہ شن کان سین نے ٹوکیو اور آؤموری کے درمیان نئی سروس کا آغاز کیا ہے اور دنیا کی تیز ترین ریل گاڑی ہونے کا اپنا ہی ریکارڈ بہتر بنایا ہے۔ابتدائی طور پر اس کی رفتار 320 کلومیٹر فی گھنٹہ رکھی گئی ہے جو کہ اگلے برس 360 کلومیٹر فی گھنٹہ کر دی جائے گی۔ کیونکہ اس سال نئی پٹڑی کی کارکردگی کا جائزہ بھی لیا جائے گا۔اس ٹرین کی سفر کرنے کی ٹیسٹ رفتار تو 584 کلومیٹر فی گھنٹہ ریکارڈ کی گئی ہے لیکن وہ ایک خطرناک سطح کی رفتار ہے جس پر فی الحال حفاظت کی ضمانت نہیں دی جاسکتی اور بلٹ ٹرین کا تو نعرہ ہی یہ ہے کہ ''حفاظت ہمارا اولین نصب العین'' وہ اس دعوے میں حق بجانب بھی ہیں کہ 1964 میں اپنے افتتاح سے لے کر آج تک بلٹ ٹرین کو ایک بھی حادثہ پیش نہیں آیا ہے۔ گو کہ حالیہ زلزلے کے دوران ایک ٹرین پٹڑی سے اتر گئی تھی لیکن اس میں کوئی بھی شخص زخمی یا ہلاک نہیں ہوا۔اس معمولی حادثے کو ہم استثنیات میں شامل کر سکتے ہیں کہ یہاں کی تین سو سالہ تاریخ میں ایسا زلزلہ بھی کبھی نہیں آیا تھا جس کی شدّت سسمیک سکیل پر 9 تک ریکارڈ کی گئی

ہو۔ بلکہ دنیا کی تاریخ میں بھی یہ دوسرا سب سے شدید زلزلہ تھا۔ یہاں آپ کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ بلٹ ٹرین ریل کی عام استعمال ہونے والی پٹڑی پر نہیں چلتی ہے۔ اس کا مخصوص ٹریک ہوتا ہے جس میں لوہے اور دیگر دھاتوں کے علاوہ مقناطیس استعمال کیا جاتا ہے تاکہ ٹرین اور پٹڑی میں باہمی کشش پیدا کی جا سکے۔ گاڑی کے ڈبے بناتے ہوئے بھی اسی تکنیک کو استعمال کیا جاتا ہے۔ گاڑی کے ڈبوں میں شور کو کم کرنے کا بھی بندوبست کیا جاتا ہے کیونکہ تین سو کلومیٹر فی گھنٹہ سے بھی زیادہ رفتار پر شدید شور کا پیدا ہونا ایک منطقی عمل ہے جس کو قابو میں لایا جاتا ہے۔

بلٹ ٹرین کی پٹڑی آبادیوں میں سے گزرتے ہوئے حفاظتی نقطہ نظر کے تحت سطح زمین سے عموماً بیس فٹ اونچائی پر ہوتی ہے تاکہ اس سے آ کر کوئی چیز نہ ٹکرا سکے۔

عقاب کی چونچ جیسا منہ لیے شن کان سین گزشتہ دنوں جب ٹوکیو سے آؤموری کے درمیان بنائی گئی نئی پٹڑی پر پہلی مرتبہ روانہ ہوئی تو اس کی تمام نشستیں بھری ہوئی تھیں۔ نشستوں پر براجمان مسافروں میں سے زیادہ تر شوقین لوگ تھے کیونکہ پندرہ ہزار روپے کا ریل ٹکٹ ان لوگوں نے انٹرنیٹ سے بلیک میں چار چار لاکھ روپے تک خریدا تھا تاکہ اس یادگار سفر کا حصہ بن سکیں۔ ایک خبر یہ بھی ہے کہ پولیس بلیک میں فروخت کیے گئے ٹکٹوں کے متعلق تحقیقات کر رہی ہے۔ یہاں کے قانون کے مطابق دوبارہ فروخت کے لیے ریل کا ٹکٹ خریدنا جرم ہے۔ ریکارڈ ساز رفتار کے ساتھ ٹرین کے پہلے سفر کے لیے جب ریلوے حکام نے ٹکٹ فروخت کے لیے پیش کیے تو تمام ٹکٹ 24 سیکنڈ میں ہی فروخت ہو گئے تھے۔ پولیس کی تحقیقات کا جو بھی نتیجہ نکلے لیکن مسافروں کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ یہاں بلیک میں ٹکٹ بیچنا جرم ہے مگر خریدنا جرم نہیں ہے۔ بلٹ ٹرین کو جاپان کا طرۂ امتیاز خیال کیا جاتا ہے۔ اس وقت وہ دنیا میں اس ٹیکنالوجی کا سب سے بڑا برآمد کنندہ بھی ہے۔ یورپ سے لے کر امریکہ تک ہر طرف بلٹ ٹرین کے شعبے میں اسی کی اجارہ داری محسوس ہوتی ہے لیکن یہ صورت حال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہے گی کیونکہ تازہ ترین اعداد و

شمار کے مطابق آئندہ دس برس میں چین اس کی جگہ لیتا نظر آ رہا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت جاپان میں بلٹ ٹرین کی پٹڑی سب سے زیادہ ہے لیکن اگلے دس سال کے لیے چین میں پوری دنیا میں پائی جانے والی بلٹ ٹرین کی پٹڑی کی مجموعی لمبائی سے بھی زیادہ ٹریک بچھائے جانے کے منصوبے زیرِ تکمیل ہیں۔

اس کے باوجود ریلوے کے شعبے میں تمام دنیا اب بھی جاپان کی طرف دیکھتی ہے۔اس کی تازہ مثال دوبئ میں حال ہی میں تکمیل پانے والا زیرِ زمین میٹرو منصوبہ ہے جسے ایک جاپانی کمپنی نے بنایا ہے۔گزشتہ دنوں مجھے اس ٹرین میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔یقین کیجئے ایسی زیرِ زمین ریل سروس نیویارک ،لندن یا یورپ کے کسی بھی شہر میں نہیں ہے۔ٹوکیو کی میٹرو بھی اس سے پیچھے دکھائی دیتی ہے کیونکہ جاپانی کمپنی نے دوبئ کے اپنے منصوبے میں زیادہ جدید ٹیکنالوجی استعمال کی ہے اور لندن کی ٹیوب یا نیویارک کا Subway تو اس کے مقابلے میں گزرے زمانے کی یادگاریں محسوس ہوتی ہیں۔

بلٹ ٹرین کی رفتار اور فاصلے کا حساب لگاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ جب پاکستان میں یہ ریل سروس شروع ہوگی تو لاہور سے کراچی کا فاصلہ چار گھنٹے سے بھی کم رہ جائے گا اور ملک کے کسی بھی کونے سے دوسرے کونے تک کا سفر پانچ چھ گھنٹے سے زیادہ نہ ہوگا۔یہاں جاپانی معاشرے کا ایک دلچسپ پہلو آپ کو بتاتا چلوں کہ یہاں لوگ فاصلے کا حساب کلومیٹر یا میلوں میں نہیں کرتے بلکہ اس کا پیمانہ وقت ہوتا ہے۔اگر کسی سے آپ پوچھیں کہ فلاں جگہ کتنی دور ہے تو جواب منٹوں یا گھنٹوں کی صورت میں ہوگا۔

پاکستان میں بلٹ ٹرین کے تصور کے متعلق عرض کر رہا تھا کہ ہمارا جغرافیہ ایسا ہے کہ جب بلٹ ٹرین کی سروس شروع ہو جائے گی تو اندرونِ ملک لوگ شاید ہوائی جہاز پر سفر کرنا ہی چھوڑ دیں گے۔یہاں پر بھی ایسا ہی ہے کہ اگر پانچ سو کلومیٹر سے کم فاصلہ درپیش ہو اور ان مقامات کے درمیان بلٹ ٹرین کی سروس موجود ہو تو عموماً ہوائی جہاز کی سروس دستیاب ہی نہیں ہوتی۔

زلزلے، سونامی اور ایٹمی بحران

یہاں زلزلے معمول کی بات خیال کیے جاتے ہیں۔ چھوٹے موٹے زلزلے کے دوران تو کاروبارِ زندگی لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں رکتا۔ طرزِ تعمیر کچھ ایسا ہے کہ بڑے بڑے زلزلے بھی جھیل جاتا ہے اور عمارتیں لچکاتی لہراتی ضرور ہیں لیکن گرتی نہیں ہیں۔ روایتی طور پر یہاں مکان لکڑی سے بنائے جاتے ہیں اور کنکریٹ زیادہ تر بلند و بالا اور بڑی عمارتوں میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اس امر کا ذکر بھی دلچسپ ہوگا کہ جاپان میں تعمیراتی لکڑی پاکستان سے بھی سستی ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ زیادہ تر لکڑی روس سے درآمد کرتا ہے۔ لکڑی زلزلے کے جھٹکوں کے دوران بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ مگر اس بار آنے والا زلزلہ بہت مختلف نوعیت کا تھا۔ تین سو سال کی تاریخ میں اس شدت کا زلزلہ اس سرزمین کے لوگوں نے نہیں دیکھا تھا۔ سسمیک سکیل پر اس کی شدت 9 ریکارڈ کی گئی۔ اس زلزلے کا ایک خاص پہلو اس کا طویل دورانیہ بھی تھا جس کا ذکر کم کم ہی ہوا ہے۔ ابتدا میں تو ہم سب سمجھے کہ جھٹکا تھا، گزر گیا، لیکن ہمارا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں شدت آتی گئی۔ تیس منٹ تک تو زلزلے کے جھٹکوں میں تسلسل کے ساتھ شدت آتی رہی اس کے بعد بھی ایک گھنٹے تک وقفے وقفے سے کم شدت کے جھٹکے آتے رہے۔

بعدازاں زمین تو ساکت ہوگئی لیکن اس دوران بہت کچھ بدل چکا تھا۔ خالصتاً زلزلے کی وجہ سے ہلاکتیں تو بہت کم تعداد میں ہوئیں جس کی وجہ طرزِ رہائش اور معیارِ تعمیر ہے مگر یہ زلزلہ زمین کے اوپر ہی نہیں آیا تھا۔ سمندر کے فرش کو بھی اس نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا

جس کے نتیجے میں سونامی پیدا ہوئی۔سونامی جاپانی زبان کا لفظ ہے جو اس سمندری طوفان اور بلند لہروں پر مبنی عمل کو کہتے ہیں جو سمندر کے فرش پر آنے والے زلزلے کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔اس عمل کی دریافت سب سے پہلے جاپانیوں نے کی تھی اور اس کے لیے سونامی کی اصطلاح استعمال کی اور بعد میں باقی تمام دنیا نے بھی اس لفظ کو من وعن اپنا لیا اور اب تقریباً تمام زبانوں میں یہی لفظ رائج ہے۔اس بار زلزلے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سونامی بھی ریکارڈ تھی۔سمندر میں جہاں اس نے جنم لیا اس کی اونچائی ساٹھ میٹر تھی اور ساحل سے ٹکراتے وقت لہروں کی سطح بیس میٹر تک ریکارڈ کی گئی۔سونامی جہاں جہاں داخل ہوئی سب کچھ نگل گئی۔اگر کہا جائے کہ کئی شہروں کو نگل گئی تو بھی کچھ غلط نہ ہوگا۔صرف ضلع میاگی میں لاپتہ افراد کی تعداد پندرہ ہزار ہے جن میں سے شاید چند افراد ہی اس وقت زندہ ہوں۔ سونامی سے ہلاک ہونے والے افراد کی صحیح تعداد تو شاید کبھی بھی معلوم نہ ہو سکے لیکن یہ زلزلے کے پہلے دن کا ذکر تھا۔اگلے دن خبر چلی کہ زلزلے سے فوکوشیما شہر میں واقع ایٹمی بجلی گھر بھی متاثر ہوا ہے۔ ساتھ ہی خبر آئی کہ بجلی گھر میں موجود جوہری پلانٹ کا درجۂ حرارت مسلسل بڑھ رہا ہے اور اس کو ٹھنڈا کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔اسی دوران ایک جوہری پلانٹ میں دھماکہ ہو گیا جس کی وجہ سے اس کو بجلی کی فراہمی معطل ہو گئی اور کنٹرول روم سے اس کا رابطہ منقطع ہو گیا۔جوہری پلانٹ کو تباہ ہونے سے بچانے کے لیے مسلسل کوششیں ہو رہی ہیں اور ان میں کافی حد تک کامیابی کا دعویٰ بھی کیا گیا ہے لیکن ناقدین کی رائے میں ایک ماہ سے جاری ان کوششوں کا حال ایک قدم آگے اور ایک قدم پیچھے والا ہے۔ابھی تک جوہری پلانٹ کا درجۂ حرارت کنٹرول نہیں کیا جا سکا۔اس ایٹمی بحران کی ابتدا سے ہی اس کا تقابل روس کے چرنوبل بجلی گھر سے کیا جا رہا ہے جس میں لاکھوں کی تعداد میں انسانی جانوں کا ضیاع ہوا۔یہ صورت حال 1986ء کے چرنوبل سے اس طرح مختلف ہے کہ چرنوبل کا بجلی گھر رات کے وقت یک دم پھٹ گیا تھا اور لوگوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا جبکہ اس بجلی گھر کے ارد گرد تیس کلومیٹر کا علاقہ پہلے ہی خالی کرا لیا گیا ہے۔ دوسرا د

چرنوبل میں استعمال ہونے والی ٹیکنالوجی بہت پرانی تھی جس میں کئی حفاظتی اقدامات کونظرانداز کیا گیا تھا۔جبکہ فوکوشیما میں استعمال ہونے والی ٹیکنالوجی نئی، بہتر اور زیادہ محفوظ ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ پلانٹ اب تک نہیں پگھلا ہے۔

جاپان کے جوہری بحران سے تمام وہ ممالک جہاں ایٹمی بجلی گھروں سے توانائی حاصل کی جا رہی ہے تشویش میں مبتلا ہوگئے ہیں۔پوری دنیا میں یہ بحث شروع ہوگئی ہے کہ جوہری توانائی کا حصول کس حد تک ناگزیر ہے؟ اوراس کا مستقبل کیا ہوگا؟ جرمنی میں ایٹمی بجلی گھروں کو بند کرنے کے لیے مظاہرے ہوئے جن کے نتیجے میں چانسلرمرکل نے سات ایٹمی بجلی گھروں کوایک سال کے اندراندر بند کرنے کا اعلان کر دیااور دوکوتو فوری طور پر بند بھی کر دیا گیا۔اس کے باوجود لاکھوں لوگوں نے ایٹمی بجلی گھر مکمل طور پرختم کرنے کے لیے مظاہرے جاری رکھے۔چانسلرمرکل کی جماعت کوساٹھ سال اوراس ریاست میں شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے جواس کا گڑھ سمجھی جاتی تھی۔جرمنی کے زیادہ تر جوہری پلانٹ اسی ریاست میں ہیں۔جاپان کے جوہری پلانٹ سے تابکاری کے اخراج نے گرین پارٹی کی فتح میں اہم کردار ادا کیا جس کا منشور ہے کہ وہ ملک سے جوہری ایندھن کا خاتمہ کر دے گی چاہے وہ کسی بھی مقصد کے لیے استعمال ہورہا ہو۔حالانکہ جرمنی یورپ کی سب سے بڑی معیشت ہے اوراس کی بجلی کا ایک تہائی حصہ جوہری ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔

دوسری طرف ہیلری کلنٹن کا کہنا ہے کہ جاپان میں ہونے والے واقعات نے دنیا کوسوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ ایٹمی ذرائع سے بجلی پیدا کرنے کے بارے میں ازسرِنوغور کرے۔ہیلری کے بقول جاپان کے ایٹمی بحران نے بہت سے سوالات کوجنم دیا ہے جن میں جوہری توانائی سے منسلک خطرات فوری توجہ طلب ہیں۔امریکہ اپنی بجلی کا بیس فیصد جوہری ذرائع سے حاصل کرتا ہے۔اسی پس منظر میں چین نے جوہری توانائی کے آئندہ تمام منصوبے منجمد کرنے کا اعلان کیا ہے۔اسرائیل کے وزیراعظم نے اپنے ملک میں پہلے ایٹمی بجلی گھر کے منصوبے کومنسوخ کرنے کا اعلان کیا ہے۔حالانکہ اسرائیل ایٹم بم بنا چکا

ہے اور جوہری معاملات کے متعلق وہاں کافی تحقیق ہو رہی ہے۔

فوکوشیما کے جوہری پلانٹ سے تابکاری کا اخراج یہاں کے معاشرے اور معیشت پر کیا اثرات مرتب کرے گا، یہ ایک اہم موضوع ہے لیکن اس پر فی الحال کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ اس ہولناک تباہی کے دوران جاپانی قوم نے مثالی نظم وضبط کا مظاہرہ کیا ہے۔ متاثرہ علاقوں سے ایک بھی چوری یا قانون شکنی کی خبر سامنے نہیں آئی۔ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ قطار میں کھڑے کھانا لینے، ٹیلی فون کرنے اور امداد کے حصول کے لیے اپنی باری کے منتظر نظر آئے۔ دھکم پیل تو بہت دور کی بات ہے ذرا سا شور تک سنائی نہیں دیا۔ اس مشکل وقت میں گھری جاپانی قوم کے کردار کا یہ روشن پہلو صرف ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے۔

جوہری توانائی کا مستقبل

تین ماہ قبل سونامی کے نتیجے میں شروع ہونے والے ایٹمی بحران نے تمام دنیا پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔ جاپان کے فوکوشیما ایٹمی پلانٹ کے اثرات تو صرف بیس کلومیٹر تک محدود رہے ہیں لیکن نفسیاتی طور پر اس نے پوری دنیا کو متاثر کیا ہے اور جوہری توانائی کے مستقبل پر ایک سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ اسی متعلق ایک منظر سپین میں بھی نظر آیا جب اس سال کا انٹرنیشنل کا تالا نیا پرائز جاپانی مصنف موراکھامی کو دیا گیا۔ انٹرنیشنل کا تالا نیا پرائز کی حیثیت قریب قریب وہی ہے جو کہ انگریزی ادب میں بکرّ ز پرائز کی ہے۔ گزشتہ دنوں ایوارڈ دینے کی تقریب بارسلونا میں منعقد ہوئی تو عالمی میڈیا نے اسے ایک منفرد تقریب قرار دیا۔ اس انفرادیت کی وجہ موراکھای کی ایوارڈ وصول کرنے کی تقریر تھی۔ موراکھامی جاپان میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں میں سے ایک ہیں۔ غالباً وہ موجودہ دور کے واحد جاپانی مصنف ہیں جن کی کتابوں کے تراجم 34 زبانوں میں ہو چکے ہیں اور دنیائے ادب کے کم وبیش تمام اہم ایوارڈز انہیں مل چکے ہیں۔ ایوارڈ کی وصولی کے موقعوں پر عام طور پر روایتی تقاریر کی ہی توقع کی جاتی ہے لیکن بارسلونا کی تقریب میں انہوں نے جوہری توانائی کو اپنا موضوع بناتے ہوئے جاپانی حکومت کی ایٹمی ذرائع سے توانائی حاصل کرنے کی پالیسی کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔

ان کا کہنا تھا کہ جاپانی قوم پہلے ہی ایٹمی بمباری کا شکار ہو چکی ہے اس لیے اسے مستقل طور پر ایٹمی پروگرام کی ہر صورت مخالفت کرنی چاہیے چاہے وہ کسی بھی مقصد کے

لیے ہو۔فو کوشیما کے ایٹمی بجلی گھر میں ہونے والی تباہی اوراس کے اثرات پر گفتگو کرتے ہوئے اسے دوسری جنگ عظیم کے بعد ہونے والا سب سے بڑا ایٹمی حادثہ قرار دیا۔ یہاں آپ کو جاپانی معاشرے کا ایک دلچسپ پہلو بتا تا چلوں کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران ہونے والی ایٹمی بمباری کی تباہ کاریوں کا تذکرہ تو یہاں جگہ جگہ ہوتا ہے لیکن حیران کن طور پراس تذکرے میں امریکہ کا نام لینے سے گریز کیا جاتا ہے۔ سچ پوچھیں تو بالکل ایسے ہی جیسے ہمارے ہاں گھریلو عورتیں اپنے خاوند کا نام لینے سے شرماتی ہیں۔ مورا کھامی نے بھی یہ شکوہ تو ضرور کیا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جن لوگوں نے بھی جوہری پروگرام کی مخالفت کی انہیں حکومت نے کونے میں لگا دیا لیکن اپنی تقریر میں انہوں نے بھی امریکہ کا نام لینے سے اجتناب ہی کیا۔ چند برس قبل عطاء الحق قاسمی ایک ادبی وفد کے ہمراہ جاپان آئے تو اس موضوع پر ٹوکیو یونیورسٹی کے پروفیسروں سے ان کا بڑا دلچسپ مکالمہ ہوا تھا۔شعبہ اردو کے استاد ہیرو جی کتاؤ کا کی نگرانی میں اردو پڑھنے والے جاپانی طلباء نے ایٹم بم کی تباہ کاریوں اوراثرات پر ایک ڈرامہ پاکستانی وفد کے لیے پیش کیا۔ ڈرامے کے اختتام پر جب قاسمی صاحب کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تو انہوں نے منتظمین کو مخاطب کر کے بڑے خوبصورت انداز میں کہا کہ بہتر ہوگا اگر آپ یہ ڈرامہ امریکہ جا کر بھی پیش کریں جو کہ اس تباہی کا اصل محرک اور ذمہ دار تھا۔

فو کوشیما جوہری بحران کے بعد یہاں جرمنی اور دیگر یورپ کی طرح جوہری توانائی کے حصول کے خلاف مظاہرے تو نہیں ہوئے ہیں جس کی وجہ شاید جاپانی قوم کی نفسیات اور تربیت بھی ہے۔ یہاں بچپن سے ہی سکول اور گھر میں برداشت اور صبر کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔شکوہ شکایت کرنا تہذیب کے خلاف سمجھا جاتا ہے اور تنقید کرنا یہاں کا رواج نہیں ہے۔اس لیے احتجاجی مظاہروں کی روایت اس ملک میں نہیں ملتی لیکن پھر بھی حکومت اس موضوع پر انتہائی دباؤ میں ہے۔اس وقت ملک کے مجموعی طور پر 54 میں سے 30 جوہری پلانٹ حفاظتی نقطہ نظر سے بند کر دیے گئے ہیں اوران کا معائینہ کیا جارہا ہے۔

جاپانی وزیراعظم نے موجودہ دہائی کے خاتمے سے پہلے متبادل ذرائع سے حاصل ہونے والی بجلی کی مقدار کا ہدف 20% فی صد کر دیا ہے جو کہ پہلے دس فیصد رکھا گیا تھا۔اس میں شمسی توانائی اور پن بجلی کے علاوہ ایسے ذرائع پر بھی کام ہو رہا ہے جو کہ اب تک دنیا میں زیر استعمال نہیں ہیں۔چاند تک سے بجلی لانے کی تھیوری پر بحث ہو رہی ہے۔جوہری بجلی بلاشبہ دیگر ذرائع کی نسبت سستی ہے لیکن بہر حال خطرناک ہے۔اس موضوع پر جرمنی کے سابق وزیر خارجہ فشر کا تازہ مضمون بھی چشم کشا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ہر ایٹمی بجلی گھر میں ایک ایٹم بم جتنی تباہی لانے کی صلاحیت اور امکان موجود ہے۔ان کی اسی فکر نے جرمنی میں حال ہی میں ہونے والے انتخابات میں ان کی گرین پارٹی کو فتح سے ہمکنار کیا اور حکمران جماعت کو غیر متوقع شکست سے دوچار کر کے اسے ایٹمی بجلی گھروں کے مکمل خاتمے کا اعلان کرنے پر مجبور کر دیا۔سوچنے والی بات ہے کہ اگر کہیں جنگ چھڑ جائے اور دشمن ملک ایٹمی بجلی گھر پر بمباری کر دے تو پھر کیا ہوگا؟ایسے بہت سارے سنجیدہ سوالات ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنے والے دنوں میں جوہری توانائی کا کردار دنیا سے اگر ختم نہ بھی ہوا تو محدود ضرور ہو جائے گا۔

گزشتہ دنوں جاپان میں مقیم میرے دوست ملک اللہ یار خان سونامی اور ایٹمی بحران کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان گئے تو میانوالی کے قریب اپنے گاؤں والوں کے ساتھ بھی ان کی اس موضوع پر گفتگو ہوئی۔ملک اللہ یار خان پی ایچ ڈی کرنے جاپان آئے اور پھر تعلیم مکمل کرنے کے بعد یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔گاؤں کے دوستوں کو ملک صاحب فوکوشیما پلانٹ کی ممکنہ تباہ کاریوں اور ایٹمی پھیلاؤ کے اثرات پر اپنے خیالات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتانے لگے کہ حکومت نے جو نیا چشمہ نیوکلیئر پاور پلانٹ یہاں لگایا ہے یہ بھی خطرے کی گھنٹی ہے اور ہم لوگوں کو محتاط رہنا چاہیے کیونکہ اگر کبھی کوئی حادثہ پیش آیا تو قربت کی بنیاد پر ہمارے گاؤں پر اس کے بہت تباہ کن اثرات ہوں گے۔اس پر ان کے دوست بتانے لگے کہ چشمہ ایٹمی پاور پلانٹ کے قریب سے لوگوں میں کینسر کا

تناسب ملک کے باقی حصوں سے زیادہ ہے اس کے علاوہ سوال و جواب ہونے لگے اور کچھ لوگوں نے جانوروں اور متاثرہ پرندوں کے بارے میں گردش کرنے والی کہانیاں بیان کیں۔ اسی دوران ایک دیہاتی نے ایٹمی پلانٹ کے بارے میں بڑے قطعی انداز میں کہا کہ ''میں نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا، کہ ہے تو یہ کوئی غلط چیز ہی! تبھی تو انہوں نے میانوالی میں بنائی ہے۔'' خدا پاکستان کے ہر کونے کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور چشمہ پاور پلانٹ کے گرد رہنے والے لوگوں کو اس بدقسمتی کا سامنا نہ کرنا پڑے جس کا سامنا فوکوشیما ایٹمی پلانٹ کے ارد گرد رہنے والے لوگوں کو کرنا پڑا ہے۔

صدر پاکستان کا دورۂ جاپان

پاکستان اور جاپان کے سفارتی تعلقات 1952ء میں قائم ہوئے تھے۔ اپنی ابتدا سے لے کر آج تک ان دونوں ممالک کے باہمی تعلقات بحیثیت مجموعی انتہائی خوشگوار رہے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان تعلقات میں بہتری آ رہی ہے۔ صدر آصف علی زرداری کا حالیہ تین روزہ دورۂ جاپان بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ یوں تو پاکستانی صدر اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ جاپان کا دورہ کر چکے ہیں لیکن اس مرتبہ ان کی آمد کی اہمیت اس لحاظ سے زیادہ تھی کہ جاپان میں موجودہ حکمران جماعت کے اقتدار میں آنے کے بعد پاکستانی سربراہِ مملکت سے ان کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ یہاں آپ کو یہ بتاتے چلیں کہ موجودہ حکمران جماعت نے الیکشن جیت کر لبرل ڈیموکریٹک پارٹی کے ساٹھ سالہ طویل دورِ اقتدار کا خاتمہ کیا ہے۔ موجودہ جاپانی وزیراعظم کو اپنی ذمہ داریاں سنبھالے ابھی ایک سال بھی مکمل نہیں ہوا۔ اس تناظر میں یہ دورہ دونوں ملکوں کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔

اگر ہم صدرِ پاکستان کے مختصر وفد اور ان کی جاپان میں مصروفیات پر طائرانہ نظر ڈالیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اس دورے کے بنیادی اہداف معاشی نوعیت کے تھے۔ صدر کا وفد ان کے ہمراہ نہیں آیا بلکہ ان سے دو دن پہلے PIA کی عام پرواز سے جاپان پہنچا تھا جبکہ صدر خود پاک فضائیہ کے جیٹ طیارے میں جاپان پہنچے۔

وفد کے ارکان میں مخدوم شہاب الدین، سلیم مانڈوی والا اور میر ہزار خان بجارانی کے علاوہ فرحت اللہ بابر شامل تھے۔ سیکرٹری خارجہ سلمان بشیر بھی وفد کا حصہ بنے۔

یوں تو جاپانی وزیر اعظم کے علاوہ صدر زرداری کی جاپان کے شہنشاہ کی ہیٹو سے بھی ملاقات ہوئی جو کہ عموماً کم ہی لوگوں سے ملتے ہیں لیکن ان کا زیادہ تر وقت کاروباری و معاشی امور سے متعلق لوگوں کے درمیان گزرا جن میں نمایاں جاپان کے معروف کاروباری ادارے ماروبینی کے چیئرمین جو کہ پاکستان جاپان بزنس کارپوریشن کمیٹی کے چیئرمین بھی ہیں۔ یاماہا کے چیئرمین جنہوں نے اس ملاقات کے بعد پاکستان میں 150 ملین ڈالر مزید سرمایہ کاری کرنے کا اعلان کیا۔ جاپان بنک کے سربراہ سے بھی ملاقات ہوئی جس میں تین ارب ڈالر کا قرض نرم شرائط پر بات چیت کا موضوع رہا۔ یہ قرض توانائی کے حصول میں استعمال ہونے والی مشینری، ٹربائنوں، جنریٹرز اور ٹرانسمیشن لائنیں بچھانے کے لیے استعمال ہوگا۔ جاپانی وزیر تجارت سے ہونے والی ملاقات میں صدر زرداری نے 137 پاکستانی اشیاء کی جاپان درآمد پر ڈیوٹی میں کمی کے لیے کہا جن میں ٹیکسٹائل سرجری آلات اور چمڑے کی مصنوعات وغیرہ شامل ہیں۔ بیس سال کی پابندی کے بعد جاپان نے حال ہی میں پاکستانی آم امپورٹ کرنے کی اجازت دے دی ہے۔

صدر زرداری نے جاپانی سرمایہ کاروں کے لیے دو ہزار ایکٹر پر مشتمل ایک خصوصی صنعتی زون بھی قائم کرنے کا اعلان کیا۔ اسی موقع پر جاپانی سرمایہ کاروں کو پاکستان میں نیفٹا ریفائنری کے قیام میں سرمایہ کاری کی دعوت دی۔ نیفٹا پٹرولیم کی ایک خام شکل ہے۔ جاپان پاکستان سے نیفٹا درآمد کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے۔ اس وقت وہ نیفٹا خریدنے کے بعد سنگاپور اور جنوبی کوریا میں واقع ریفائنری کی مدد سے اسے قابل استعمال بناتا ہے جبکہ پاکستان میں ریفائنری کے قیام سے دونوں ملکوں کو سہولت اور فائدہ ہوگا۔ ہمارے صوبہ سندھ میں نیفٹا کے وسیع ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔

پاکستان میں انفراسٹرکچر کی بحالی کے لیے جاپان نے خصوصی طور پر 15 ارب روپے کی امداد کا بھی اعلان کیا ہے۔ یہ خصوصی امداد پاکستان کی سالانہ امدادی رقم کے علاوہ ہے۔ صدر آصف علی زرداری کی جاپانی وزیر اعظم سے ملاقات کے بعد جو مشترکہ اعلامیہ

جاری کیا گیا اس کا ایک اہم نقطہ شمالی کوریا کے متعلق تھا جسے بہت تفصیل سے بیان کیا گیا لیکن پاکستانی میڈیا کی توجہ سے محروم رہا۔ شمالی کوریا اور جاپان روایتی حریف ہیں اور دونوں کے تعلقات بالکل ویسے ہی ہیں جیسے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کا خطرہ ہمیشہ رہتا ہے اور سفارتی تعلقات کشیدگی اور بداعتمادی پر مبنی ہیں۔ جاپان شمالی کوریا کو اپنا دشمن نمبر ایک خیال کرتا ہے۔ کوریا گزشتہ صدی کا تقریباً نصف حصہ جاپان کی نوآبادی رہا ہے۔ اسی لیے گزشتہ برس جب ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے یہ انکشاف کیا کہ کہوٹہ لیبارٹریز میں شمالی کورین ایٹمی سائنسدان ان کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں تو پاکستان میں اس خبر کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا گیا لیکن جاپان میں یہ بیان تمام اخبارات کی شہ سرخی بنا اور ٹی وی چینلز پر بھی اس کا بہت چرچا رہا۔ پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کے حوالے سے تو جاپانیوں کے تحفظات اس لیے قابلِ فہم ہیں کہ وہ خود ایٹم بم کا شکار ہو چکے ہیں اس لیے پوری دنیا سے ایٹمی ہتھیاروں کا خاتمہ چاہتے ہیں اور ان کے تحفظات صرف ہمارے ایٹمی اثاثوں کے متعلق مخصوص نہیں ہیں لیکن ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے شمالی کوریا سے ایٹمی اشتراک سے متعلق بیان پر پاکستان کو سفارتی سطح پر نقصان پہنچا ہے اور اس کے جاپان کے ساتھ تعلقات پر بھی اس کا منفی اثر بہر حال پڑا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا ایٹمی اسلحے کے پھیلاؤ سے متعلق مبینہ نیٹ ورک پاکستانیوں کی غالب اکثریت کے نزدیک ایک افسانہ ہے لیکن پاکستان سے باہر اس کو ایک حقیقت سمجھا جاتا ہے۔ خصوصاً یہاں کے میڈیا میں اس نیٹ ورک کا ذکر اکثر آتا رہتا ہے اور اس کے وجود پر سب متفق ہیں۔ اس پس منظر میں ہمارے صدر کا یہاں آ کر یہ اعلان کرنا کہ ''پاکستان کی یہ خواہش ہے کہ کوریا کا خطہ ایٹمی ہتھیاروں سے پاک ہو جائے'' یہاں کے میڈیا کی خصوصی توجہ کا باعث بنا ہے۔ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے بعد صدر زرداری کا یہ دوسرا دورہ تھا۔ اس سے پہلے وہ 2009 میں جاپان آئے تھے جب فرینڈز آف پاکستان کے وزراء کا ایک اہم اجلاس

ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی پاکستان کے لیے ڈونرز کانفرنس ہوئی جس میں 45 ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ ڈونرز کانفرنس میں جاپان کے علاوہ ورلڈ بنک بھی میزبان تھے۔ اس موقع پر پاکستان کے لیے سات ارب ڈالر کی امداد کا اعلان ہوا تھا لیکن پتا نہیں اعلانات کے وہ پیسے کہاں ہیں؟ کم از کم پاکستانی خزانے میں تو نہیں پہنچے۔

مستقبل کی موٹر گاڑیاں

گزشتہ چند برسوں کے دوران پاکستان میں جو بے شمار تبدیلیاں آئی ہیں ان میں سے ایک تبدیلی موٹر گاڑیوں میں ڈیزل اور پیٹرول کی جگہ سی این جی کا بطور ایندھن بکثرت استعمال ہے۔ یہ پاکستان کا منفرد اعزاز بھی ہے کہ وہ سی این جی استعمال کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا ملک بن گیا ہے جب کہ دو برس پہلے تک ارجنٹینا کے پاس یہ اعزاز تھا۔ ہمارے ملک میں سی این جی کی اس قدر مقبولیت کی بنیادی وجہ اس کا کم نرخوں پر دستیاب ہونا ہے۔ جاپان میں بھی سی این جی گاڑیاں موجود ہیں، گو کہ اتنی مقبول نہیں ہیں اور زیادہ تر ٹیکسی یا سرکاری طور پر استعمال ہوتی ہیں، لیکن یہاں سی این جی گاڑیوں کے استعمال کی وجہ سستا ایندھن نہیں ہے بلکہ ماحولیاتی آلودگی کا عدم پھیلاؤ ہے۔ قدرتی ماحول کے تحفظ کو یہاں بہت ہی سنجیدگی سے لیا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں یورپ اور امریکہ کی طرح یہاں بھی یہ سوچ پائی جاتی ہے کہ تیل پر انحصار کم کیا جانا چاہیے کیونکہ جس رفتار سے دنیا میں تیل استعمال ہو رہا ہے اس سے تیل کے موجودہ ذخائر تیزی سے ختم ہو رہے ہیں جس کا لازمی نتیجہ عالمی منڈی میں تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

اس صورتِ حال میں Hybrid انجن گاڑیوں کی مانگ میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ ہائیبرڈ گاڑی دیکھنے میں تو بالکل عام کار کی طرح ہی ہوتی ہے لیکن اس کا انجن صرف پیٹرول سے ہی نہیں چلتا بلکہ بجلی یا ایتھانول کے باہمی امتزاج سے چلتا ہے۔

اس گاڑی کی مقبول مثال ٹویوٹا کمپنی کی بنی ہوئی Prius کار ہے جو کہ اب تک

بیس لاکھ سے زیادہ کی تعداد میں فروخت ہو چکی ہے۔ گزشتہ کئی برس سے جاپان میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کار بھی Prius ہی ہے جس کے تین لاکھ سے زیادہ یونٹ گزشتہ سال سیل ہوئے اور اس نے ایک سال کے دوران زیادہ سے زیادہ فروخت کا ریکارڈ توڑ دیا جو کہ بیس سال پہلے ٹیوٹا کرولا نے قائم کیا تھا۔ یہ گاڑی چالیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار تک پٹرول استعمال نہیں کرتی اور اگر اس رفتار سے اوپر جائیں تو پھر بیٹری کی توانائی کے ساتھ ساتھ پٹرول بھی استعمال کرنے لگتی ہے۔ اس کی بیٹری کو بجلی سے چارج نہیں کرنا پڑتا بلکہ خود بخود عام گاڑیوں کی طرح چارج ہو جاتی ہے۔ صرف جاپان ہی نہیں امریکہ میں بھی اس گاڑی کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ڈیلیوری کے لیے چھ ماہ تک کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ماحولیاتی آلودگی سے آگاہی کے متعلق کام کرنے والے لوگ اس کار کو ٹریڈ مارک کی طرح استعمال کر رہے ہیں جن میں سابق امریکی صدارتی امیدوار الگور جیسے لوگ بھی ہیں۔ الگور کو ماحولیاتی تحفظ کے لیے کام کرنے پر نوبل انعام بھی مل چکا ہے۔

امریکہ میں ہائبرڈ کاروں کی بڑھتی ہوئی ڈیمانڈ کو دیکھتے ہوئے ٹیوٹا کمپنی نے امریکہ کی Tesla کمپنی کے ساتھ مل کر الیکٹرک Rav-4 جیپ بنائی ہے جسے اگلے سال فروخت کے لیے مارکیٹ میں پیش کیا جائے گا۔ Tesla بنیادی طور پر ایک الیکٹرک کمپنی ہے۔ ٹیوٹا جیسی بڑی کمپنی کا ایک الیکٹرک کمپنی کے ساتھ اس نوعیت کے اشتراک کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہائبرڈ گاڑیوں میں استعمال ہونے والی بیٹریوں کی قیمت گاڑی کی کل مالیت کا تقریباً نصف ہوتی ہے اور بیٹری ہی ایسی گاڑیوں کا امتیازی جزو ہے گزشتہ دنوں لاس اینجلس میں اس جیپ کی تقریب رونمائی سب لوگوں کے لیے حیرانی کا باعث تھی کیونکہ یوں تو ٹیوٹا نے 1997ء میں ہی ہائبرڈ کار مارکیٹ میں پیش کر دی تھی لیکن Rav-4 دنیا میں پہلی جیپ ہوگی جو کہ بجلی سے چلے گی۔

دوسری طرف مٹسوبشی اور فرانسیسی کار ساز کمپنی سٹرون اور پیجوٹ کے اشتراک سے بننے والی الیکٹرک کار بھی اس ہفتے فروخت کے لیے پیش کر دی گئی ہے۔ اس الیکٹرک

کار کا بنیادی ہدف یورپی مارکیٹ ہے جس کے لیے جاپان میں دس ہزار گاڑیاں اس سال تیار ہوں گی۔ کار کی افتتاحی تقریب سے خطاب میں مٹسوبشی کمپنی کے صدر مسا کو نے کہا کہ ''الیکٹرک کاروں کے متعلق کاروباری ماحول ہماری توقعات سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ تبدیل ہوا ہے۔'' یہ اعتراف بھی ہے اور مستقبل میں چلنے والی موٹر گاڑیوں کی نشاندہی بھی ہے۔ اس صورتِ حال میں بھلا ہنڈا کمپنی کسی سے کیوں پیچھے رہتی۔ اس نے توشیبا کمپنی کے ساتھ اشتراک کیا ہے اور اپنی الیکٹرک کار کے آزمائشی مراحل مکمل ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور بہت جلد ہمیں ہنڈا کی الیکٹرک کار بھی سڑکوں پر نظر آئے گی جس کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ایک بار مکمل چارج کرنے پر 160 کلو میٹر تک کی مسافت طے کرسکتی ہے جو کہ اب تک منظر عام پر آنے والی تمام الیکٹرک کاروں سے زیادہ ہے۔

اس دہائی کو الیکٹرک کاروں کی صبح سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ اسی سلسلے میں نسان کمپنی نے Leaf کے نام سے اپنی پہلی الیکٹرک کار بازار میں فروخت کے لیے پیش کردی ہے جس کے بارے میں مبصرین کا خیال ہے کہ وہ ٹیوٹا کا مقابلہ کرے گی۔ اس گاڑی کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ایندھن کا استعمال سب سے کم ہے۔ ویسے تو مذکورہ بالا تمام گاڑیوں میں ایندھن کا خرچ عام پیٹرول سے چلنے والی کار کے مقابلے میں چار گنا کم ہے اور ماحول کے تحفظ کے حوالے سے تو یہ بہتر انتخاب ہیں ہی کیونکہ دھواں بہت ہی کم دیتی ہیں بلکہ بہت جلد ٹیوٹا اپنی نئی الیکٹرک کار پیش کرنے والا ہے جس میں دھوئیں کا اخراج بالکل بھی نہیں ہوگا۔ اس کار کا نام ہی Zero Emission یعنی ''صفر اخراج'' رکھا گیا ہے۔ ماحول کے حوالے سے ان گاڑیوں کی دوسری خوبی شور کا نہ ہونا ہے۔ الیکٹرک یا ہائبرڈ گاڑی کے پاس کھڑے ہوں تو پتا ہی نہیں چلتا کہ انجن سٹارٹ ہے یا کہ بند ہے۔ ویسے تو شمسی توانائی سے چلنے والی گاڑیوں پر بھی تجربات ہورہے ہیں لیکن تجارتی پیمانے پر ان گاڑیوں کی پیداوار میں ابھی وقت لگے گا۔ ایک بات تو بہرحال طے ہے کہ اب ڈیزل اور پٹرول سے چلنے والی کاریں کچھ سالوں میں ایسے ماضی کا قصّہ بن جائیں گی جیسے کوئلے سے چلنے والے سٹیم انجن اور ان کی جگہ ہائبرڈ، الیکٹرک اور پروٹو ٹائپ موٹر گاڑیاں لے لیں گی۔

کوئلے سے توانائی کا حصول

پاکستان کچھ عرصے سے توانائی کے شدید بحران کا شکار ہے۔اس بحران کی وجوہات اوراثرات پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ہزاروں گھنٹے نیوز چینلز اس پر بحث کر چکے ہیں اس لیے ہم وجوہات کی بجائے اس بحران کے ممکنہ حل کے متعلق بات کریں گے۔ ہمارا مسئلہ چونکہ صرف بجلی کا حصول نہیں ہے بلکہ سستی بجلی کا حصول ہے، ورنہ تو رینٹل پاور پلانٹ سے یہ بحران فوری طور پر حل کیا جا سکتا ہے لیکن ان غیر ملکی پاور پلانٹ کی فراہم کردہ بجلی کے نرخ ایک تو عام صارف کی قوت خرید اور برداشت سے بالا ہیں دوسرا اس عمل سے بہت سارا ملکی سرمایہ بیرونِ ملک منتقل ہو جائے گا۔بجلی کی پیداوار کا ایک موثر اور قابل عمل ذریعہ کوئلہ ہے جس پر ذرائع ابلاغ میں بہت کم بات ہوئی ہے اور اگر کہیں بات ہوتی بھی ہے تو بس سرسری انداز میں۔ پاکستان اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ یہاں کوئلے کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ بعض ماہرین کے نزدیک تو تھر میں دریافت ہونے والا کوئلے کا ذخیرہ مقدار کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔

جاپان میں کوئلے کو بطور ایندھن استعمال کر کے بجلی حاصل کرنے کی ٹیکنالوجی اپنی اعلیٰ کارکردگی اور جدّت کی وجہ سے پوری دنیا کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ یہاں کوئلے سے متعلق ہیوی الیکٹرک مشینری بنانے والی کمپنیاں اس وقت پوری دنیا میں اپنی مشینری اور مہارت کی ترویج میں مشغول ہیں اور اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہیں کیونکہ جاپان کوئلے سے بجلی بنانے کی مشینری کا اس وقت سب سے بڑا برآمد کنندہ ہے۔ کوئلے سے بجلی کا

حصول اس وجہ سے بھی پوری دنیا کی دلچسپی کا موضوع بنا ہوا ہے کہ کم خرچ ہونے کے علاوہ اس سے ماحولیاتی آلودگی کو کم کیا جا سکتا ہے۔ ماحول کو آلودہ کرنے میں سب سے خطرناک چیز گرین ہاؤس گیسیں (Green House Gasses) ہیں۔ یہ گیسیں اتنی خطرناک ہیں کہ ان کی وجہ سے زمین کی بیرونی سطح جسے اوزون (Ozone) کہا جاتا ہے، اس میں سوراخ ہو چکا ہے۔ اوزون سورج کی شعاعیں براہِ راست زمین تک آنے سے روکتی ہے اور ایک فلٹر کا کام کرتی ہے۔ کوئلے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سے سب سے کم گرین ہاؤس گیسوں کا اخراج ہوتا ہے۔ یہاں اس تفصیل کی ضرورت اس لیے بھی محسوس ہوئی کہ گزشتہ دنوں ایک نیوز چینل کے معتبر میزبان بتا رہے تھے کہ ہماری حکومت نے اگر فوری طور پر تھر کے کوئلے کو بجلی بنانے کے لیے استعمال نہ کیا تو یہ کوئلہ اس لیے ناکارہ ہو جائے گا کہ آنے والے دنوں میں کوئلے سے بجلی بنانے کا طریقہ ویسے ہی ختم ہونے والا ہے کیونکہ اس سے ماحولیاتی آلودگی پھیلتی ہے۔

یہ بات حقائق کے بالکل برعکس اور گمراہ کن ہے۔ انٹرنیشنل انرجی ایجنسی کے شائع کردہ اعداد و شمار کے مطابق 2007 میں دنیا میں ایک ارب میگاواٹ بجلی کوئلے سے پیدا ہو رہی تھی اور 2030 میں یہ مقدار 3 ارب میگاواٹ تک پہنچ جائے گی۔ شمسی توانائی اور نیوکلیئر ذرائع سے حاصل ہونے والی بجلی کی مجموعی مقدار اس وقت کوئلے سے حاصل ہونے والی بجلی سے تین گنا کم ہے جبکہ 2030 میں شمسی توانائی اور نیوکلیئر ذرائع سے حاصل ہونے والی بجلی کی مجموعی مقدار سے چار گنا زیادہ بجلی کوئلے سے حاصل کیے جانے کی توقع ہے۔

مذکورہ ٹی وی میزبان کی بات سن کر مجھے شیخ صاحب یاد آ گئے جو بڑی کامیاب کاروباری شخصیت ہیں۔ ان کا بڑے عرصے سے ایک درویش سے ملنا جلنا تھا۔ شیخ صاحب جب بھی درویش سے ملتے تو دین داری کے متعلق بات کرتے لیکن درویش جواب میں ہمیشہ کاروبار کے متعلق بات کرتا۔ ایک دن شیخ صاحب چڑ گئے اور کہنے لگے کہ میں کاروباری آدمی ہوں اس کے باوجود جب بھی آپ سے ملتا ہوں

دین کے متعلق بات کرتا ہوں اور آپ درویش بنے پھرتے ہیں لیکن ہمیشہ میرے ساتھ کاروبار کے متعلق ہی بات کرتے ہیں۔اس پر درویش کہنے لگا کہ لوگ عام طور پر اسی موضوع پر بات کرنا پسند کرتے ہیں جس کے متعلق انہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا ہے۔

ذکر ہے کوئلے سے بجلی پیدا کرنے کے بڑھتے ہوئے عالمی رجحان کا جس سے جاپانی کمپنیاں بھی فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش میں ہیں جیسے ہٹاچی کمپنی نے اس وقت اپنی ساری توجہ کوئلے سے چلنے والے بجلی گھروں کے سٹیم ٹربائین اور بوائلر بنانے پر مرکوز کر رکھی ہے جو کم دھواں چھوڑتے ہیں اور زیادہ بجلی پیدا کرتے ہیں۔ ہٹاچی کمپنی اس جدید ٹیکنالوجی کو بیرون ملک متعارف کروانے میں مشغول ہے تو دوسری طرف توشیبا کارپوریشن بھارت میں جنوری 2011 سے کوئلے سے چلنے والے جدید بجلی گھروں اور سٹیم ٹربائنوں کی پیداوار شروع کر چکی ہے۔اسی طرح J-Power نامی کمپنی نے چین میں 13 لاکھ میگاواٹ بجلی کوئلے سے پیدا کرنے کا منصوبہ شروع کر دیا ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ اس وقت دنیا میں دریافت شدہ کوئلہ آئندہ 1220 سال کے لیے پوری دنیا کو توانائی فراہم کرنے کے لیے ہے۔ایشیا کے ترقی پذیر ممالک خصوصاً پاکستان اس حوالے سے خوش قسمت ہے کہ کوئلے کے بیشتر ذخائر یہاں ہی دریافت ہوئے ہیں۔دنیا میں بجلی کی پیداوار کے لیے کوئلے کے بڑھتے ہوئے استعمال کی وجہ اِس کا سستا اور وافر دستیاب ہونا ہی نہیں بلکہ ماحول کا تحفظ بھی ہے اسی وجہ سے جاپانی حکومت کوئلے سے چلنے والے بجلی گھر بنانے والی کمپنیوں کو مالی امداد دینے کے علاوہ کاروبار بڑھانے کے لیے کئی دیگر مراعات دے رہی ہے۔امید ہے کہ پاکستان کے اربابِ اقتدار جلد کوئلے سے سستی بجلی بنانے کے لیے غور و فکر کے علاوہ عملی اقدامات بھی کریں گے۔خام کوئلہ ملک کے اندر وافر مقدار میں موجود ہونے کی بناء پر یہ ہمارا خود انحصاری کی طرف ایک اہم قدم ہوگا۔

تھری۔ڈی ٹیلی ویژن

عکس کی دنیا میں ایک انقلاب آنے والا ہے۔موجودہ دور کی ٹی وی سکرینیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ماضی کا قصّہ بن کر رہ جائیں گی اور یہ سالوں کی نہیں بس دنوں اور مہینوں کی بات ہے کیونکہ جاپان کی توشیبا کمپنی اس سال کے خاتمے سے پہلے تھری۔ڈی ٹی وی فروخت کے لیے بازار میں پیش کرنے والی ہے۔تھری ڈی عکس کی خاص بات یہ ہے کہ ناظرین کو سکرین پر دکھائے جانے والے مناظر بالکل اسی طرح نظر آتے ہیں جیسے وہ اپنے اردگرد کا منظر دیکھتے ہیں۔تھری ڈی عکس کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ناظرین خود کو منظر کا حصہ محسوس کرتے ہیں اور سکرین پر دکھائے جانے والے مناظر عام تصویر کے مقابلے میں زیادہ حقیقی محسوس ہوتے ہیں۔ٹی وی ناظرین کے لیے یہ تبدیلی اتنی ہی بڑی ہوگی جیسے ماضی میں بلیک اینڈ وائٹ کے بعد رنگین ٹیلی ویژن آیا تھا۔اب تک تھری ڈی فلمیں یا تصویریں دیکھنے کے لیے خصوصی عینک استعمال کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن توشیبا وہ پہلی کمپنی ہوگی جس کے ٹی وی سیٹ پر ناظرین بغیر کسی عینک کے تھری ڈی مناظر Naked Eye سے دیکھ سکیں گے۔مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے Naked Eye کا اردو ترجمہ ننگی آنکھ کیا ہے جو کہ خاصا واہیات محسوس ہوتا ہے اس لیے ہم اس کو انگریزی میں ہی لکھ رہے ہیں۔

توشیبا کمپنی کا یہ ٹی وی سیٹ تین مختلف سائز کی سکرینوں اور ماڈلز میں دستیاب ہوگا۔امید ہے کہ یہ اس سال سردیوں کی چھٹیوں میں فروخت کے لیے پیش کر دیا جائے گا۔تاہم ابھی تک اس ٹی وی کی قیمت کا اعلان نہیں کیا گیا ہے لیکن امکان یہی ہے کہ اس کی

قیمت عام آدمی کی قوت خرید کے اندر ہی ہوگی۔

توشیبا کمپنی نے عکس کا ایک ایسا نظام ایجاد کیا ہے جو کہ مختلف زاویوں پر اس انداز سے روشنی کی کرنیں بکھیرتا ہے کہ دیکھنے والے شخص کو سکرین پر عکس تھری ڈی یعنی تین جہتی نظر آتا ہے جبکہ اب تک دنیا میں استعمال ہونے والی ٹی وی اور سینما گھروں کی سکرینیں فقط 2-D منظر ہی دکھا سکتی ہیں۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ مذکورہ ٹی وی سیٹ کو کسی بھی زاویے سے دیکھیں اس کا عکس خراب نہیں ہوگا اور سب سے اہم بات یہ کہ اس سے آنکھوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا باوجود اس کے کہ بغیر خصوصی چشمے کے ہی اس پر دکھائے جانے والے مناظر اور تصویروں سے لطف اندوز ہوا جا سکے گا۔ یہ دلچسپ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ عام طور پر تھری ڈی عکس سکرین پر دائیں آنکھ اور بائیں آنکھ سے ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔ اگر ہم صرف دائیں آنکھ کھلی رکھیں اور بائیں آنکھ بند کر لیں یا پھر بائیں آنکھ کھلی رکھیں اور دائیں آنکھ بند کر لیں تو یہ دونوں تصویریں یا عکس ایک دوسرے سے قطعی طور پر مختلف دکھائی دیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تھری ڈی فلموں اور تصویروں میں دائیں آنکھ کے لیے علیحدہ عکس بنائے جاتے ہیں اور بائیں آنکھ کے لیے علیحدہ، دائیں آنکھ کے لیے خصوصی طور پر بنایا گیا عکس بائیں آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا اور بائیں آنکھ کے لیے بنانے کے عکس کو فقط اسی آنکھ سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن دونوں آنکھوں سے جب عکس دماغ کے اندر پہنچتے ہیں تو دماغ میں اک نیا عکس بنتا ہے جو کہ تھری ڈی ہوتا ہے۔
ویسے تو اس سال کے آغاز میں پیناسونک کمپنی نے دنیا کا پہلا تھری ڈی ٹی وی بازار میں فروخت کے لیے پیش کیا تھا جس کے بعد کئی دوسری کمپنیاں بھی اس دوڑ میں شامل ہوگئیں اور اسی سال کے دوران بہت سارے ماڈل عوام کو پیش کیے گئے لیکن ان سب کی فروخت مندی کا شکار رہی اور ان کمپنیوں کو کوئی حوصلہ افزا نتائج نہیں ملے کیونکہ ان سب میں یہ بات مشترک تھی کہ ٹی وی دیکھنے کے لیے خصوصی عینک کا استعمال ضروری تھا۔ میرا ذاتی تجربہ بھی یہی ہے کہ جو شخص عینک نہیں لگاتا اسے اگر تھری ڈی سکرین دیکھنے کے لیے

خصوصی عینک لگانا پڑے تو ایک دو گھنٹے کے بعد لازمی طور پر الجھن ہونے لگتی ہے اور پھر یہ الجھن جیسے جیسے سکرین دیکھنے کا دورانیہ بڑھتا ہے ویسے ویسے بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ ایک اہم نقطہ یہ بھی ہے کہ آدمی یہ عینک لگا کر اپنے اردگرد کے ماحول سے کٹ جاتا ہے جو کہ بعض اوقات مصیبت لگتا ہے تو شیبا کی پیشکش اس لحاظ سے منفرد ہے کہ بغیر کسی مخصوص چشمے کے آپ نہ صرف ٹی وی نشریات دیکھ سکیں گے بلکہ DVD پلیئر یا کمپیوٹر منسلک کر کے اپنی پسند کی فلمیں اور تصویریں بھی دیکھ سکیں گے۔

اب تک تو ہم ذکر کر رہے تھے نجی شعبے میں کاروباری بنیاد پر بنائے جانے والے تھری ڈی ٹی وی کے متعلق، جبکہ دوسری جانب نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی اس میدان میں نجی شعبے سے بھی ایک قدم آگے دکھائی دیتا ہے، جس نے اس ہفتے ایک ایسے تھری ڈی ٹی وی کی نمائش کی ہے جس میں تصویر کو چُھوا جا سکتا ہے اور اپنے ہاتھوں سے اس تصویر میں تبدیلیاں بھی کی جا سکتی ہیں۔ تفصیل اس بظاہر دیو مالائی ٹی وی کی کچھ یوں ہے کہ اس کے اندر چھ کیمرے اور ایسے سینسر لگائے گئے ہیں جو کہ ناظرین کی انگلیوں کی حرکت کو نوٹ کرتے ہیں اور جب کوئی شخص سکرین پر ابھری ہوئی تصویروں کو ہاتھ لگاتا ہے تو انگلیوں میں ایسا ارتعاش پیدا ہوتا ہے جس سے سکرین پر نظر آنے والا عکس حقیقی محسوس ہوتا ہے۔ اور مثال کے طور پر اگر کوئی شخص تصویر کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے تو اس ٹی وی سکرین میں لگے وائبریٹر اسے ایسے سراب میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ اسے باقاعدہ اپنے ہاتھ میں کوئی ٹھوس چیز پکڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ میڈیا کے سامنے تقریب رونمائی کے دوران تھری ڈی ٹی وی پر دنیا کا ماڈل دکھایا گیا جسے بعد ازاں ہاتھوں سے کھینچ کر ربڑ کی طرح سکرین کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلا دیا گیا۔ اس طلسماتی محسوس ہونے والی نمائش کے اختتام پر نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے سربراہ ناکامورا نے بتایا کہ اس تھری ڈی ٹی وی کو ویڈیو گیمز کے علاوہ میڈیکل اور انجینئرنگ کے شعبے میں بھی استعمال کیا جا سکے گا۔

مطالعہ کا چلن

کتاب یہاں کی روزمرہ زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔ کسی بھی ٹرین یا بس میں سوار ہو جائیں، ہر دوسرے چوتھے آدمی کے ہاتھ میں کتاب نظر آئے گی۔ بعض دوستوں کا خیال یہ ہے کہ کتاب تو ایک بہانہ ہے اصل میں یہ لوگ آپس میں نظر ملانے سے کتراتے ہیں لیکن اس نقطۂ نظر کی نفی اس بات سے ہو جاتی ہے کہ یہاں شائع ہونے والی ہر کتاب لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتی ہے جو کہ کتاب کی مقبولیت کا واضح ثبوت ہے۔ اگر ہم جاپان میں چھپنے والے اخبارات، میگزین اور کتابوں کی مجموعی تعداد دیکھیں تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ہر آدمی اوسطاً روزانہ ایک کتاب یا اخبار ضرور خریدتا ہے۔ پاکستان میں تو اچھے اچھے اور معتبر لکھاریوں کی کتابیں بھی 500 یا ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوتی ہیں، جو اگر بک جائیں تو پبلشر کتاب کو کامیاب شمار کرتا ہے۔ ہمارے ہاں کتاب کا رواج نہ ہونے کی بے شمار وجوہات ہیں جن میں سے ایک یہ بھی کہ جن لوگوں کو کتابیں پڑھنے کا شوق ہے ان کے معاشی حالات عام طور پر کتاب خریدنے جیسی عیاشی کی اجازت نہیں دیتے اور جن کے معاشی حالات اچھے ہیں انہیں عموماً مطالعہ کا شوق نہیں ہوتا۔ ہمارے ہمسایہ ملک ایران میں ہر گھر کے اندر جس طرح باورچی خانہ ضروری ہوتا ہے، اسی طرح لائبریری یا کم از کم کتابوں کی الماری گھر کا ضروری حصہ ہے۔ یہاں تک کہ اگر دیوانِ حافظ گھر کی لائبریری میں پہلے سے موجود ہے اور بازار میں اس کا کوئی نیا اور بہتر ایڈیشن آ گیا ہے تو گھر کا کوئی نہ کوئی فرد اسے بھی خرید لائے گا۔ یہ بات المیے سے کم نہیں کہ لاہور

میں جہاں کبھی پرائیویٹ لائبریریاں ہوا کرتی تھیں اب وہاں دودھ دہی کی دکانیں کھل گئی ہیں۔ حالانکہ جس طرح جسم کو اچھی خوراک کی ضرورت ہے اسی طرح دماغ کو بھی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ مطالعے سے ہی فراہم کی جاسکتی ہے۔

قارئین کو بتاتے چلیں کہ دنیا میں کتابوں کی فروخت کا سب سے بڑا مرکز یہاں ٹوکیو میں ہے جس میں دس لاکھ سے زائد عنوانات پر کتابیں موجود ہیں۔ٹوکیو کے علاقے ''کھاندا'' کو جاپان کا اردو بازار کہا جا سکتا ہے۔لیکن اس بازار کی منفرد بات یہ ہے کہ یہاں پرانی سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی بھی بے شمار دکانیں ہیں۔حال ہی میں سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی فروخت میں اضافے کے لیے ایک تنظیم کتب فروشوں نے تشکیل دی ہے جس کے زیرِ اہتمام ایک کتابچہ چھاپا گیا ہے جو کہ پورے ملک میں تقریباً ہر بک سٹال پر دستیاب ہے جس میں ان تمام کتب فروشوں کے تعارف کے ساتھ ساتھ مختلف شعبہ ہائے زندگی کے متعلق دستیاب کتب کی بنیاد پر ان دکانوں کو تقسیم کیا گیا ہے۔اس کوشش کا بظاہر مقصد تو علاقے کو کتابوں کے حوالے سے پہچان دینا لگتا ہے اس کے ساتھ ساتھ ایک مقصد اس وقت نوجوان نسل کو بھی کتاب کی طرف مائل کرنا ہے جو کہ کتاب بینی اور شائع شدہ مواد سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ نوجوان نسل بھی مطالعہ سے دور نہیں ہو رہی بلکہ صرف شائع شدہ مواد سے اس کی رغبت ویسی نہیں جیسی کہ روایتی طور پر اس معاشرے کا خاصا رہی ہے۔نئی نسل میں مطالعے کے لیے انٹرنیٹ کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے اور کمپیوٹر سکرین پر کتابیں پڑھنے کا رواج اس قدر تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ اس وقت ملک میں دس سے زائد کمپنیاں ایسی ہیں جو کہ آپ کو کمپیوٹر سکرین پر آپ کی پسند کی کتابیں مہیا کر دیتی ہیں چونکہ یہاں کاپی رائٹ کا قانون بہت سخت ہے لہٰذا ہر کتاب متعلقہ گاہک کے نام پر ہی خریدی جاتی ہے اس کے بعد اسے کمپیوٹر پر منتقل یا ڈیجیٹل کیا جاتا ہے جس کا یہ کمپنیاں معقول معاوضہ وصول کرتی ہیں۔ جب سے امریکہ کی ایپل (Apple) کمپنی نے آئی پیڈ (I-Pad) متعارف کروایا ہے تب سے کمپیوٹر پر کتابیں فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کاروبار

چمک اٹھا ہے۔ یہاں بطور مثال ایسی صرف ایک کمپنی کا ذکر کروں گا۔
جس نے جولائی کے مہینے میں دس ہزار کتابوں کو ڈیجیٹل کر کے گاہکوں کو فراہم کیا۔ اگست کے مہینے میں یہ تعداد پندرہ ہزار کو پہنچ گئی اور گزشتہ ماہ یعنی ستمبر میں پچیس ہزار کتابوں کو لوگوں نے اس کمپنی کی مدد سے ڈیجیٹل کروایا تا کہ وہ انہیں کمپیوٹر سکرین، I-Pad یا پھر سمارٹ فون پر پڑھ سکیں۔ کتاب کو ڈیجیٹل کر کے یہ کمپنیاں DVD سمیت اسے گاہک کو دے دیتی ہیں۔ گو کہ اس وقت کتابوں کے پبلشرز اور ان کمپنیوں کے درمیان کاپی رائٹ کے حوالے سے ایک قانونی جنگ بھی چل رہی ہے جو کہ خاصی دلچسپ بھی ہے لیکن اس وقت وہ ہمارا موضوع نہیں ہے اس لیے ہم ٹوکیو کے سیکنڈ ہینڈ کتب فروشوں کی بات کرتے ہیں جن کا کتابچہ اس وقت میرے سامنے ہے جس میں مسکراتے ہوئے بیسیوں کتب فروشوں کی تصاویر ان کے تعارف سمیت موجود ہیں۔ آخری صفحے پر مصنف جو کہ خود بھی اسی پیشے سے منسلک ہے اس کتابچے کی اشاعت کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہم کتب فروش کا ہاتھ میں ڈسٹر پکڑے تندمزاج بوڑھے والا امیج تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ گزشتہ شام کوئی سات بجے کا وقت ہوگا جب میرا ایک قصبے میں واقع ایسی ہی کتابوں کی ایک دکان پر جانا ہوا۔ کم وبیش دوسوافراد موجود تھے جو ورق گردانی کر رہے تھے یا کتابوں کو ٹٹولنے اور انہیں خریدنے میں مصروف تھے۔ یہ منظر پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا ہوں کہ یہ یہاں کی زندگی کے معمولات میں شامل ہے، لیکن اس بار دل میں خیال آیا کہ کتاب سے دوستی کی یہ روایت اگر ہم لوگ بھی اپنا لیں تو معاشرے کی بہت سی خرابیاں دور ہوسکتی ہیں اور اپنے لیے بے شمار آسانیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔

اخبار۔کلیدی ذریعۂ اطلاعات

بعض اوقات یہاں کے اخبارات کی سنجیدہ خبریں پڑھ کر بھی ہنسی آتی ہے جس کی وجہ ہمارے اور جاپان کے درمیان صرف ثقافتی تضادات نہیں بلکہ جرم اور سزا کے تصورات کا فرق بھی ہے۔ کچھ ایسی ہی ایک خبر اس وقت میرے زیرِ مطالعہ ہے جس کے مطابق ہیوگو شہر کی پولیس نے ایک 45 سالہ شخص کو ویڈیو گیم کا سافٹ ویئر غیر قانونی طور پر کاپی کرنے کے جرم میں گرفتار کرلیا ہے۔ تفصیلات کے مطابق ملزم نے Play Station کی کچھ گیمز بلا لائسنس کاپی کر کے اپنے ایک دوست کو ای میل کی تھیں۔ پاکستان میں چونکہ کاپی رائٹ کوئی بڑا جرم تو کیا جرم بھی شمار نہیں ہوتا اس لیے ویڈیو گیمز کاپی کرنے پر کسی کی گرفتاری کی دو کالمی خبر خاصی مضحکہ خیز لگتی ہے۔ کامیڈی کی تعریف انگریزی میں Combination of Odd Things کی جاتی ہے جبکہ بقول مشتاق احمد یوسفی جس دن انسان کو قطعی طور پر یہ پتا چل گیا کہ اسے کن باتوں پر ہنسی آتی ہے تو اسی دن سے لوگ ہنسنا چھوڑ دیں گے۔ بلا شبہ ملک کے سب سے زیادہ فروخت ہونے والے اخبار میں دو کالمی خبر مذاق کی بات نہیں ہے اور یہاں بھی اسی صورت میں اخبار کی زینت بنتی ہے اگر اس میں کوئی خبریت ہو۔ یہ بات بھی قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی کہ یہاں 90% فیصد سے زائد بالغ افراد روزانہ اخبار پڑھتے ہیں۔ جاپان نیوز پیپر پبلشرز اینڈ ایڈیٹرز ایسوسی ایشن نے حال ہی میں ایک سروے کیا ہے جس میں ملک کے کونے کونے سے لوگوں کی رائے لی گئی اور چھ ہزار افراد سے بالمشافہ یہ پوچھا گیا کہ ان کا خبریں اور اطلاعات تک رسائی حاصل کرنے کا بنیادی

ذریعہ ریڈیو، ٹی وی، میگزین، انٹرنیٹ اور اخبار میں سے کون سا ہے؟ گزشتہ روز اس سروے کے نتائج کا اعلان ہوا جس کے مطابق 92% فیصد لوگوں کے لیے خبروں تک رسائی کا کلیدی ذریعہ اخبار ہے۔ اس سروے رپورٹ کے مطابق تقریباً 92 فیصد لوگ ہی ہفتے میں پانچ دن یا اس سے زیادہ اخبار کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی، میگزین، انٹرنیٹ اور اخبار کے تقابلی مطالعے کے لیے کیے گئے اس سروے کے مطابق ابلاغ کے پانچوں ذرائع میں سے اخبار کو ترجیح دینے کی وجہ لوگوں سے معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تو ایک بات اکثریت نے بڑے تسلسل کے ساتھ دہرائی کہ اخبارات ہمیں اپنے علاقے اور اردگرد کے لوگوں کو سمجھنے کے لیے سب سے زیادہ مددگار ثابت ہوتے ہیں، جو بات اخبار کو دیگر ذرائع ابلاغ سے ممتاز کرتی ہے۔ پاکستان میں آج کل نیوز چینلز کیونکہ بہت زیادہ ہو گئے ہیں اس لیے کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ شاید وہ اخبارات کی جگہ لے لیں گے اور ٹی وی کیبل نیٹ ورک جیسے جیسے دور دراز علاقوں میں پھیلے گا ویسے ہی اخبارات کی سرکولیشن بھی کم ہو جائے گی، لیکن جاپان میں ہونے والے اس تازہ سروے سے پتا چلتا ہے کہ بے شمار نیوز چینلز اور انٹرنیٹ کی جگہ جگہ باآسانی دستیابی کے باوجود اخبارات ہی دنیا میں خبروں تک رسائی کا کلیدی ذریعہ ہے اور 50% فیصد سے زائد لوگوں کے نزدیک تو، رپوٹ کے مطابق اخبار ناگزیر ہے۔ اس لیے میرے نزدیک پاکستان میں بھی آنے والے دنوں میں اخبارات کی اہمیت کم ہونے کا امکان نہیں ہے۔ ویسے بھی پاکستان میں ٹی وی جرنلزم کی عمر پانچ سات سال سے زیادہ نہیں ہے جبکہ اخباری صحافت کی سوسالہ تاریخ ہے۔

شاید اسی لیے اخبارات میں جو سنجیدگی اور بلوغت نظر آتی ہے اس کا ٹی وی نیوز چینلز میں عموماً فقدان نظر آتا ہے۔

اخباری صحافت سے وابستہ لوگ بخوبی واقف ہیں کہ ہماری صحافتی زندگی کا ایک لازمی جزو رات گئے تک جاگنا اور کام کے ساتھ ساتھ کسی بڑی خبر کا انتظار کرنا ہے۔ ہمارے روزانہ اخبارات کا زیادہ تر حصہ رات کے وقت ہی تیار ہوتا ہے جبکہ یہاں اخبارات کے

درمیان ایک معاہدہ ہے کہ شام پانچ بجے کے بعد وقوع پذیر ہونے والا کوئی بھی واقعہ اگلے دن کے اخبار میں رپورٹ نہیں ہوگا بلکہ اس سے اگلے دن چھپے گا اور شام سات بجے تمام اخبارات کے دفاتر بند ہو جاتے ہیں۔

یوں تو ''آساہی'' جس کا اردو ترجمہ ''صبح صادق'' ہے یہاں کا سب سے بڑا اخبار ہے لیکن تمام اخبارات کی رپورٹنگ میں بے حد یکسانیت پائی جاتی ہے۔مثال کے طور پر ہر اخبار میں خبر شائع کرتے ہوئے ہر آدمی کے نام کے ساتھ اس کی عمر بھی لکھی جاتی ہے ماسوائے ان لوگوں کے جو ملک میں بہت نامور ہیں۔مکتوب کی ابتدا میں ویڈیو گیم کاپی کرنے کے جرم میں گرفتار ہونے والے جس 45 سالہ شخص کا ذکر کیا گیا ہے مذکورہ خبر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس نے جس دوست کو یہ ویڈیو گیم ای میل کی تھی اس کی عمر 33 سال ہے۔

ذرائع ابلاغ کا ایک ضروری شعبہ اشتہارات ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا ہو یا پرنٹ میڈیا ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کی اہمیت دونوں کے لیے بہت زیادہ ہے۔جمعرات کے دن ایک اشتہاری کمپنی نے ٹوکیو کے زیر زمین ریلوے اسٹیشنوں پر 27 ٹی وی سکرینیں نصب کی ہیں جن پر مختلف اشتہارات ہر وقت چلتے رہتے ہیں۔خاص بات یہ ہے کہ ہر سکرین کے اوپر ایک کیمرہ لگایا گیا ہے جو یہ معلوم کرتا ہے کہ اشتہار دیکھنے والے شخص کی عمر کیا ہے اور وہ مرد ہے یا عورت۔جیسے ہی کوئی شخص سکرین کی طرف دیکھتا ہے تو فوراً ہی اس کی تصویر کیمرہ ریکارڈ کر لیتا ہے اور چہرے کی ہڈیوں اور بالوں کی بناوٹ کی مدد سے خود بخود اس شخص کی جنس اور عمر معلوم کرتا ہے۔ایک سال کے عرصے پر مشتمل اس پراجیکٹ کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ کس طرح کے لوگ کس وقت پر کس قسم کے اشتہارات میں دلچسپی لیتے ہیں۔

امریکی فوجی اڈا اور وزیراعظم کا استعفیٰ

جاپان کے وزیراعظم ہاتو یاما نے اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا ہے۔ان کے استعفیٰ کی وجہ اپنے انتخابی وعدے کے مطابق امریکی فوجی اڈے کو اوکی ناوا جزیرے سے منتقل کرنے میں ناکامی ہے۔جاپان کے موجودہ وزیراعظم صرف آٹھ ماہ قبل منتخب ہوکر آئے تھے اور اس کے ساتھ ہی ملک سے ڈیموکریٹک پارٹی کے ساٹھ سالہ مسلسل دور حکومت کا خاتمہ ہوا تھا۔انقلابی تبدیلیوں کا وعدہ کرنے والے مستعفی وزیراعظم کی حکومت سنبھالتے وقت مقبولیت کی سطح 75% فیصد کے قریب تھی جو کہ گرتے گرتے اس وقت کی سروے رپورٹوں کے مطابق 19% سے بھی کم رہ گئی تھی۔دوسری جنگ عظیم میں جاپان پر قبضے کے بعد امریکہ نے اوکی ناوا جزیرے پر اپنا سب سے بڑا فوجی اڈا قائم کیا تھا لیکن اپنے قیام سے لے کر آج تک اس فوجی اڈے کی حیثیت متنازعہ رہی ہے۔سالہا سال سے مقامی لوگ اور حکومت اس فوجی اڈے کو جزیرے سے باہر منتقل کرنے کا مطالبہ کرتے آئے ہیں۔موجودہ حکمران جماعت نے اپنے انتخابی منشور میں یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اس امریکی اڈے کو جاپان کی سرزمین سے باہر منتقل کروانے میں اگر کامیاب نہ بھی ہوئی تو اوکی ناوا جزیرے سے منتقل ضرور کروائے گی۔ الیکشن جیتنے کے بعد موجودہ حکومت نے امریکہ سے مذاکرات شروع کیے کہ امریکی فوجی اڈے کو جزیرے سے منتقل کیا جائے لیکن امریکہ نے اپنا فوجی اڈا منتقل کرنے سے صاف انکار کردیا۔ بالآخر دونوں ممالک گزشتہ ہفتے اس بات پر راضی ہوئے کہ امریکہ اوکی ناوا جزیرے پر ہی ایک دوسری جگہ اپنا فوجی اڈا منتقل کرے گا۔ جیسے ہی

ہیلری کلنٹن کے ساتھ جاپانی حکام نے اس معاہدہ پر دستخط کیے فوراً ہی ہر طرف سے شدید ردِّ عمل سامنے آیا۔ سب سے پہلے تو حکمران اتحاد میں شامل ایک حلیف جماعت کی سربراہ جو کہ موجودہ حکومت میں وزیر بھی تھیں، انہوں نے کابینہ کے اجلاس میں منظوری کے لیے پیش کیے جانے پر امریکہ کے ساتھ کیے گئے معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کردیا جس پر مستعفی ہونے والے وزیراعظم نے خاتون وزیر کو ان کی وزارت کے عہدے سے فارغ کردیا۔ نتیجتاً خاتون وزیر کی جماعت حکومت سے الگ ہوگئی اور اس جماعت کے دوسرے وزیر رکن نے بھی اپنی وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس معاہدے کے فوراً بعد وزیراعظم نے امریکی فوجی اڈے کو اوکی ناوا صوبے سے باہر منتقل کرنے کے اپنے انتخابی وعدے پر عمل نہ کرنے پر قوم سے معافی بھی مانگی لیکن حکمران جماعت جو کہ پہلی مرتبہ حکومت میں آئی ہے اس کے منشور کا یہ بنیادی نکتہ تھا لہٰذا ردِّعمل میں کمی نہ آئی اور تنقید مزید شدید ہوتی گئی۔ بعض لوگوں کے نزدیک تو اوکی ناوا سے حکمران جماعت کی کامیابی کی بنیادی وجہ ہی یہ انتخابی وعدہ تھا کیونکہ وہاں کے لوگوں کا یہ دیرینہ مطالبہ تھا اور اس کے لیے سالہا سال سے وہ جلوس اور ریلیاں نکالتے آئے ہیں۔ مقامی لوگوں کے اس مطالبے کی وجہ وہاں امریکی فوجیوں کی جانب سے کیے جانے والے مختلف نوعیت کے جرائم بھی ہیں جن میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ آج کے اخبار میں بھی ایک امریکی فوجی کے چوری کرتے ہوئے گرفتار ہونے کی خبر ہے۔ یہاں کے معاشرے میں چونکہ جرائم کی شرح باقی دنیا کے مقابلے میں انتہائی کم ہے اس لیے بھی لوگ امریکی فوجیوں کے عمومی غیر مناسب رویے کو نظر انداز نہیں کرسکتے، انہی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے مستعفیٰ وزیراعظم نے اپنے معذرتی بیان میں کہا تھا کہ یہ دل توڑ دینے والا فیصلہ تھا جس کے لیے میں قوم سے معافی مانگتا ہوں اور اپیل کرتا ہوں کہ لوگ امریکی فوجی اڈے کی اوکی ناوا کے اندر کی منتقلی کے مشکل فیصلے کو قبول کرلیں لیکن معافی مانگنے پر بھی ان کی جان نہیں چھوٹی۔ اپنے بیان سے پہلے وزیراعظم نے اوکی ناوا کے گورنر سے بھی ملاقات کرکے اس کو حکومت کے فیصلے سے آگاہ کیا تھا لیکن جب گورنر سے

اس موضوع پر اظہار خیال کے لیے کہا گیا تو گورنر کا لب ولہجہ گورنر پنجاب سلمان تاثیر سے ملتا جلتا تھا فرمانے لگے کہ وزیراعظم نے اوکی ناوا کے عوام سے غدّاری کی ہے اور انہیں دھوکا دیا ہے۔

یہ تو ذکر تھا بیرونی دباؤ اور غم وغصّے کا، ان کی اپنی پارٹی جس کے وہ صدر بھی ہیں اس کے اندر بھی مستعفی وزیراعظم پر تنقید میں شدّت آ چکی تھی کیونکہ اگلے سال ملک میں بلدیاتی انتخابات بھی ہیں جو کہ پارٹی کی بنیاد پر ہوتے ہیں اور حکمران جماعت کی عوامی تائید مسلسل گرتی چلی جا رہی تھی جو کہ پارٹی ارکان کے لیے بھی خطرے کی گھنٹی تھی اس لیے حکمران جماعت کے اکثر اراکین بھی نئی قیادت کے ساتھ انتخابی دنگل میں اترنا چاہتے تھے۔ اپنے استعفیٰ کے اعلان کے ساتھ ساتھ ہاتویاما نے حکمران جماعت لبرل ڈیموکریٹک پارٹی کے جنرل سیکرٹری کے مستعفیٰ ہونے کا بھی اعلان کیا جو کہ ان کے بعد پارٹی کے سب سے اہم رکن خیال کیے جاتے ہیں۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ امریکہ کے ساتھ جاپان کا ہونے والا فوجی اڈے کے متعلق معاہدہ جو کہ وزیراعظم کے استعفیٰ کا سبب بنا وہ معاہدہ برقرار رہے گا۔ پاکستان میں عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ امریکہ صرف پاکستان یا دیگر مسلمان ملکوں کے لیے ہی سپر پاور ہے، لیکن سوچنے کی بات ہے کہ جاپان میں اس کا اثر ونفوذ کتنا ہوگا کہ عوام کی بھاری اکثریت کی تائید وحمایت سے منتخب ہونے والا وزیراعظم اپنی خواہش اور بھرپور کوشش کے باوجود، اپنے ہی ملک میں واقع ایک امریکی فوجی اڈے کو ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں منتقل نہیں کروا سکا اور اسے مجبوراً استعفیٰ دینا پڑا۔ استعفیٰ دیتے ہوئے بھی امریکہ کے ساتھ کیے جانے والے معاہدے کا دفاع کرتے ہوئے اس نے کہا کہ: میں استعفیٰ اس لیے دے رہا ہوں کیونکہ لوگ اب میری بات سننا نہیں چاہتے، لیکن امریکہ کے ساتھ جاپان کا اعتماد کا رشتہ بہت قیمتی ہے اور اسے ہر صورت برقرار رہنا چاہیے۔

بندہ وصاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

موبائل فونوں سے سونے کی برآمد

سونا صرف سونے کی کان سے نکلتا ہے، اصولاً اس بارے میں کوئی متضاد رائے نہیں ہونی چاہیے لیکن تازہ خبر یہ ہے کہ یہاں کی حکومت نے استعمال شدہ اور ناکارہ موبائل فون سیٹ اکٹھے کر کے ان میں سے 22 کلوگرام سونا برآمد کیا ہے۔ گزشتہ برس نومبر کے مہینے سے حکومت کی جانب سے شروع کی گئی اس مہم میں لوگوں نے پانچ لاکھ سے زائد استعمال شدہ ناکارہ موبائل فون جمع کروائے تھے جن سے 22 کلوگرام سونے کے علاوہ 80 کلوگرام چاندی اور چھ ہزار کلوگرام تانبا برآمد ہوا ہے۔ اس مہم کا مقصد قیمتی دھاتوں کو ضائع ہونے سے بچانا تھا جس کے لیے اس مہم کو ''شہری کان کنی'' کا نام دیا گیا تھا۔ پورے ملک کے تمام شہروں اور قصبوں سے پرانے موبائل فون اکٹھے کرنے کے لیے الیکٹرک سٹورز کو استعمال کیا گیا تھا اور ناکارہ موبائل فون جمع کروانے پر حکومت کی طرف سے انعامی لاٹری کے ٹکٹ تحفے میں دیے گئے تھے۔ لاٹری ٹکٹ کی قرعہ اندازی گزشتہ روز ہوئی جس میں ڈیڑھ لاکھ لوگوں میں کروڑوں روپے کے انعامات تقسیم کیے گئے۔ یہاں یہ پہلو بھی دلچسپ ہے کہ پرانے موبائل فون سیٹوں سے حاصل شدہ قیمتی دھاتوں کی مجوزہ فروخت سے حاصل ہونے والی رقم سے کہیں زیادہ رقم انعامی لاٹری کے ذریعے لوگوں کو واپس لوٹا دی گئی۔ صنعت وتجارت کے وزیر نے مذکورہ قیمتی دھاتوں کو فروخت کرنے کے اعلان کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ اس وقت جاپان میں اسے بیس کروڑ کے قریب موبائل فون سیٹ موجود ہیں جنہیں لوگ فون کے طور پر استعمال نہیں کر رہے ہیں، بعض صورتوں میں ٹیلی فون ڈائریکٹری یا

کیمرے کے طور پر ان کو استعمال کیا جا رہا ہے لیکن ان میں سے زیادہ تر ناکارہ ہو چکے ہیں۔ وزیر تجارت کا کہنا تھا کہ اس مہم میں ہم وہ بیس کروڑ کے قریب موبائل فون اکٹھے نہیں کر سکے ہیں مگر اگلے مرحلے میں امید ہے کہ ہم ان کو بھی ری سائیکل (Recycle) کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اپنی اعلیٰ دھاتی صفات کی بنیاد پر بالخصوص سونا اور چاندی مہنگی الیکٹرونکس اور جدید سائنسی آلات میں وائرنگ کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ سونے اور چاندی کی یہ خصوصیت ہے کہ انہیں زنگ نہیں لگتا اور یہ دھاتیں شدید موسمی اثرات کا سب سے بہتر انداز میں مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اسی لیے موبائل فون اور کمپیوٹر یا اس طرح کے دیگر آلات میں ان کا استعمال تو ناگزیر ہے لیکن ناکارہ ہونے کے بعد ان آلات سے ''شہری کان کنی'' کے ذریعے قیمتی دھاتوں کو جس طرح دوبارہ استعمال میں لانے کا جو تجربہ جاپانی حکومت نے کیا ہے وہ بلاشبہ باقی دنیا کے لیے بھی ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔

اور اب ذکر ٹیبل ٹینس کے سٹار کھلاڑی کا جو اپنا ملک اور ٹیبل ٹینس چھوڑ کر فاٹا میں آپریشن کی وجہ سے بے گھر ہونے والے پاکستانیوں کی مدد کرنے نکلا ہے۔ گو کہ تھاناکا اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام برائے پاکستان کا ڈائریکٹر ہے لیکن اس کے کام کی نوعیت کوئی عام نوکری جیسی نہیں ہے اور پاکستان جا کر رہنا تو اس کے لیے بالکل بھی ضروری نہیں تھا۔ ایسے حالات میں جب تقریباً تمام عالمی تنظیمیں دہشتگردی کے روزانہ واقعات کی وجہ سے پاکستان میں اپنا سٹاف کم کر رہی ہیں۔ تھاناکا کے پاکستان جانے کے رضاکارانہ فیصلے کو یہاں کے اخبارات اور ٹی وی بڑی کوریج دے رہے ہیں۔

ان دنوں جب کہ عالمی میڈیا میں پاکستان کی تصویر روزانہ خودکش حملوں اور میدانِ جنگ کی سرزمین کی سی ہے، تھاناکا جیسے شخص کا، جس کی یہاں بیوی اور چار بچوں پر مشتمل ایک خوشحال گھرانہ ہے، فاٹا جیسے خطرناک علاقے میں جا کر کام سنبھالنا یہاں کی عوام کے لیے معمولی بات نہیں ہے۔ پاکستان اور افغانستان کے باڈر ایریا سے ہجرت

کرنے والے لاکھوں افراد کی مدد کے لیے اقوام متحدہ کے جس پروگرام کا وہ انچارج ہے اس میں اس کے ساتھ 800 کے قریب مقامی لوگوں پر مشتمل اقوام متحدہ کا دیگر سٹاف بھی کام کر رہا ہے۔ پریس سے بات کرتے ہوئے تھانا کا کا کہنا تھا کہ فاٹا میں جس طرح کی لڑائی ہو رہی ہے اور لوگ بے گھر ہو رہے ہیں، اس طرح کی لڑائیوں کے نتیجے میں غربت کا پیدا ہونا اور بڑھنا ایک لازمی امر ہے۔ اگر ہم لوگ اس لڑائی سے متاثرہ عام لوگوں کی امداد نہیں کریں گے تو قوی امکان ہے کہ متاثرہ افراد میں سے بہت سارے لوگ دہشت گردوں کے ساتھ مل جائیں گے۔ لہٰذا میں اسے عالمی برادری کی مشترکہ ذمہ داری سمجھتا ہوں کہ ہمیں مِل کر ان بے گھر افراد کی مدد کے لیے فوراً پہنچنا چاہیے تا کہ وہ کہیں دہشتگردی کے شیطانی چکر میں نہ پھنس جائیں۔

تھانا کا جو کہ جاپان میں ٹیبل ٹینس کے کئی قومی ٹائٹل جیتنے کے علاوہ عالمی سطح پر بھی اہم ٹورنامنٹ جیت چکا ہے، زمانۂ طالب علمی سے رضا کارانہ طور پر اقوام متحدہ کے امدادی کاموں میں حصہ لے رہا ہے اور اس سلسلے میں چین اور برما میں بھی امدادی کاروائیوں میں شریک رہ چکا ہے۔ جب اس سے یہ پوچھا گیا کہ وہ جاپان کا پر امن ماحول چھوڑ کر جنگ زدہ علاقہ میں کیوں جا رہا ہے؟ تو اس کا کہنا تھا کہ فاٹا میں جاری آپریشن کا براہِ راست تعلق عالمی امن اور سلامتی سے ہے چونکہ جاپان بھی اسی دنیا کا حصہ ہے لہٰذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا کا امن قائم رہے تو اس کے لیے یہ لازمی ہے کہ مسئلہ کو فوری طور پر حل کریں ورنہ مسائل اور شدید ہو جائیں گے اور مستقبل میں ان سے نمٹنا آسان نہیں رہے گا۔ فاٹا کے لوگوں کو یہ احساس دلانا عالمی برادری کی ذمہ داری ہے کہ وہ مشکل اور تکلیف کی اس گھڑی میں تنہا نہیں ہیں بلکہ اقوامِ عالم ان کے دکھ میں شریک ہیں۔

چینی، جاپانی حلیف

جاپانی مصنوعات کی سب سے بڑی منڈی چین بن گیا ہے۔گزشتہ روز یہاں وزارتِ خزانہ کی جانب سے جاری کیے گئے اعداد وشمار کے مطابق دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد پہلی مرتبہ امریکہ کی جگہ چین جاپانی مصنوعات کا سب سے بڑا خریدار بن گیا ہے۔ یہاں کی درآمدات کی لسٹ میں تو کئی سال پہلے سے ہی چین سرِ فہرست ہے۔گو کہ پچھلے کی نسبت اس سال چین جانے والی مصنوعات میں20% کمی ہوئی لیکن امریکہ کو جانے والی مصنوعات میں یہ کمی دوگنا یعنی40% کے قریب ریکارڈ کی گئی ہے جس کے نتیجے میں اب چین جاپان کا سب سے بڑا تجارتی حلیف ہے۔ بظاہر اس کی وجہ عالمی معاشی بحران ہے جس سے امریکہ سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے اور چین کا شمار عالمی معاشی بحران سے سب سے کم متاثر ہونے والے ممالک میں ہوتا ہے۔

یہاں کی معیشت کتنی بڑی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس سال میں جاپان کی برآمدات کی مجموعی قیمت پاکستانی روپے میں تقریباً پچاس ہزار ارب روپے بنتی ہے اور درآمد کی گئی اشیاء کی قیمت اس رقم سے5% کم ہے۔یعنی برآمدات اور درآمدات کی مجموعی مالیت ایک لاکھ ارب روپے کے قریب ہے باوجود اس بات کے کہ اس برس گزشتہ سال کے مقابلے میں درآمدات اور برآمدات میں30% سے زائد کمی ہوئی ہے۔جاپان کا اس سال کا تجارتی منافع ڈھائی ہزار ارب روپے کے قریب ریکارڈ کیا گیا ہے۔

جاپان اور چین سے ہی جڑی ہوئی ایک اور خبر جس نے عالمی میڈیا کی بہت زیادہ

توجہ حاصل کی ہے وہ پچھلے تین ماہ سے ٹوکیو کے سب سے بڑے ہوائی اڈے پر قیام پذیر ایک چینی باشندے کا مسلسل احتجاج اور گزشتہ روز اس طویل احتجاج کے خاتمے کے متعلق ہے۔ تفصیل اس دلچسپ اور انوکھے احتجاج کی کچھ یوں ہے کہ فینگ ژینگ ھو چین میں انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے کام کرنے والی ایک تنظیم کا کارکن ہے اور اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے تین سال جیل بھی کاٹ چکا ہے۔ گزشتہ سال جون میں وہ اپنی بہن سے ملنے کے لیے جاپان آیا جو کہ یہاں پر مستقل رہائش پذیر ہے۔ مگر واپسی پر چین کے امیگریشن حکام نے اسے ملک میں داخل ہونے سے روک دیا اور جاپان واپس بھیج دیا۔ پچھلے سال جون سے اب تک وہ آٹھ مرتبہ چین داخل ہونے کی کوشش کر چکا ہے اور آٹھوں مرتبہ واپس بھجوا دیا گیا ہے۔ بارہ ہفتے پہلے جب اسے ایک مرتبہ پھر چین داخل ہونے کی اجازت نہ ملی اور جاپان لوٹا دیا گیا تو اس نے احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے اس نے ایک انوکھا طریقہ اختیار کیا۔ جاپان کی امیگریشن کلیئر کرنے کے بعد وہ کسٹم کے لیے نہیں گیا بلکہ جاپان میں داخل ہونے سے انکار کر دیا اور ایئر پورٹ پر ہی رہائش پذیر ہو گیا۔ قانونی طور پر آپ کسٹم کلیئر کرنے کے بعد ہی کسی ملک میں داخل شمار ہوتے ہیں۔ ایئر پورٹ پر واقع امیگریشن اور کسٹم کی درمیانی جگہ کی حیثیت عالمی قوانین کے مطابق ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ دو ملکوں کی سرحد کے درمیان واقع جگہ کی ہوتی ہے۔ اگر آپ نے ہالی ووڈ اداکار ٹام ہینکس کی فلم ''ٹرمینل'' دیکھی ہے جسے سٹیون سپیل برگ نے بنایا تھا تو آپ بخوبی یہ منظر سمجھ سکتے ہیں۔

فینگ ژینگ ہو نے اپنی شرٹ پر چینی زبان میں بڑا بڑا یہ لکھا کہ ''مجھے چین آنے دو۔'' گزشتہ ہفتے چین کے ایک سفارتکار اس سے ملنے کے لیے ایئر پورٹ آئے اور نئے چینی سال سے پہلے چین میں داخلے کے یقین دہانی کروا گئے جس پر اس نے اپنا احتجاج ختم کر دیا اور جاپان میں داخل ہو گیا لیکن ایئر پورٹ پر اس نے یہ تین مہینے کیسے گزارے یہ بہت ہی دلچسپ داستان ہے۔ اس قیام کے دوران اسے کن مسائل کا سامنا تھا۔ وہ بھی ہماری عام زندگی سے بالکل ہٹ کر تھے۔ پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ اس کے پاس جاپان کی کرنسی نہیں تھی اور غیر ملکی کرنسی اس سے لینے کے لیے کوئی بھی ایئر پورٹ پر موجود

دکاندار تیار نہ تھا۔ اس ایریا میں نہانے کا بھی کوئی بندوبست نہیں تھا اور سونے کے لے بھی بس بنچ اور کرسیاں ہی تھے۔ شروع شروع میں تو ایئرپورٹ انتظامیہ نے اس کی حوصلہ شکنی کی تا کہ وہ اپنا احتجاج ختم کر کے چلا جائے۔

لیکن اس کی مستقل مزاجی دیکھ کر گرد و پیش کے لوگوں کا رویہ بھی نرم ہو گیا اور انہوں نے خود ہی اسے کھانے پینے کی اشیاء فراہم کرنی شروع کر دیں۔ اس دوران وہ انٹرنیٹ اور موبائل SMS کے ذریعے سے پوری دنیا میں انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے کام کرنے والے لوگوں اور تنظیموں سے رابطے میں رہا۔ شروع شروع میں تو کسی نے بھی اس پر خاص توجہ نہیں دی لیکن آہستہ آہستہ پوری دنیا کے بڑے اخباروں میں اس کے متعلق فیچر اور مضامین شائع ہونے لگے۔

گزشتہ روز اس نے اپنا احتجاج ختم کرتے ہوئے میڈیا کو بتایا کہ لگتا ہے کہ اُن لوگوں کو میری پریشانی کا اندازہ ہو گیا ہے۔ گزشتہ ہفتے پہلی مرتبہ چینی سفارتکار مجھ سے ملنے کے لیے آئے اور انہوں نے مجھے یقین دہانی کروائی ہے کہ اگلی مرتبہ انہیں چین سے واپس نہیں بھیجا جائے گا۔ اپنے احتجاج کے خاتمے پر اس نے کہا کہ میرے پاس چین کا جائز پاسپورٹ ہے اور اپنے ملک جانا میرا بنیادی حق ہے۔

جاپانی شہراوبامہ

عالمی معاشی بحران کی لپیٹ میں آئے ہوئے ملکوں میں جاپان بھی نمایاں ہے جس کے اثرات کا اظہار اب آئے دنوں مختلف واقعات سے ہوتا رہتا ہے۔ جب سے معاشی بحران نے شدت اختیار کی ہے جاپان میں جرائم کی شرح میں نمایاں طور پر اضافہ ہوا ہے۔ گزشتہ روز یہاں کے ایک شہر سائیتاما(Saitama) میں ایک شخص رات کے وقت اپنے بیٹے پر چاقو سے حملہ کر کے اسے ہلاک کرنے کی کوشش میں تھا کہ گھر کی بالائی منزل پر لڑکے کی ماں جو کہ اس وقت آرام کر رہی تھی نے شور سُن کر پولیس کو فون کر دیا۔ مذکورہ شخص نے اسی دوران خود کو بھی ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ پولیس کے فوری طور پر جائے وقوعہ پر پہنچ جانے کی وجہ سے ملزم گرفتار ہو گیا۔

اپنے بیٹے پر حملہ آور شخص نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ وہ معاشی بحران سے شدید متاثر اور پریشان ہوا ہے اور اس بحران کی طوالت نے اسے مایوس کر دیا تھا اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بیٹے کو ہلاک کر دے اور خود بھی خودکشی کر لے۔ اس حملے کے دوران مذکورہ شخص نے اپنے بیٹے کو شدید زخمی کر دیا ہے، اس کی چھاتی پر چاقو سے زخم آئے ہیں اور وہ اس وقت ہسپتال کے انتہائی نگہداشت وارڈ میں زیر علاج ہے۔ اس خبر نے جاپان کے سماجی حلقوں کو شدید متاثر کیا ہے۔

ادھر جاپان کے ساحلی شہر نیگاتا میں پاکستان ایسوسی ایشن جاپان نے ملاکنڈ اور سوات کے آپریشن میں متاثرین کی اپنے علاقوں میں بحالی کے لیے فنڈ ریزنگ میوزیکل شو

کا انعقاد کیا جس میں پاکستان سے آئے ہوئے معروف لوک فنکار عطاء محمد خان نیازی نے پرفارم کیا۔ حاضرین نے دل کھول کر متاثرین سوات کی بحالی کے لیے قائم کیے گئے فنڈ میں حصہ ڈالا۔

پاکستان ایسوسی ایشن کے مرکزی صدر رند احمد خان اچکزئی نے اپنے خطاب میں ان مصائب کا ذکر کیا جن سے سوات اور ملاکنڈ سے آئے ہوئے مہاجرین گزر رہے ہیں اور اب ان کی اپنے علاقوں میں بحالی بذاتِ خود ایک دشوار مرحلہ ہے۔

اِک اور دریا کا سامنا تھا منیؔر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

پاکستان ایسوسی ایشن کے کنوینز الطاف بٹ اور ضلعی صدر چوہدری محمد کفیل نے بھی اپنی تقاریر میں جاپان کے کونے کونے سے شرکت کے لیے آئے مہمانوں سے متاثرین کی اپنے علاقوں میں بحالی کے لیے مدد کرنے کی اپیل کی۔ پروگرام کے آخر میں تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر عطاء خان نیازی کے ساتھ مل کر پاکستان کا ترانہ گایا اور دیر تک ''پاکستان زندہ باد'' کے پرجوش نعرے لگاتے رہے جس سے تقریب کا ماحول خاصا جذباتی ہو گیا۔ تقریب میں پاکستانی کمیونٹی کے علاوہ مقامی اور دیگر ممالک کے لوگ بھی شامل تھے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ امریکی صدر بارک اوباما کو امریکہ سے باہر الیکشن کے دوران کس شہر میں سب سے زیادہ حمایت حاصل رہی تو غالباً اس کا جواب جاپان کا شہر ''اوباما'' ہوگا جو کہ امریکی صدر کا ہم نام ہے۔ یہ چھوٹا سا شہر جاپان کے ضلع فوکوئی میں واقع ہے۔ امریکی الیکشن کے بعد اس شہر کی انتظامیہ نے اپنے شہر کے ہم نام کو امریکی صدر منتخب ہونے پر چار سیٹ کھانے کی چاپ سٹکس بھیجی تھیں۔ چاپ سٹکس پر صدر اوباما، ان کی اہلیہ مشل اور دونوں بیٹیوں کے نام کنداں تھے اور اس کے ساتھ بورڈ گیم بھی تحائف میں شامل تھی۔

یہ تحفہ جاپانی وزیراعظم تاروآسو نے فروری کے آخر میں امریکی صدر بارک اوبامہ

کے ساتھ اپنی وائیٹ ہاؤس میں ہونے والی ملاقات میں پیش کیا تھا۔گزشتہ روز اوباما شہر کے میئر نے میڈیا کو امریکی صدر بارک اوبامہ کی طرف سے آنے والا شکریہ کا خط دکھایا جس میں انہوں نے اوباما شہر کی محبتوں کا دل کی گہرائیوں کے ساتھ شکریہ ادا کیا اور اس بات کا خصوصی ذکر کیا کہ ان کی اہلیہ مشل کو تحفے میں دی جانے والی بورڈ گیم بہت پسند آئی ہے اور وہ اب اکثر فارغ وقت میں اسے کھیلتی ہیں۔

ایٹمی ہتھیاروں کے خاتمے کی کوششیں

ہیروشیما اور ناگاساکی شہر کے میئروں نے گزشتہ روز مشترکہ طور پر ٹوکیو میں واقع پاکستانی ایمبیسی سمیت جوہری ہتھیار رکھنے والے ممالک برطانیہ،فرانس اور روس کی ایمبیسی کا دورہ کیا اوران ممالک کے سربراہان کو ہیروشیما اور ناگاساکی شہر کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔اگلے ہفتے دونوں شہروں جن کو دوسری جنگ عظیم کے دوران 1945ء میں امریکہ نے ایٹمی بمباری کا نشانہ بنایا تھا ان کے میئر امریکہ،چین اور بھارت کی ایمبیسی کا دورہ کریں گے اوران ممالک کے سفیروں کو سربراہان مملکت کے نام دعوتی خطوط پیش کریں گے کہ وہ جنگِ عظیم دوم کے دوران ایٹم بم کا شکار ہونے والے ان شہروں کا دورہ کریں۔ ہیروشیما کے میئر تھاداتوشی اور ناگاساکی کے میئر تاؤ نے اپنی پریس بریفنگ میں کہا کہ ہماری اس مشترکہ کوشش کا مقصد دنیا سے ایٹمی ہتھیاروں کا خاتمہ ہے۔یوں تو بارک اوباما 12 اور 13 نومبر کو جاپان آرہے ہیں لیکن وہ ہیروشیما اور ناگاساکی کا دورہ نہیں کریں گے جس کی وجہ وقت کی کمی اور دیگر امور بتائے گئے ہیں لیکن حقیقت میں ان دوشہروں کا دورہ نہ کرنے کی وجہ امریکہ اور جاپان میں پائے جانے والے عوامی جذبات ہیں اوران دوشہروں سے جڑی ہوئی ہولناک تباہی کی دردناک تاریخی یادیں ہیں۔

جاپان پچھلے 15 سال سے مسلسل ہر سال اقوامِ متحدہ میں دنیا سے ایٹمی ہتھیاروں کے خاتمے کے لیے ایک قرارداد پیش کرتا آیا ہے اور یہ ہر سال منظور بھی کر لی جاتی ہے۔اس ہفتے بھی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایٹمی ہتھیاروں کے خاتمے کی قرارداد پیش کی گئی۔

اس قرارداد کو پیش کرنے کے لیے جاپان کو 72 ممالک کا اشتراک حاصل تھا جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ گزشتہ برس 58 ممالک نے قرارداد پیش کرنے میں اشتراک کیا تھا۔ بارک اوباما کے صدر بننے کے بعد پہلی بار ایسا ہوا کہ امریکہ نے اس قرارداد کی نا صرف حمائیت کی بلکہ اس کو پیش کرنے کے لیے جاپان سے اشتراک بھی کیا۔ پچھلے سال ایسی ہی قرارداد کی صدر بش نے مخالفت میں ووٹ دیا تھا۔ اس سال قرارداد کے حق میں 170 ممالک نے ووٹ دیا جبکہ صرف بھارت اور شمالی کوریا وہ واحد ممالک تھے جنہوں نے دنیا سے ایٹمی اسلحہ کے خاتمے کی قرارداد کی مخالفت میں ووٹ دیا۔ پاکستان، چین اور ایران سمیت آٹھ ممالک نے ووٹنگ میں حصہ نہیں لیا۔ تاہم اس قرارداد کی نوعیت ایسی ہے کہ منظور ہونے کے باوجود اس کی پابندی کرنا کسی بھی ملک کے لیے لازمی نہیں ہے اور اس کی حیثیت محض اخلاقی ہے۔

ذکر ہو رہا ہے جاپان کی دنیا سے ایٹمی ہتھیاروں کے خاتمے کی کوششوں کا اور اقوام متحدہ میں اس کی طرف سے پیش کی جانے والی قرارداد کا تو دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان کے جن شہریوں نے ایٹمی تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، یا ہیروشیما اور ناگاسا کی پر ایٹمی بمباری سے زخمی ہونے کے باوجود زندہ بچ جانے والے لوگوں کی کہانیوں اور تاثرات پر مبنی فیچر فلم ''امید کی کرنیں'' کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک گھنٹے دورانیے کی اس خوبصورت فلم کا پریمیئر اس ہفتے اقوام متحدہ کے نیویارک میں واقع ہیڈ آفس میں ہوا۔ ''سفینۂ امن'' نامی جاپانی تنظیم کے تعاون سے کوسٹاریکا کے معروف فلم ڈائریکٹر ایریکا بیگنا ریو کی بنائی ہوئی اس فلم میں 100 سے زائد ایٹم بم کے متاثرین کے انٹرویوز اور کہانیاں شامل ہیں جو ایک کشتی میں پوری دنیا کا چکر لگاتے ہیں۔

سفینۂ امن نامی تنظیم پچھلے پچیس سال سے مسلسل ہر سال ایسے سفر کا اہتمام کرتی آ رہی ہے اس سال اپنے سلور جوبلی سفر کے دوران ایٹمی جنگ عظیم کی بمباری کا شکار ہونے والے 103 مسافروں نے چار ماہ دورانیے میں بیس ممالک کی تیئس بندرگاہوں کا دورہ کیا۔ ''امید کی کرنیں'' اسی دورے پر مشتمل فلم ہے جس میں ان لوگوں نے میزبان ممالک کے لوگوں کو دوسری جنگ عظیم کے دوران ہونے والی ایٹمی بمباری کے متعلق اپنی کہانیاں بیان

کیں۔اپنے دکھ درد اور یادداشتوں کے ساتھ ساتھ امید کا بیان کرنے والے ان لوگوں کے استقبال کے لیے عام شہریوں اور طلبہ سے لے کر سیاسی قائدین اور سماجی کارکنوں تک ہر طرح کے لوگ آئے۔اقوام متحدہ میں فلم کے پریمیئر کے موقع پر ''سفینہ امن'' منصوبے کی انچارج کا واسا کی نے کہا کہ ''امریکی حالات کی وجہ سے وقت پھل کی طرح پک چکا ہے۔''ان کا اشارہ غالباً نئے امریکی صدر بارک اوبامہ کے اس عزم کی طرف تھا جو وہ دنیا سے ایٹمی ہتھیاروں کے مکمل خاتمے کے متعلق رکھتے ہیں۔یا کم از کم ایٹمی ہتھیاروں کے خاتمے کا ارادہ رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں جس کی بدولت انہیں حال ہی میں سویڈن کی نوبل پرائز کمیٹی نے امن کا نوبل انعام بھی دیا ہے۔ویسے یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ کسی شخص کو اس کے ارادوں پر نوبل انعام ملا ہو۔تاحال دنیا میں ایٹمی اسلحے کا سب سے بڑا ذخیرہ امریکہ کے پاس ہے گو کہ ''امید کی کرنیں'' نامی اس فلم کے بنیادی مقاصد تعلیمی ہیں لیکن ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکی ایٹمی بمباری سے زندہ بچ جانے والے لوگوں کی کہانیوں کو بہت ہی خوبصورت انداز میں فلم کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔فلم کا مرکزی کردار ستسکو نامی ایسا شخص ہے جس کے گھر کے آٹھ افراد ہیروشیما پر ایٹم بم گرنے سے ہلاک ہو گئے تھے۔فلم کا یہ کردار بڑا کرشماتی ہے جس کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ اتنی بڑی تباہی دیکھنے کے بعد یہ اس کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ تمام دنیا کے لوگوں کو تعلیم دے کہ دنیا سے ایٹمی ہتھیاروں کا مکمل خاتمہ کتنا ضروری ہے اور جب سب لوگ مل کر ایٹمی اسلحے کے خلاف آواز بلند کریں گے تو انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔فلم کا ایک پہلو ''سفینہ امن'' پر سوار ایٹمی بمباری سے بچ جانے والے لوگوں کی ویت نام کے ساحلوں پر ویتنامی بچوں اور امریکی ایٹمی اسلحہ ''ایجنٹ اورنج'' کا شکار ہونے والے دوسرے لوگوں سے ملاقات ہے۔امریکہ ویتنام جنگ کے دوران امریکی فوج نے ''ایجنٹ اورنج'' کو بڑے وسیع پیمانے پر استعمال کیا تھا جس کے اثرات مختلف شکلوں میں آج بھی موجود ہیں جنہیں اس فلم میں دکھایا گیا ہے۔اس گروپ کی فرانس کے ایٹمی ٹیسٹ سے متاثر ہونے والے ''آٹولز'' لوگوں سے ملاقات کے علاوہ آسٹریلیا کے ان مقامی باشندوں جن کو

عرف عام میں ''ابور جنل'' کہا جاتا ہے سے ملاقات میں یہ تفصیل سامنے آئی ہے کہ کس طرح یورینیم کی کانوں میں کام کرنے والے یہ لوگ تابکاری سے متاثر ہوئے ہیں۔فلم کا ایک حصہ اینیمیٹڈ ہے جو کہ ہیروشیما کی بمباری سے بچ جانے والے ایک لڑکے کی کہانی ہے۔ امن کی کشتی نامی تنظیم نے اپنے 25 سال مکمل ہونے پر فلم بنانے کا فیصلہ کیا تھا تا کہ 1945 کی امریکی ایٹمی بمباری کے متاثرین کی کہانیاں فلم کی صورت میں محفوظ کی جا سکیں اور اس فلم کو دیکھنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کوشش کامیاب رہی۔اس فلم میں بڑا بھرپور پیغام انتہائی مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے لیکن فلم دیکھتے ہوئے کسی بھی لمحے بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔

ہیروشیما کی ضلعی حکومت نے یہ اطلاع دی ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران ایٹم بم گرنے کی سالانہ یادگاری تقریب جو کہ 6 اگست کو منعقد ہو رہی ہے۔اس میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر میگل دی اسکوٹو خصوصی طور پر شریک ہوں گے۔ یہ تیسرا موقع ہے کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا کوئی صدر ایٹم بم گرانے کی یاد میں منعقدہ کسی تقریب میں حصہ لے گا۔ ہیروشیما میں ایٹم بم سے ہونے والی تباہی کی یاد میں ایک میوزیم قائم ہے جس میں تصاویر کے علاوہ ایٹم بم کی تباہی سے متاثرہ اور بہت سی چیزیں نمائش کے لیے رکھی گئی ہیں۔ اسے عرف عام میں اے بم (A-Bomb) میوزیم کہا جاتا ہے۔ یہ تقریب اسی میوزیم کے قریب منعقد ہوگی۔ جنرل اسمبلی کے صدر اسی طرح کی ناگاساکی میں ہونے والی تقریب میں بھی 9 اگست کو شریک ہوں گے۔

بات فلموں کی چلی ہے تو چلتے چلتے 22 ویں ٹوکیو انٹرنیشنل فلم فیسٹیول کا بھی ذکر ہو جائے جس میں اس سال کی بہترین فلم کا ایوارڈ بلغاریہ کی بنائی ہوئی فلم Eastern Plays ایسٹرن پلے کو دیا گیا ہے جو کہ دو بھائیوں کی کہانی ہے جنہیں زندگی میں مختلف قسم کے مسائل کا سامنا ہے۔ یہ فلم ان پندرہ فلموں میں شامل تھی جنہیں گزشتہ ہفتے فائنل مقابلے کے لیے ٹوکیو میں نمائش کے لیے پیش کیا گیا۔اس فلم کو ایوارڈ کے ساتھ ساتھ 50 ہزار ڈالر کا کیش پرائز بھی دیا گیا ہے۔

ایٹمی بمباری کے 64 سال

اس ماہ جاپان کے دو اہم شہروں پر دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکی ایٹمی بمباری کے واقعے کو چونسٹھ سال ہو گئے ہیں۔اس عظیم تباہی کی یاد میں تقریبات کا سلسلہ جاری ہے۔اس سلسلے کی مرکزی تقریب ہیروشیما کے یادگارِ امن پارک میں منعقد ہوئی، جس میں 59 مما لک کے نمائندوں سمیت پچاس ہزار سے زائد لوگوں نے شرکت کی۔ جاپان کے وزیراعظم، اپوزیشن لیڈر اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر میگل دی اسکوتو بھی اس موقع پر موجود تھے۔ایٹم بم سے ہلاک ہونے والے ڈھائی لاکھ سے زائد لوگوں کی یاد میں ایک منٹ کے لیے خاموشی اختیار کی گئی۔ ہلاک شدگان کی یادگار پر پھول چڑھانے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے مذہبی پیشواؤں نے دعائیہ تقریبات کا بھی اہتمام کیا۔اسی دوران ناگاساکی کے چند سائنسدان جو کہ ایٹم بم سے ہونے والی تباہی کا مختلف زاویوں سے جائزہ لے رہے تھے ایک حیران کن خبر لے کر آئے ہیں کہ ناگاساکی میں 1945 میں ایٹم بم سے ہلاک ہونے والے لوگوں کے جسموں کے محفوظ کردہ نمونوں کے تجزیے سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ ان سے اب بھی تابکاری شعاعیں خارج ہو رہی ہیں جن کی سائنسدانوں نے تصویریں کھینچی ہیں اور میڈیا کو جاری کی ہیں، جنہیں اخبارات نے بہت نمایاں طور پر شائع کیا ہے۔ امریکی ایٹم بم کا 1945ء میں شکار ہونے والے شہر ناگاساکی میں ایٹم بم کے اثرات کا جائزہ لینے والی ٹیم کے ایک رکن کازو کو جو کہ ناگاساکی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، بتاتے ہیں کہ تصاویر اس بات کا واضح

ثبوت ہیں کہ ایٹم بم کی تابکاری سے ہلاک ہونے والے افراد کے جسموں سے اب بھی تابکاری شعاعیں خارج ہو رہی ہیں۔ ہم نے تحقیق سے اس حقیقت سے بھی پہلی مرتبہ پردہ اٹھایا ہے کہ ایٹم بم میں استعمال ہونے والا مواد پلوٹو نیم نا صرف باہر سے انسانی جسم میں داخل ہوتا ہے بلکہ ایک دفعہ انسانی خلیوں میں داخل ہونے کے بعد مستقل طور پر ایٹمی شعاعوں کی شکل میں اسی سے خارج ہوتا رہتا ہے۔ سائنسدانوں کی اس تحقیقاتی ٹیم نے 64 سال قبل ایٹم بم سے لقمۂ اجل بننے والے ایسے سات افراد کے جسموں کے نمونوں کا تجزیہ کیا جن کی عمریں 20 سال سے لے کر 70 سال تک کی تھیں اور یہ ساتوں افراد ایٹم بم گرنے کے مقام سے 500 میٹر سے لے کر ایک کلومیٹر کے فاصلے پر موجود تھے۔ تحقیقاتی ٹیم ان افراد کے جسموں سے خارج ہونے والی ایٹمی شعاعوں کی تصاویر لینے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ یہ شعاعیں پلوٹو نیم سے مستقل طور پر خارج ہوتی رہتی ہیں تاوقتیکہ یہ مادہ مکمل طور پر ختم نہ ہو جائے۔ زیرِ تجزیہ افراد کے جسموں سے خارج ہونے والی شعاعوں کی تصاویر اور ناگاساکی اور ہیروشیما میں گرائے گئے پلوٹو نیم بم سے خارج ہونے والی الفا شعاعوں کی تصاویر اور تجزیے نے انہیں یکساں ثابت کر دیا ہے۔

ہیروشیما یونیورسٹی میں اسی موضوع پر کام کرنے والے پروفیسر کامیدا نے اس تحقیق کے نتائج پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ تحقیق اس لحاظ سے اہم ہے کہ ایٹمی اثرات کو باقاعدہ تصاویر کی مدد سے محفوظ کیا گیا ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ دنیا نے ایٹم بم کی تباہی اور اس کے نتائج کو سنجیدگی سے نہیں لیا ہے۔ یہاں پروفیسر کامیدا اکیلے ہی نہیں جو دنیا سے ایٹمی ہتھیاروں کا خاتمہ چاہتے ہیں، جاپان میں ڈنمارک کے سفیر فرانز مائیکل نے دنیا سے ایٹمی ہتھیاروں کے خاتمے کے لیے امریکہ کی عدم دلچسپی اور ہیروشیما ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے کے 64 سال مکمل ہونے پر ایک انوکھا احتجاج کیا ہے۔ وہ اپنے 25 دیگر ساتھیوں کے ساتھ احتجاجاً جاپان کے سب سے بلند اور مقدس پہاڑ فیوجی (Fuji) کی چوٹی پر چڑھے، انہوں نے بینر بھی پکڑ رکھے تھے جن پر امریکہ کے خلاف نعرے درج تھے۔ صبح

پر انھوں نے ایٹم بم سے ہلاک ہونے والوں کی یاد میں ایک منٹ خاموشی اختیار کی اور اس کے بعد ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف فضا میں نعرے بلند کیے۔ یاد رہے کہ 16 اگست 1945ء کو صبح 8:15 پر ہیروشیما پر دنیا کی تاریخ کا پہلا ایٹم بم گرایا گیا تھا اور اس کے تین دن بعد 19 اگست 1945ء کو ناگاساکی پر بھی بم گرایا گیا تھا۔ امریکہ کے ایٹم بم گرانے کے لیے ہیروشیما اور ناگاساکی کے انتخاب کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان دو شہروں میں کوئی بھی امریکی جنگی قیدی موجود نہیں تھا۔ ان دو شہروں کے علاوہ جاپان کے تمام شہروں میں 1945ء میں امریکی جنگی قیدی موجود تھے۔

ہیروشیما و ناگاساکی کی سالانہ یادگاری تقریبات کا دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ ہم ان لوگوں سے بھی مل سکتے ہیں جنھوں نے ایٹم بم کی یہ تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ اس مرگ انبوہ کے ایک عینی شاہد ہیروشیما کے 76 سالہ یوکیو بھی ہیں جو کہ 16 اگست کو یادگارِ امن پارک میں صبح 4:30 بجے عبادت میں مشغول تھے، دعا مانگ چکے تو اپنا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگے کہ میں ہر سال اسی وقت دعا کے لیے آتا ہوں جب پارک میں ابھی مکمل خاموشی ہوتی ہے۔ امریکی ایٹمی حملے میں یوکیو نے اپنے ماں باپ کو کھو دیا تھا۔ اس دن کو یاد کر کے بتاتے ہیں کہ میں اس وقت گھر سے باہر تھا، والدین میرے انتظار میں تھے۔ ہیروشیما اسٹیشن پر پہنچا تھا کہ شہر پر امریکی جنگی طیارے نے ایٹم بم گرا دیا۔ ہر طرف آگ، دھواں اور خون تھا۔ خون میں لت پت لوگ دیوانہ وار ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ چیخ و پکار کرتے، گرتے سنبھلتے اور مرتے ہوئے لوگ۔ پتا نہیں کہ میں کیسے بچ گیا۔ بس اتنا یاد ہے کہ خون میں مکمل طور پر لت پت تھا اور اپنے والدین کو تلاش کر رہا تھا۔ اس یادگارِ امن پارک جو کہ ایٹمی تباہی کا مرکز تھا میں ہر سال اپنے والدین کو یہ بتانے آتا ہوں کہ میں زندہ ہوں اور بالکل تندرست، خوش باش ہوں۔ یہاں ہر سال دعا کرنے آتا ہوں ایٹمی بمباری کا شکار ہونے والے معصوم اور بے گناہ لوگوں کے لیے اور عالمی امن و آشتی کے لیے۔ پوری دنیا میں ایسے امن و سکون کے لیے دعا کرتا ہوں جیسا سکون اس وقت اس پارک میں دن کے

اس حصے، صبح صادق میں ہے۔

دو دن پہلے ایک خاتون ناگاساکی میں 1945 کے امریکی ایٹمی حملے کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگیں کہ میں اس وقت 13 سال کی تھی اس ایٹمی بمباری کے واقعے نے مجھے جذباتی طور پر ایسا شدید گھائل کیا کہ میں پچاس سال تک ایٹم بم گرنے کے واقعے کے متعلق ایک لفظ بھی زبان پر نہ لا سکی۔ اس خاتون کے والدین ایٹمی اثرات کا شکار ہوکر حملے کے ایک سال بعد فوت ہو گئے تھے۔ ایٹمی بمباری کے متعلق اپنی یادیں بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہماری نسل آپ کو ایٹمی تباہی کے تجربات و مشاہدات بتاتی ہے۔ جنگ کتنی ہولناک چیز ہے اور ایٹم بم کی تباہی و بربادی کی کہانی جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی مگر مرنے کے بعد میں ایٹمی بمباری کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو یہ بتانا پسند کروں گی کہ دنیا میں اب ایٹمی ہتھیاروں کا مکمل خاتمہ ہو چکا ہے اور اب زمین پر جنگیں نہیں ہوتیں۔

خودکشی کا رجحان اور اوکھی ناوا

گزشتہ گیارہ سال سے جاپان میں ہر سال تیس ہزار سے زیادہ افراد خودکشی کر لیتے ہیں۔ رواں سال کی پہلی ششماہی میں سترہ ہزار سے زائد افراد خودکشی کر چکے ہیں جو کہ نیشنل پولیس ایجنسی (NPA) کی جانب سے جاری کردہ اعداد وشمار کے مطابق اب تک ریکارڈ کیے گئے اس دورانیے میں خودکشیوں کی سب سے زیادہ شرح ہے۔NPA کا کہنا ہے کہ اس کے نزدیک خودکشی کے واقعات کی شرح میں اضافے کی موجودہ وجہ گراوٹ کا شکار معیشت ہے۔خودکشی کے مرتکب افراد میں مردوں کا تناسب زیادہ جو کہ 71% بتایا گیا۔نیشنل پولیس ایجنسی کا یہ بھی کہنا ہے کہ جون کے مہینے میں یہ شرح سب سے بُلند ہوتی ہے جب معاشی سال کا خاتمہ ہوتا ہے اور عارضی ملازمین کے کنٹریکٹ عام طور پر اسی مہینے ختم ہوتے ہیں اور اس سال وہ بڑی تعداد میں بے روزگار ہوئے ہیں۔

تو یوکی یوشیدا جو کہ قرض میں جکڑے ہوئے افراد کی مدد کرنے والی ایک تنظیم کے جنرل سیکرٹری ہیں کا کہنا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ جب کوئی شخص نوکری کھوتا ہے یا کاروبار میں ڈوبتا ہے تو شروع میں وہ دوبارہ کھڑا ہونے کے لیے ایڑھی چوٹی کا زور لگاتا ہے لیکن جب تنخواہ اور بچت کی آخری رقم بھی خرچ ہو جاتی ہے تو پھر بہت سے لوگ خودکشی کا انتخاب کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ اگر موجودہ معاشی بحران یونہی چلتا رہا تو خودکشی کے واقعات میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے۔

خودکشی کے واقعات کو روکنے کے لیے ایک این جی او نے فروری کے مہینے سے

ایسے مقامات کا گشت شروع کیا ہے جو خودکشی کے لیے مقبول سمجھے جاتے ہیں۔فروری کے مہینے میں اس تنظیم نے دو افراد کو بچایا جب کہ جون کے مہینے میں خودکشی کی کوشش کرنے والے سولہ افراد کو اس تنظیم نے بچایا ہے اور دوبارہ زندگی کی طرف راغب کیا ہے۔اس تنظیم کے ایک عہدیدار نے بتایا کہ حکومت نے معیشت کو بہتر بنانے اور زندگی کو آسان کرنے کے لیے کوئی اقدامات کیے ہیں لیکن یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ ان اقدامات سے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں۔

جاپان میں خودکشی کے واقعات کی اس بلند شرح کی ایک وجہ شاید یہاں کے لوگوں کے مذہبی عقائد بھی ہیں جو کہ زیادہ تر شنتو مذہب یا پھر بدھ مت سے متعلق ہیں، جن کی رو سے خودکشی حرام یا قبیح فعل نہیں بلکہ جائز اور بعض اوقات گناہوں کا کفّارہ بھی سمجھی جاتی ہے۔یہاں کی تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ خودکشی کی ایک رسم یہاں صدیوں تک قائم رہی جسے ''ہارا کیری'' یا ''پیٹ پھاڑنا'' کہتے ہیں۔اس رسم کے مطابق جب کوئی سپاہی، ریاست کا کوئی ذمہ دار فرد یا پھر عام شخص کوئی غلطی کر لیتا تو وہ کفارہ کے طور پر بادشاہ کے سامنے رضا کارانہ طور پر اپنی تلوار یا خنجر سے اپنا پیٹ کاٹ لیتا تھا۔اسے غلطی کا ازالہ سمجھا جاتا تھا خودکشی کے متعلق یہ عقیدہ جواب بظاہر متروک ہو چکا ہے شاید یہاں کے کچھ لوگوں کے تحت الشعور میں اب بھی کہیں باقی ہے، جو کہ جاپان کو دنیا میں خودکشی کی سب سے بلند شرح رکھنے والا ملک بناتا ہے۔

انسانی تاریخ میں اجتماعی خودکشی کا سب سے بڑا واقعہ بھی یہاں ہی پیش آیا تھا جب دوسری جنگ عظیم میں ایک جزیرے پر امریکی قبضہ ہو گیا تو چھ ہزار جاپانی فوجیوں نے ہتھیار ڈالنے کی بجائے خودکشی کر لی تھی۔

یاد رہے کہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے تک جاپان میں بادشاہ کو خدا کا اوتار ''خدا جیسا'' سمجھا جاتا تھا۔جنگِ عظیم میں شکست کے بعد بادشاہ نے ریڈیو پر قوم سے خطاب میں اعلان کیا تھا کہ وہ اب ''خدا کا اوتار'' نہیں ہے بلکہ ایک عام انسان ہے اس کے باوجود

یہاں عوام کی بادشاہ کے لیے عقیدت مذہبی نوعیت کی ہے۔

جاپان میں متعین امریکی افواج کے ترجمان نے یہ اعلان کیا ہے کہ اوکی ناوا جزیرے پر واقع امریکہ کے سب سے بڑے فوجی اڈے پر اگلے مہینے سے متعین ایسے امریکی فوجی جو کہ فیملی کے ساتھ رہتے ہیں لازمی طور پر چھاؤنیوں کے اندر رہائش پذیر ہونے کے پابند ہوں گے۔ امریکی فوج کے اس اقدام کو مقامی حکومتوں نے خوش آئند قرار دیا ہے لیکن مقامی لوگوں نے یہ شکایت کی ہے کہ غیر شادی شدہ امریکی فوجی نئے قانون کی زد میں نہیں آتے ہیں جن کے چھاؤنیوں سے باہر عام شہریوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے معاشرے میں مسائل پیدا ہو رہے ہیں جن کے تدارک کے لیے بہتر تھا کہ انہیں بھی چھاؤنیوں میں منتقل کر دیا جاتا۔ تاہم اس اقدام سے ایک طبقہ پریشان بھی ہے اور وہ ہیں رئیل اسٹیٹ ایجنٹ و پراپرٹی ڈیلر حضرات جن کو اندیشہ ہے کہ فوجیوں کے چھاؤنیوں میں منتقل ہونے سے کرائے کے گھروں کی مانگ کم ہو جائے گی جس سے ان کا کاروبار مندی کا شکار ہو سکتا ہے۔ امریکی ایئربیس کانیدا (Kaneda) کے مطابق ان کے پاس 83000 تراسی ہزار مکانات فوجی چھاؤنی پر موجود ہیں جن میں سے پندرہ فیصد 15% خالی ہیں۔ نئے قانون سے خالی مکانات کا تناسب کم ہو جائے گا۔ بظاہر امریکی فوج نے اس کی وجہ سالانہ تقریباً تین ارب ڈالر کی بچت بتائی ہے لیکن درحقیقت مقامی لوگوں کی مستقل شکایات ہی اس عمل کی اصل وجہ معلوم ہوتی ہے۔ ایک اور مقامی سٹی میئر نے امریکی افواج کے اس فیصلے کو سراہنے کے ساتھ ساتھ یہ شکایت بھی کی کہ زیادہ تر مسائل اور پریشانیوں کا سبب غیر شادی شدہ امریکی فوجی بنتے ہیں جو کہ سول آبادی میں رہتے ہیں اور چھاؤنی سے اپنے فوجی دوستوں کو بُلا کر رات دیر گئے تک غل غپاڑہ کرتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ جتنی جلدی ممکن ہو ان فوجیوں کو بھی چھاؤنی کے اندر منتقل کر دیا جائے۔ اوکی ناوا جو کہ یہاں سب سے بڑی امریکی چھاؤنی کا میزبان جزیرہ ہے، اس سال مارچ کے آخر میں وہاں امریکی فوجیوں اور ان کے اہل خانہ کی تعداد چھیالیس ہزار 46000 تھی، یہاں متعدد بار امریکی فوجیوں

کے مقامی خواتین کے ساتھ جنسی زیادتی کے سکینڈل سامنے آئے ہیں۔ واضح رہے کہ جنگِ عظیم دوم کے خاتمے کے بعد جاپان میں مستقل طور پر امریکی فوج کے اڈے قائم ہیں۔

قدرتی ماحول کے تحفظ اور تیل پر انحصار کم کرنے کے سلسلے میں کی جانے والی عالمی کوششوں میں جاپان کی تیسری بڑی کار ساز کمپنی ''نسان'' ایک بڑی خوشخبری لائی ہے۔ اس ہفتے نسان کمپنی نے بجلی سے چلنے والی کار نمائش کے لیے پیش کی جس کی خاص بات یہ ہے کہ ایک تو اس گاڑی میں دھوئیں کا اخراج بالکل صفر ہے اور دوسرا یہ کہ یہ بالکل خاموش اور بے آواز ہے۔ ٹوکیو میں کار کی رونمائی کے دوران صحافیوں سے باتیں کرتے ہوئے نسان کے چیف آپریٹنگ آفیسر نے کہا کہ ''صفر اخراج'' یعنی بغیر دھوئیں کے گاڑیاں بنانے میں نسان کمپنی مستقبل میں دنیا کی کار ساز کمپنیوں کی قیادت کرے گی۔

بجلی سے چلنے والی یہ کار اگلے سال جاپان اور امریکہ میں فروخت کے لیے پیش کر دی جائے گی۔ ایک بار مکمل بیٹری چارج کرنے پر یہ کار 160 کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ حریف کمپنیوں نے اس پر تنقید بھی کی ہے جیسا کہ ٹیوٹا کا کہنا ہے کہ اتنا کم فاصلہ طے کرنے کی صلاحیت کی وجہ سے اس کار کو شاپنگ کرنے یا شہر کے اندر چھوٹے موٹے کام کرنے کے لیے ہی استعمال کیا جا سکتا ہے اس لیے ٹیوٹا کی بنائی ہوئی ہائبرڈ (Hybrid) کار ہی ماحولیاتی مسئلے کا بہترین حل ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی دلچسپ ہوگا کہ ہائبرڈ گاڑیوں کے انجن چالیس یا پچاس کلومیٹر کی رفتار تک پٹرول استعمال نہیں کرتے بلکہ بیٹری سے چلتے ہیں اور ہائبرڈ گاڑیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ انہیں بیٹری چارج کرنے کے لیے باہر سے کوئی بجلی وغیرہ نہیں لینا پڑتی بلکہ اس کا انجن خود ہی بیٹری دوبارہ چارج کر دیتا ہے۔

بہرحال، بجلی سے چلنے والی بے آواز اور بغیر دھوئیں کے کار کی خصوصیات بتاتے ہوئے ترجمان نے میڈیا کو یہ بھی دکھایا کہ گاڑی آپ کو مستقل مطلع کرتی رہے گی کہ آپ گاڑی کی بیٹری سے مزید کتنے کلومیٹر کا فاصلہ طے کر سکتے ہیں۔ اگرچہ نسان کمپنی نے ابھی تک اس کار کی قیمت کا اعلان تو نہیں کیا ہے لیکن کمپنی کے ترجمان کا کہنا ہے کہ اس کی قیمت ڈیزل یا پٹرول سے چلنے والی عام کاروں کے برابر ہوگی۔

کاک ٹیل

یوں تو مختلف انواع و اقسام کی الکحل کے مرکب مشروب کو کاک ٹیل کہتے ہیں، مگر یہاں کاک ٹیل سے مراد مضمون میں شامل موضوعات کا متنوع ہونا ہے۔ ادب و صحافت میں بے جوڑ موضوعات پر لکھنا بدعت خیال کیا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی یہ بھی کرنا چاہیے۔ جاپان میں انگریزی زبان بولنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھنے والے افراد کا تناسب انتہائی کم ہے لیکن انگریزی زبان کی فلمیں یہاں بے حد مقبول ہیں۔ سینما گھروں میں نمائش کے لیے پیش کی جانے والی فلموں میں سے عام طور پر آدھی انگریزی زبان میں ہوتی ہیں۔ ہالی ووڈ کی فلموں کے لیے جاپان ایک بڑی مارکیٹ سمجھا جاتا ہے، اسی تناظر میں امریکی فلم ساز کمپنی والٹ ڈزنی اور جاپان کی پیناسونک کارپوریشن میں ایک معاہدہ ہوا ہے جس کی بدولت اب لوگ موبائل فون پر بھی ہالی ووڈ کی فلموں سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔ دونوں کمپنیوں کے اشتراک سے اب فلمیں ایس- ڈی- کارڈ یا میموری چپ(Memory Chip) پر دستیاب ہوں گی جنہیں عام موبائل فون کے علاوہ کار کے نیوی گیشن پر بھی دیکھا جا سکے گا۔ والٹ ڈزنی کمپنی کو توقع ہے کہ اس معاہدے سے اس کی فلموں کی فروخت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا جبکہ پیناسونک کو امید ہے کہ اس معاہدے کے نتیجے میں اس کے بنائے ہوئے میموری کارڈ فلم دیکھنے کے لیے ایک معیار بن جائیں گے۔

معاہدے کے مطابق اس برس موسم خزاں تک والٹ ڈزنی کی فروخت کے لیے پیش کی جانے والی فلم کی(DVD) ڈی وی ڈی کے پیکٹ میں میموری کارڈ بھی موجود ہوگا۔

یاد رہے کہ پیناسونک کارپوریشن دیگر الیکٹرونکس کے علاوہ فلیٹ سکرین ٹیلی ویژن، ویڈیو کیمرہ اور اس طرح کی دیگر مصنوعات کے لیے میموری کارڈ بناتی ہے۔

جاپان کے وزیراعظم تاروآسو نے اسمبلی تحلیل کر کے اگست کی 30 تاریخ کو نصف مدتی انتخابات کروانے کا اعلان کیا ہے۔اس فیصلے کی وجہ گزشتہ دنوں ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں حکمران جماعت کی غیر متوقع شکست بتائی گئی ہے۔ نئے انتخابات کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں گزشتہ پچاس سال سے ملک پر حکمرانی کرنے والی جماعت شکست کھاتی ہوئی نظر آرہی ہے۔حکمران جماعت کی مسلسل گرتی ہوئی مقبولیت کی وجہ تجزیہ نگار موجودہ وزیراعظم کی پالیسیوں میں عدم تسلسل اور معاشی بحران سے نمٹنے میں ناکامی بتاتے ہیں۔

ملائیشیا کے سابق صدر مہاتیر محمد جاپان میں بہت مقبول ہیں جس کی وجہ ان کی اپنے دورِ حکومت میں ''مشرق کی طرف دیکھ'' پالیسی رہی ہے۔جس سے ان کی مراد جاپان اور جنوبی کوریا کا معاشی ڈھانچہ تھا، مہاتیر محمد نے ملائیشیا کی ترقی کے لیے مغرب کی بجائے جاپان اور کوریا کو رول ماڈل اور قابل تقلید نمونہ قرار دیا تھا۔ جاپان پر ایٹم بم گرائے جانے کی سالانہ تقریب میں شرکت کے لیے پہلی دفعہ وہ یہاں آرہے ہیں جس کا یہاں کے میڈیا میں بہت چرچا ہے مہاتیر محمد کے علاوہ 56 چھپن ملکوں کے مندوبین ہیروشیما میں ہونے والی اس تقریب میں شرکت کریں گے جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔علاوہ ازیں جنرل اسمبلی کے صدر بھی اس تقریب میں شرکت کریں گے۔ ہیروشیما دنیا کا پہلا شہر ہے جس پر ایٹم بم گرایا گیا۔ ہیروشیما پر بم گرانے کے تین دن بعد یعنی 19 اگست 1946 کو امریکی طیارے سے ناگاساکی پر بھی ایٹم بم گرایا گیا تھا۔

بزرگ شہریوں کے لیے خوشخبری ہے کہ ٹوکیو یونیورسٹی اور چند دیگر تحقیقی اداروں نے مشترکہ طور پر تحقیق کے بعد انکشاف کیا ہے کہ دنیا میں نئے پھوٹنے والے انفلوئنزا فلو سے وہ لوگ متاثر نہیں ہوں گے جو کہ 1918ء یا اس سے پہلے پیدا ہوئے ہیں۔دیگر لفظوں میں اپنی عمر کی نوے بہاریں دیکھ چکے لوگوں کو

نئے فلو سے کوئی خطرہ نہیں ہے مگر دیگر تمام لوگ برابر خطرے میں جی رہے ہیں۔ٹوکیو یونیورسٹی کے پروفیسر کھاوااوکا کی سربراہی میں ہونے والی تحقیق میں شامل ٹیم کا کہنا ہے کہ 1918 میں چونکہ سپین میں تاریخ کی سب سے ہلاکت خیز وبائی وائرس پھیلا تھا اس لیے اس سال یا اس سے پہلے پیدا ہونے والے افراد میں اس کے خلاف قدرتی مدافعت موجود ہے لہٰذا وہ انفلوئینزا فلو سے محفوظ ہیں۔اس تحقیق کو برطانیہ سے جاری ہونے والے سائنسی جریدے ''نیچر'' نے اس ہفتے شائع کیا ہے۔

جاپان کی ثقافت کو سمجھنے کے لیے آپ کو باقی دنیا کے متعلق ثقافتی اور سماجی معلومات شاید بہت زیادہ مدد نہ دے سکیں گی کیونکہ یہاں کے اخلاقی معیار اپنے ہیں جن پر یہاں کا معاشرہ بہت سختی سے کاربند ہے۔مثال کے طور پر جھوٹ بولنا پوری دنیا میں برا سمجھا جاتا ہے لیکن جاپان میں جھوٹ بولنا کتنا برا خیال کیا جاتا ہے اس کو سمجھنے کے لیے گزشتہ روز عدالت کی طرف سے دیا جانے والا یہ فیصلہ ہماری مدد کرے گا جس میں عدالت نے ایک اٹھاون سالہ تعمیراتی کمپنی کے ٹھیکیدار کو تین سال قید کی سزا سنائی ہے۔ ٹھیکیدار کا جرم یہ تھا کہ اس نے مقامی ٹی وی کے ایک نیوز پروگرام میں یہ الزام لگایا تھا کہ ضلع گیفو کی مقامی حکومت سرکاری فنڈ خرد برد کرنے کے علاوہ ان کا غلط استعمال کرنے کی مرتکب ہوئی ہے۔یہ انٹرویو پچھلے سال نومبر میں مقامی ٹی وی پر نشر ہوا جس کے بعد مقامی حکومت نے اس الزام کی اپنے طور پر تحقیق کی، جب تحقیق مکمل ہوئی اور انہیں خرد برد یا بے ضابطگی کا کوئی بھی ثبوت نہ ملا تو مقامی حکومت نے اس سال فروری کے مہینے میں پولیس کے پاس شکایت درج کرا دی جس کے بعد ٹھیکیدار نے مقامی ٹی-وی پر آ کر اعتراف کر لیا کہ اس نے جھوٹ بولا تھا اور مقامی حکومت سے معافی مانگی۔ٹھیکیدار کے اس اعتراف کے بعد مذکورہ ٹی وی سٹیشن کے صدر نے اپنے ادارے کی طرف سے غیر ذمہ دارانہ رویے پر اپنی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے مارچ میں استعفیٰ دے دیا۔مذکورہ ٹی وی کے جس میزبان نے یہ انٹرویو کیا تھا اس نے سکرین پر آ کر تمام ناظرین اور مقامی حکومت کے کارکنوں سے معافی مانگی لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ کیس عدالت میں چلا گیا اور مذکورہ ٹھیکیدار کو جھوٹا الزام لگانے کے جرم میں

گزشتہ روز تینسال قید کی سزا سنا دی گئی جو کہ معطل ہے۔معطل سزا کا مطلب یہاں یہ ہوتا ہے کہ مجرم

کوفوری طور پر جیل نہیں بھیجا جاتا بلکہ جرم کا راستہ ترک کرنے کا موقع دیا جاتا ہے اور اگر مجرم دوبارہ کوئی جرم کرے تو پھر نئے جرم کی سزا کے ساتھ ساتھ پرانی سزا بھی جمع ہو جاتی ہے۔

عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ یاسو ہیرو نامی ٹھیکیدار نے مقامی حکومت کے کام میں خلل ڈالا اور اس کے ملازمین کو بہت محنت کرنا پڑی اور توانائی خرچ کرنا پڑی تاکہ وہ ثابت کرسکیں کہ ان پر لگائے گئے الزامات جھوٹے ہیں۔ جج نے مزید لکھا کہ مذکورہ ٹھیکیدار خودغرض شخص ہے جس نے ذاتی مفاد کے لیے جھوٹا الزام تراشا۔ گزشتہ روز عدالتی فیصلے کے بعد مقامی ٹی وی نے ایک بار پھر اپنے ناظرین اور مقامی حکومت کے کارکنوں سے معافی مانگی ہے اور وعدہ کیا ہے کہ آئندہ خبریں نشر کرنے میں زیادہ احتیاط برتیں گے۔

ابنِ انشاء نے جاپانیوں کی سادگی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر آپ کسی جاپانی کے سامنے جارج پنجم کا رشتہ دار ہونے کا دعویٰ کریں تو وہ بالکل شک نہیں کرے گا اور یقین کرلے گا۔ ابن انشاء نے بجا لکھا حقیقتاً ایسا ہی ہے لیکن اس کی وجہ جاپانیوں کی سادگی نہیں بلکہ معاشرے میں جھوٹ کی عدم موجودگی ہے۔

یہ بھی کوئی الیکشن تھا

جاپان میں آج کل موسم کے ساتھ ساتھ سیاست بھی خوب گرم ہے۔ چند ہی روز بعد جاپانی عوام نئی پارلیمان اور وزیراعظم منتخب کرنے والے ہیں۔ ان انتخابات کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ پچھلے پچاس سال سے زائد عرصے تک ملک پر مسلسل حکمرانی کرنے والی جماعت ہارتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ اکثر تجزیے اور سروے بتاتے ہیں کہ اپوزیشن جماعت ڈیموکریٹک پارٹی اس بار بازی لے جائے گی۔ سچ پوچھیں تو ایک پاکستانی ہونے کے ناتے مجھے یہ الیکشن بالکل بور، بے رنگ اور بے کیف لگ رہے ہیں۔ پورے ملک میں کسی بھی جگہ کوئی بھی وال چاکنگ نہیں کی گئی نہ ہی کہیں کوئی بینر نظر آتا ہے۔ کسی بھی گھر کی دیوار یا عمارت پر پوسٹر تک کا نام ونشان نہیں ہے۔ میونسپلٹی کی طرف سے مخصوص جگہوں پر انتخابی ہورڈنگ لگائے گئے ہیں جن کو لکیروں کی مدد سے کئی خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر امیدوار اور پارٹی اپنے مخصوص خانے میں اپنا پوسٹر چسپاں کرتی ہے۔ کسی کو ایک سے زیادہ پوسٹر لگانے کی اجازت قانوناً نہیں ہوتی یا پھر وہ اخلاقاً نہیں لگاتے۔ حالانکہ تمام ہورڈنگز آدھے سے زیادہ خالی ہونے کی وجہ سے ویران ویران سے لگتے ہیں۔ پینافلیکس کو سیاسی مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے انہیں یا تو یہ بات معلوم ہی نہیں یا پھر الیکشن کمیشن کی طرف سے پابندی ہے۔ ہاں البتہ پلے کارڈ کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں جو عموماً کسی دکاندار یا پھر اہل خانہ نے لٹکانے کی اجازت دے دی ہوتی ہے۔ یہاں پر سیاسی پارٹیوں کے جھنڈے نہیں ہوتے صرف جاپان کا قومی پرچم ہی لہرایا جاتا ہے۔ دوسرا کوئی بھی

پرچم سرے سے موجود ہی نہیں البتہ دوسری جنگِ عظیم تک رہنے والا جاپان کی فوج کا پرچم اب بھی انتہائی دائیں بازو کی جماعتیں استعمال کرتی ہیں۔ سیاہ رنگ کی بکتر بند ٹائپ گاڑیوں میں لاؤڈ سپیکر پر جنگی ترانے بجاتے ہوئے ان کے کارکن موسم بے موسم جنگی پرچم لہراتے رہتے ہیں جو کہ قانونی طور پر ممنوع ہے۔

اب جبکہ انتخابی مہم اپنے آخری مرحلے میں ہے لیکن سب سے مقبول پارٹیوں کے قائدین کے جلسوں کا یہ حال ہے کہ ان میں ایک ہزار آدمی بھی نہیں ہوتے۔ ویسے تو ایک سو لوگوں پر مشتمل جلسہ بھی یہاں بہت بڑا اور کامیاب جلسہ شمار ہوتا ہے لیکن اس طرح کے جلسے بھی صرف مرکزی قائدین کا خاصہ ہیں۔ عام امیدواروں کی رابطہ عوام مہم ذرا مختلف انداز سے ہوتی ہے۔ ہر امیدوار ہائی ایس ویگن یا سوزوکی ڈبے کی طرز کی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر براجمان ہوتا ہے اور اس کے سپوٹرز پچھلی سیٹوں پر بیٹھے، گاڑی کے پچھلے شیشے کھول کر آنے جانے والے لوگوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر سلام کر رہے ہوتے ہیں۔ تمام سپوٹرز نے ایک سی یونیفارم پہنی ہوتی ہے جس پر جگہ جگہ امیدوار اور پارٹی کا نام لکھا ہوتا ہے۔ گاڑی کی چھت پر سپیکر نصب ہوتا ہے جس سے مسلسل امیدوار اور پارٹی کے لیے ووٹ دینے کی گزارش نشر کی جاتی ہے۔ انتخابی مہم کی یہ گاڑی عام گاڑیوں کی رفتار سے گلی، محلوں اور سڑکوں پر گشت کرتی ہے۔ ٹریفک کا سگنل سرخ ہونے پر یہ باقی گاڑیوں کے ساتھ ہی کھڑی ہو جاتی ہے اور انتخابی امیدوار اپنی تقریر شروع کر دیتا ہے۔ گاڑی کے اندر بیٹھے سپوٹرز پھرتی سے گاڑی سے باہر نکلتے ہیں۔ کبھی کبھی سگنل پر کھڑی گاڑیوں میں ہینڈ بل تقسیم کرتے ہیں یا پھر ہاتھ ہلا ہلا کر سب کو سلام کرتے ہیں۔ ٹریفک کی بتی سبز ہوتے ہی سپوٹرز گاڑی کے اندر بیٹھ جاتے ہیں اور خطاب ختم ہو جاتا ہے۔ انتخابی امیدوار کی گاڑی باقی گاڑیوں کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور کسی اگلی سرخ بتی کا انتظار کرتی ہے تا کہ جلسہ کیا جا سکے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ سیاسی ورکر یہاں رضا کارانہ طور پر کسی لیڈر کے لیے کام نہیں کرتے بلکہ یہ امیدوار سے روزانہ کی بنیاد پر سیاسی مہم چلانے کی تنخواہ وصول

کرتے ہیں۔ کچھ زیادہ ہوشیار امیدوار اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ایسی جگہوں کا انتخاب کرتے ہیں جہاں پر مستقل رش رہتا ہے جیسے ریلوے اسٹیشن، بس سٹینڈ اور پارک وغیرہ۔ ان جگہوں پر امیدواروں کو ایسے سامعین میسر آ جاتے ہیں جو کسی کے انتظار میں بیٹھے ہوتے ہیں یا پھر ان کی بس یا گاڑی آنے میں ابھی وقت باقی ہوتا ہے۔ الیکشن کے دنوں میں اکثر امیدوار کھانا کھانے کے لیے ایسی جگہوں کا انتخاب کرتے ہیں جو عوام میں کھانا کھانے کے لیے مقبول ہوں اور وہاں لوگوں کی بھیڑ رہتی ہو۔ امیدوار کی کوشش ہوتی ہے کہ کھانا کھانے والے لوگوں سے فرداً فرداً ملے اور کھانے کے بعد یہ ضرور کہتے ہیں کہ یہاں کھانا بہت ہی مزیدار ہوتا ہے۔

پاکستان کی طرح یہاں بھی پارلیمانی نظام جمہوریت ہے۔ حکومت کا سربراہ وزیر اعظم ہوتا ہے جبکہ ملک کا سربراہ بادشاہ ہے۔ ایوانِ نمائندگان میں نشستوں کی تعداد 480 ہے۔ جن میں سے 300 کا انتخاب ان کا انتخابی حلقہ براہِ راست کرتا ہے جبکہ بقیہ 180 نشستوں کو ہر پارٹی کے حاصل کردہ ووٹوں کے تناسب سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ جنہیں سیاسی پارٹیاں اپنے نامزد کردہ لوگوں میں تقسیم کر دیتی ہیں۔ یہ طریقۂ انتخاب بالکل ایسا ہی ہے جیسے پاکستان میں خواتین کی نشستوں کے سلسلے میں اختیار کیا جاتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ یہاں ہر ووٹر دو ووٹ ڈالتا ہے۔ ایک اپنے پسندیدہ امیدوار کو اور دوسرا اپنی پسندیدہ پارٹی کو۔ اس لیے ہر پارٹی اپنے حاصل کردہ ووٹوں کے تناسب سے ہی مخصوص نشستوں میں سے اپنا حصہ لے پاتی ہے۔ براہِ راست منتخب ہونے والے امیدواروں کے ووٹوں یا ان کی نشستوں کی تعداد کا مخصوص نشستوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کئی امیدوار حالیہ الیکشن میں بھی براہِ راست اپنے حلقوں سے بھی الیکشن لڑ رہے ہیں اور وہ مخصوص نشستوں پر بھی امیدوار ہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ کسی بھی پارٹی کا سربراہ یا اہم رہنما دو نشستوں سے امیدوار نہیں ہے۔

ہمارے ہاں اکثر انتخابی امیدواروں کی اہلیت زیرِ بحث رہتی ہے لیکن یہاں پر ووٹر بھی نااہل قرار پا جاتا ہے اگر وہ کسی بھی فوجداری جرم میں سزا یافتہ ہو۔ ایسے ہی ایک 62

سالہ شخص نے 30 اگست کو ہونے والے انتخابات میں ووٹ ڈالنے کے لیے نا اہل قرار دیے جانے پر مقامی الیکشن کمیشن کے خلاف عدالت میں درخواست دائر کی ہے۔ مذکورہ شخص کے وکیل نے بتایا کہ اس نے پہلے الیکشن کمیشن میں درخواست دائر کی تھی کہ اس کے مؤکل کا نام ووٹر لسٹ میں بحال کیا جائے کیونکہ سپریم کورٹ نے اسے بے گناہ قرار دے دیا ہے لیکن الیکشن کمیشن نے یہ کہہ کر درخواست مسترد کر دی کہ ایک بار اگر سپریم کورٹ کسی شخص کو سزا سنا دیتی ہے تو وہ سزا بے شک معاف ہو جائے یا پھر نظرِ ثانی کی اپیل میں معطل کر دی جائے، الیکشن کمیشن ایسے ووٹر کو بہر حال سزا یافتہ ہی تصور کرتا ہے اور ووٹ ڈالنے کے لیے نا اہل شمار کرتا ہے۔ اب جبکہ الیکشن میں چند دن باقی ہیں دیکھیں عدالت کیا فیصلہ کرتی ہے۔ یاد رہے کہ یہ الیکشن اس لیے منعقد ہو رہے ہیں کہ حکمران جماعت بلدیاتی انتخابات میں اپوزیشن پارٹی سے ہار گئی تھی اس لیے جماعت کی قیادت نے یہ فیصلہ کیا کہ کیونکہ بلدیاتی الیکشن میں وہ ٹوکیو سمیت زیادہ تر شہروں سے شکست کھا گئے ہیں اس لیے مناسب ہوگا کہ وہ دوبارہ عوام کے پاس جائیں اور ان سے رائے لیں کہ وہ اب بھی حکمران جماعت پر اعتماد رکھتے ہیں کہ نہیں۔ لگتا یہی ہے کہ نتیجہ نہیں میں ہی نکلے گا، ویسے کیا کبھی پاکستان میں بھی جمہوریت اتنی مضبوط ہوگی اور ارتقاء کی اس منزل پر پہنچے گی کہ ایک بلدیاتی معرکے میں شکست کھانے کے بعد حکمران جماعت اپنا اقتدار چھوڑ دے اور دوبارہ عوام سے رجوع کرنے کا قصد کرے؟ سوچنے کی بات ہے کہ پاکستان میں لوگ انتخابی عمل میں اتنی زیادہ دلچسپی کیوں لیتے ہیں؟ اور یہاں سیاست سے ایسی بے خبری اور عدم دلچسپی کیوں پائی جاتی ہے کہ آبادی کے ایک قابل ذکر حصے کو اپنے وزیر اعظم کا نام بھی نہیں معلوم، اور وہ اس پر شرمندہ بھی نہیں ہوتے بلکہ یہ عذر پیش کریں گے کہ انہیں سیاست میں دلچسپی نہیں یا پھر یہ کہ آج کل کام کی مصروفیت زیادہ ہے اس لیے وزیر اعظم کون ہے انہیں نہیں معلوم۔ اس تضاد کی وجہ شاید ہمارے لوگوں کے مسائل اور سیاست سے وابستہ ان کی امیدیں ہیں۔ لوگوں کے مسائل چونکہ بہت زیادہ اور شدید نوعیت کے ہیں اس لیے ان کی حکومتوں سے توقعات اور امیدیں

بھی بہت زیادہ ہوتی ہیں، جبکہ یہاں کوئی بھی حکومت آئے یا جائے عام آدمی کی زندگی پر اس کا کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اسی لیے یہاں نہ تو ریلیاں نکلتی ہیں، نہ بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں اور نہ ہی ڈھول پٹاخوں سے لیس جلوس نظر آتے ہیں مگر پاکستانی ہونے کے ناتے مجھے تو یہاں کا الیکشن بالکل پھیکا، بے رنگ، اجڑا اجڑا اور بے مزہ لگ رہا ہے۔ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چلے جائیں لگتا ہی نہیں کہ بس کچھ دن بعد یہاں کوئی بہت بڑا انتخابی معرکہ ہونے والا ہے۔

پاکستانی ادیبوں کا دورۂ جاپان

جاپان کا تصور پاکستان میں رہنے والے لوگوں کے لیے ایک جدید ٹیکنالوجی والے طلسم ہوشربائی الگ تھلگ ملک کا ہے۔ باوجود اس کے کہ جاپان میں رہنے والے پاکستانیوں کی تعداد دس ہزار کے قریب ہے اور اس ملک میں رہنے والے غیر ملکیوں میں پاکستانی کیمونٹی معاشی طور پر سب سے زیادہ مضبوط اور فعال کہی جاسکتی ہے لیکن دونوں ملکوں کے درمیان ادبی اور ثقافتی رابطے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پاکستان اور جاپان کے ادبی اور ثقافتی تعلقات کو فروغ دینے کے لیے اس سال کے اوائل میں کچھ ادبی و علمی ذوق رکھنے والے پاکستانیوں اور پاکستان کے ادب اور ثقافت سے دلچسپی رکھنے والے جاپانیوں کی کوششوں سے پاکستان جاپان حلقۂ ادب وثقافت کا قیام عمل میں آیا، مجھے اس تنظیم کا جنرل سیکرٹری ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اسی تنظیم کی دعوت پر گزشتہ دنوں پاکستان کے کچھ نامور دانشوروں اور ادیبوں نے جاپان کا دورہ کیا جن میں محمود شام، عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد شامل ہیں۔ ویسے تو اس دورے کے متوقع شرکاء میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا نام بھی شامل تھا لیکن وہ بوجۂ ناسازئ طبع جاپان تشریف نہ لاسکے۔ یہ کسی پاکستانی ادبی وفد کا اپنی طرز کا پہلا دورہ تھا۔ اس وفد کی آمد سے قبل ابن انشاء اور حکیم سعید جیسے نامور لکھاری جاپان آئے تو ضرور اور اپنے سفر کا احوال بھی لکھتے رہے مگر سب فرداً فرداً، نیز کسی کا بھی جاپان میں مقیم پاکستانی کیمونٹی سے مکالمہ نہیں ہوا تھا۔ اس دورے کا آغاز اسلامک سرکل آف جاپان کے ایک مذاکرے سے ہوا جو کہ ٹوکیو کی مسجد حراء میں منعقد ہوا۔ محمود شام نے اسے نیک شگون قرار دیا کہ دورے کا پہلا پروگرام ہی مسجد میں ہوا ہے، مہمانوں کو لے کر ہم

ایئر پورٹ سے سیدھے مسجد پہنچے تھے۔ میرے ساتھ میرے بڑے بھائی حاجی عابد حسین بھی تھے۔ رات کا وقت تھا اس لیے مسجد سے فراغت کے بعد مہمانوں کو ہوٹل لے گئے تا کہ آرام کر سکیں۔ٹوکیو کا عالمی مشاعرہ اور مذاکرہ پہلے دن کا سب سے اہم پروگرام تھا جس میں پاکستانی ادیبوں اور سامعین کے علاوہ جاپانی طلباء نے بھی بھرپور شرکت کی۔ مقامی شعراء میں ڈاکٹر فخر الحق نوری، عبدالرحمٰن صدیقی، سلیمان بخاری، مظہر دانش اور شوہے کے علاوہ راقم بھی شامل تھے۔ مشاعرے کی صدارت امتیاز احمد گوندل نے کی جو کہ پاکستان ایسوسی ایشن جاپان کے صدر ہیں۔ نظامت کے فرائض راقم اور مظہر دانش نے ادا کیے۔ اس مشاعرے کے بعد مذاکرے کا بھی انعقاد کیا گیا جس میں محمود شام، عطاءالحق قاسمی اور امجد اسلام امجد کے علاوہ مقامی دانشوروں ہیروجی کتاؤ کا اور نی شی موراشوہے نے بھی اظہارِ خیال کیا شوہے نے اپنی تقریر میں کہا کہ انہیں پاکستان کا مشترکہ خاندانی نظام بہت پسند ہے۔ جس میں سب ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ جاپان کے لوگوں کو چاہیے کہ وہ امریکہ اور مغرب کی پیروی کرنے کی بجائے پاکستان سے اچھی چیزیں سیکھے اور دوسرے مشرقی ممالک سے بھی۔ یاد رہے کہ ان اساتذہ اور طلباء نے اظہار خیال اردو زبان میں کیا تھا ناں کہ جاپانی زبان میں تقریب کے اختتام میں امتیاز احمد گوندل اور ملک حبیب الرحمٰن کے علاوہ جاپان میں پاکستانی سفارت خانے کے پریس اتاشی عبدالواحد خان نے بھی خطاب کیا، ٹوکیو کے بعد جاپان کے شمالی ساحلی شہر تویاما (Toyama) کے ایک فائیوسٹار ہوٹل میں محفل مشاعرہ برپا ہوئی اس شہر میں مشاعرے کی اہم وجہ یہ تھی کہ ٹوکیو کے گردونواح کے بعد پاکستانیوں کی سب سے بڑی تعداد اس شہر میں بستی ہے۔ اس شہر میں بسنے والے تقریباً تمام پاکستانی ری کنڈیشن گاڑیوں کے کام سے منسلک ہیں اور یہاں سے گاڑیاں روس بھجواتے ہیں۔ روس سے خریدار خود بحری جہازوں میں بیٹھ کر آتے ہیں۔ اپنے ساتھ عموماً یہ جہاز لکڑی لاتے اور واپسی پر گاڑیاں لے جاتے ہیں۔ محمود شام، عطاءالحق قاسمی اور امجد اسلام امجد کے علاوہ اوساکا (Osaka) یونیورسٹی کے

شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر فخر الحقد نوری نے بھی اس مشاعرے میں خصوصی شرکت کی اور مہمان شعراء کے برابر داد سمیٹی۔ محمود شام نے اپنی نظم ''وانا'' پر بہت داد پائی اور عطاء الحق قاسمی کی غزل

ظلم بچّے جَن رہا ہے کوچہ و بازار میں
عدل کو بھی صاحبِ اولاد ہونا چاہیے

لوگوں نے بار بار سننے کی فرمائش کی۔ امجد اسلام امجد کو یوں تو ہر بار بے پناہ داد ملی لیکن اس غزل پر محفل کا رنگ دیدنی تھا۔

مرنے کا ترے غم میں ارادہ بھی نہیں ہے
ہے عشق مگر اتنا زیادہ بھی نہیں ہے

اس مشاعرے کی صدارت امتیاز احمد گوندل نے کی جبکہ مہمان خصوصی ملک حبیب الرحمان تھے۔ نظامت کے فرائض مظہر دانش اور راقم نے ادا کیے۔

اوسا کا (Osaka) یونیورسٹی کا پروگرام اردو ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ ماتسومورا (Matsmura) کے ساتھ سویامانی (So Yamany) نے ترتیب دیا تھا۔ اس پروگرام میں طلباء کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی اور سب نے پاکستانی لباس، شلوار قمیض پہن رکھا تھا اور جاپانی طلبہ و طالبات پر شلوار قمیض بہت بچ رہا تھا۔ ایک طالب علم ناکامورا نے طبلہ سرائی کی اور چند طلباء نے پھر مشہور پاکستانی گانا جانِ بہاراں، رشکِ چمن، غنچہ دہن شیریں بدن، اے جانِ من پیش کیا۔ اس کے بعد امجد اسلام امجد، محمود شام اور عطاء الحق قاسمی نے اظہار خیال کیا۔ آخر میں مشاعرے کا سماں بن گیا جس میں مہمان شعراء کے علاوہ راقم نے اپنا کلام پیش کیا۔

دائتوبُن کا یونیورسٹی سائی تاما (Saitama) نے جاپانی سکالرز کے ساتھ میٹنگ کا اہتمام کیا جس کا انتظام و انصرام ہیرو جی کتاؤ کا کے ساتھ مظہر دانش اور عبدالرحمٰن صدیقی نے کیا۔ یہ یونیورسٹی پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ گہرے مراسم رکھتی ہے اور دونوں یونیورسٹیوں کے درمیان ہر سال اردو کے طالب علموں کا تبادلہ بھی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں پاکستانی اساتذہ بھی اردو کے شعبے میں تدریس کے فرائض سرانجام

دے رہے ہیں۔ پاکستان سے آئے ہوئے دانشوروں کے دورے کا آخری مرحلہ ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز کا دورہ تھا جس کا اہتمام پروفیسر یوتا کا اسادا نے کیا تھا۔ دورے کے اختتام پر الکرم ریستوران میں پھر ایک مشاعرہ ہوا جس میں پاکستانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے شرکت کی۔ رات کے کھانے کا اہتمام جاپان میں معروف پاکستانی ریستوران چین (Chain) صدیق ریسٹورنٹ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ قاسمی صاحب کے بقول آخری مشاعرہ ''کھڑکی توڑ'' تھا۔ غیر جانبدار پاکستانیوں کا بھی یہی تاثر تھا کہ اس وفد کے اعزاز میں ہونے والے تمام اجتماعات میں لوگوں کا ریکارڈ رش تھا۔

پاکستانی ادیبوں کا یہ دورہ جاپان کی تاریخ میں کسی بھی پاکستانی ادبی وفد کا اپنی طرز کا پہلا دورہ تھا جس میں جاپان کی تین بڑی یونیورسٹیاں جن میں اردو پڑھائی جاتی ہے اس میں میزبان تھیں اور جاپان میں رہنے والے پاکستانیوں کے لیے بھی اس میں دلچسپی اور شرکت کا بھرپور موقع فراہم کرنے کے لیے تین شہروں میں بڑے بڑے مشاعروں اور مذاکروں کا اہتمام کیا گیا تھا۔

اس دورے کے متعلق امجد اسلام امجدؔ نے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ ''چلو جاپان چلتے ہیں'' کے نام سے شائع ہونے والا یہ سفرنامہ پڑھ کر آپ ہمارے ملک کے ان دانشوروں کی یہاں مصروفیات اور احساسات کو تفصیل سے جان سکتے ہیں۔ اس وفد کی میزبانی کرنا میرے لیے ایک ناقابل فراموش اور حسین تجربہ تھا۔ امجدؔ صاحب نے تو اپنی کتاب میں اس دورے کے اہتمام و کامیابی کا سہرا میرے سر پر باندھا ہے مگر میں سمجھتا ہوں اس میں میرے دوستوں کی محنت مجھ سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ پاکستان اور جاپان کے درمیان بہتر تعلقات کے لیے ہماری طرف سے کی جانے والی یہ کوشش چاہے حقیر سہی لیکن پھر بھی میرے لیے قابلِ فخر ہے۔ بقول احمد فراز، کہ جن کی میزبانی کا شرف بھی مجھے حاصل رہا۔

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو یہی بہتر تھا؟
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

سو یامانے پاکستان واپس جارہاہے

سویامانے اوسا کا یونیورسٹی میں اردو کا پروفیسر ہے۔ چند سال پہلے پاکستان سے ادیبوں کا ایک وفد جاپان آیا تھا جس میں عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجدؔ اور محمود شام وغیرہ شامل تھے جن کی میزبانی کا شرف ہمیں حاصل ہوا تھا۔اس وفد کی یہاں مصروفیات میں اُن تین یونیورسٹیوں کا دورہ بھی شامل تھا جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے۔سویامانے سے پہلی ملاقات اسی دورہ کے دوران اوسا کا یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ہوئی۔جس دن مذکورہ وفد نے اوسا کا یونیورسٹی کا دورہ کیا اس دن یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے تمام طلباء وطالبات جن کی تعداد بیس سے زیادہ تھی پاکستانی مہمانوں کے اعزاز میں شلوار قمیض پہن کر آئے تھے۔ پاکستانی سازوں پر ان طلباء وطالبات نے اردو کے ملی نغمے پیش کیے۔عطاء الحق قاسمی تو اتنے متاثر ہوئے کہ اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اگر میرے بیٹوں کی شادیاں نہ ہوئی ہوتیں تو میں ان کے لیے دلہنیں یہاں سے لے کر جاتا۔

اپنے تجسس سے مغلوب ہوکر، ذرا کریدنے پر پتا چلا کہ پاکستان اور اردو زبان سے محبت کے اظہار کے لیے منعقد کیے گئے ان رنگارنگ پروگرامز کا روحِ رواں شعبۂ اردو کا استاد سویامانے ہے جس نے اس استقبالیے کو ''محفلِ اردو'' کا نام دیا تھا۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی پتا چلا کہ اس نے اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پڑھی ہے۔وہ کئی سال لاہور میں نہ صرف مقیم رہا ہے بلکہ اب بھی مسلسل آتا جاتا رہتا ہے، امجد اسلام امجدؔ نے بتایا کہ سویامانے اردو کے علاوہ پنجابی بھی بڑی روانی سے بولتا ہے تو اس پر سویامانے نے بڑی

ٹھیٹ پنجابی میں کہا کہ ''مینوں نئیں آندی'' جس پر تمام پاکستانی مہمانوں نے بے ساختہ قہقہے بلند کیے۔ وہ ایسا شخص ہے جسے پاکستان سے اتنا لگاؤ ہے کہ اس کے موسموں، تہواروں اور پھلوں سبزیوں تک کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔ پچھلی گرمیوں میں اس کی طرف سے ایک پوسٹ کارڈ ملا جس پر لکھا تھا کہ ''پاکستان جائیں تو میری طرف سے آم ضرور کھائیں'' یاد رہے کہ حفظانِ صحت کے کچھ تحفظات کے باعث پاکستانی آم کی یہاں درآمد پر پابندی تھی لیکن اس سال یہ پابندی ختم ہوگئی ہے ورنہ شاید وہ آم کھانے کی بجائے مجھ سے آم لانے کی فرمائش کر سکتا تھا۔

گزشتہ روز میں ایک نشریاتی کردار جارج کے بارے میں پڑھ رہا تھا کہ جارج نے پاکستان چھوڑ دیا ہے۔ جارج پاکستان سے محبت کرنے والا ایک غیر ملکی تھا جس کی پاکستان کے ساتھ وابستگی اور محبت دیکھ کر اس وقت کے وزیراعظم شوکت عزیز نے اسے پاکستانی شہریت دے دی تھی۔ ''جارج کا پاکستان'' نامی ٹیلی وژن پروگرام سے ہمارے ہاں شہرت پانے والے جارج فولٹن نے برطانوی اخبار میں پاکستان کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے۔ اپنے تازہ مضمون ''جارج کا خدا حافظ'' میں اس نے پاکستان کو ایک محبوبہ کی طرح مخاطب کیا ہے اور اسے طلاق دینے کا اعلان کیا ہے، جس کی وجہ اس نے ملک میں پھیلتی ہوئی انتہا پسندی کو قرار دیا ہے۔ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ افسردہ کیا وہ جارج فولٹن کا یہ کہنا تھا کہ اب پاکستان ایک ناکام ریاست بننے جا رہا ہے اور اس کے ناکام ریاست بننے میں بہت تھوڑا فاصلہ باقی رہ گیا ہے۔ میرا یقین ہے کہ پاکستان ہمیشہ قائم رہنے کے لیے وجود میں آیا ہے۔ انتظامیہ اور قیادت کی ناکامی ریاست کی ناکامی ہرگز نہیں ہوتی۔

ذاتی زندگی میں جو لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی ناکامیوں کو بھی تسلیم کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتے ہیں ان لوگوں کو پاکستان کو بغیر ہچکچائے ناکام ریاست کہتے ہوئے ذرا سی بھی شرم نہیں آتی۔

میں جارج فولٹن کا مضمون پڑھ کر فارغ ہی ہوا تھا کہ سویامانے کا ٹیلی فون آ گیا۔ ہمیشہ کی طرح اپنی شستہ اردو میں بات کرتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا کہ میں اگلے ہفتے پاکستان ''واپس'' جا رہا ہوں اگر کوئی سامان وغیرہ بھجوانا ہو تو بتائیں۔ایک جاپانی کے اردو زبان میں یہ الفاظ کہ جیسے پاکستان اس کا اپنا ملک ہے اور وہ پاکستان ''واپس'' جا رہا ہے مجھے بہت ہی بھلے لگے اور جارج فولٹن کا مضمون پڑھ کر جو کوفت ہوئی تھی وہ سب دور ہو گئی۔سویامانے بھلے چند دن کے لیے ہی پاکستان جا رہا ہے لیکن اس کی پاکستان کے ساتھ اپنائیت اور وابستگی دیکھ کر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اب بھی پاکستان سے والہانہ محبت کرنے والے غیر ملکیوں کی کمی نہیں ہے۔ جارج تو ایک ٹیلی وژن کا کردار تھا۔شہریت کے حصول سے لے کر اس کی پاکستان سے محبت تک ہو سکتا ہے سب کچھ صرف اداکاری ہی ہو لیکن سویامانے حقیقی زندگی کا ایک زندہ اور اصل کردار ہے۔پھر بھی اگر ایک جارج نے پاکستان چھوڑ دیا ہے تو کوئی بات نہیں کیونکہ سویامانے پاکستان واپس جا رہا ہے اور اگلے ہفتے وہ لاہور میں موجود ہو گا۔

ایں جہانِ دِگراست

میرے پاکستانی نژاد امریکی دوست عامل راجپوت کا سوال تو بڑا سادہ تھا، مگر بہت بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ جاپان میں باقی دنیا سے کون سی چیز مختلف ہے؟ میرا فوری جواب تو یہ تھا کہ جاپان کے ریستورانوں میں بیرے ٹِپ وصول نہیں کرتے۔ عالمی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ واقعی عجیب سی بات لگتی ہے کہ یہاں کھانے کے بل کے ساتھ ٹپ کا لین دین بالکل بھی نہیں ہوتا۔ دنیا کے کسی اور ملک میں کم از کم میں نے یہ نہیں دیکھا کہ کوئی بھی گاہک ٹپ نہ دے، اور اگر کوئی دے بھی دے تو بیرے اسے وصول کرنے سے انکاری ہوں۔ یورپ کے ویٹر تو اتنے فری ہوگئے ہیں کہ کھانے کے بِل کے ساتھ ساتھ ٹپ بھی بعض اوقات خود ہی کاٹ لیتے ہیں، گویا یہ ان کے بنیادی حقوق میں شامل ہوگیا ہے۔

اپنے دوست کے سوال کا جواب دینے کے بعد بھی میں کافی دیر سوچتا رہا کہ جاپان میں کیا کیا انوکھی باتیں ہیں؟ ذہن میں جواب کی صورت میں جو فہرست فوری ترتیب پائی وہ خاصی دلچسپ ہے۔ یہاں آ کر کوئی بھی غیر ملکی جو پہلی چیز محسوس کرتا ہے وہ غیر معمولی صفائی ہے، گھر، گلیاں، بازار اتنے صاف اور کہیں بھی نہیں دیکھے۔ شہر، محلے، سڑکیں تو ایک طرف رہے، تیرہ کروڑ کی آبادی والے اس ملک کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک چلے جائیں، آپ کو کہیں بھی میلے کپڑوں والا آدمی نہیں ملے گا۔ لوگوں کا کم از کم معیار زندگی یہاں مثالی ہے۔ دوسری چیز جو پہلی نظر میں یہاں آ کر محسوس ہوتی ہے وہ لوگوں میں پائی جانے والی عاجزی اور شیریں گفتار و نرم لہجہ ہے۔ عجیب بات یہ بھی ہے کہ یہاں

چوری نہ ہونے کے برابر ہے۔ جرائم پیشہ افراد کے چند بڑے گینگ جنہیں ''یا کوزا'' کہتے ہیں، عموماً صرف وہی چوری اور دیگر جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مگر چھوٹی موٹی چوریاں تو یا کوزا بھی ہرگز نہیں کرتے، صرف بڑی وارداتیں ڈالتے ہیں۔ یہاں غنڈے، بدمعاش اور عادی مجرم انفرادی طور پر کام دھندہ نہیں کرتے ہیں بلکہ کسی نہ کسی تنظیم کے رکن ہوتے ہیں۔ یا کوزا مافیا کے رکن کو کہتے ہیں۔

جاپان کی ایک انوکھی بات یہ بھی شمار کی جاسکتی ہے کہ یہاں اناؤنسمنٹ صرف زنانہ آواز میں ہوتی ہے۔ مردانہ آواز میں اناؤنسمنٹ ہو تو پھر سمجھیں خیر نہیں ہے۔ ایمبولینس کے اندر سے کوئی مرد ہنگامی صورت میں اعلان کرسکتا ہے، اگر آپ نے کسی ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کی ہے تو پولیس کی گاڑی آپ کو روکنے کے لیے سپیکر استعمال کرتے وقت کسی جوان کا سہارا لے سکتی ہے یا پھر اسی طرح کی کسی اور ہنگامی حالت میں ہی مردانہ آواز کی اناؤنسمنٹ سننے کو ملتی ہے ورنہ اطلاعات پہنچانے کا شعبہ خواتین کے لیے مخصوص ہے۔

بازار کی بات کریں تو یہاں بھاؤ تاؤ اور بارگین کا رواج نہیں ہے۔ ہم غیر ملکی اپنی عادت سے مجبور، قیمت کم کرنے کا کہتے رہتے ہیں اور کبھی کبھار قیمت کم کروانے میں کامیاب بھی رہتے ہیں مگر یہاں کے بھلے لوگ ڈسکاؤنٹ مانگنے کی جرأت ہی نہیں کر پاتے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ یہ لوگ سستی چیز کو مشکوک انداز میں دیکھتے ہیں۔ کاؤنٹر پر کھڑے کیشئر عمومی طور پر مشینی انداز میں کام کرتے، مطلوبہ رقم سے ایک پائی بھی زیادہ یا پھر کم نہیں لیتے ہیں۔ جن دنوں میں نیا نیا یہاں آیا تو میرے گھر کے پاس ہی انٹرنیٹ کیفے ہوا کرتا تھا، انٹرنیٹ کیفے میں چونکہ مشروبات اور آئس کریم مفت ہوتی ہے اس لیے میں کبھی کبھی تفریح کی غرض سے گھر کی بجائے انٹرنیٹ کیفے کا کمپیوٹر استعمال کرنا پسند کرتا ہوں۔ بار بار انٹرنیٹ کیفے جانے کی وجہ سے سٹاف سے جان پہچان بھی ہوگئی۔ ایک شام میں کام سے واپس آیا اور لباس تبدیل کر کے گھر سے نکلنے لگا تو سوچا کہ کہیں اور جانے کی بجائے انٹرنیٹ کیفے بیٹھ جاتا ہوں۔ بٹوہ لینے کی بجائے میں نے اندازے سے ریزگاری اٹھائی کہ پانچ سو روپے کے قریب ہوگی، کیفے

پہنچنے پر میں نے کیشئر کو ریزگاری تھمائی تو وہ مطلوبہ رقم سے تین روپے کم نکلی، میں نے خیر سگالی مسکراہٹ کے ساتھ کاؤنٹر پر کھڑے لڑکے کی طرف دیکھا، جو میری ناقص رائے میں میرا اچھا خاصا دوست بن چکا تھا۔ مگر اس نے کوئی جواب دیے بغیر اسی خیر سگالی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا تو میں تھوڑا سا کنفیوژ ہو گیا، مجھے معاملے کی سمجھ نہ آئی تو میں نے اس سے صاف کہا کہ تین روپے میرے ساتھ ادھار کر لو مگر وہ اس خیر سگالی اور میٹھی مسکراہٹ سے مجھے دیکھ کر کہنے لگا ''ذرا......!'' میں اس کا مطلب سمجھ چکا تھا کہ ''آج نقد کل ادھار'' چار سو روپے کے سودے پر تین روپے کا ڈسکاؤنٹ تو بڑی بات ہے، چالیس ہزار کی چیز آپ کہیں سے خریدیں گے تو تین روپے کا ڈسکاؤنٹ مشکل ہی ملے گا، یہ بات خیر مجھے آہستہ آہستہ سمجھ میں آئی۔

بازار سے متعلق منفرد بات ہے کہ یہاں خریداری کرتے ہوئے پیسے ہاتھ میں پکڑے یا پکڑائے نہیں جاتے۔ براہِ راست دکاندار کے ہاتھ میں پیسے پکڑانا بدتمیزی شمار ہوتی ہے۔ روپے کے لین دین کے لیے تھالی نما برتن استعمال ہوتا ہے۔

جگ سے انوکھی بات یہ بھی ہے کہ یہاں بھکاری نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ صرف معاشی خوشحالی بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی دستِ سوال دراز بھی کرے تو کم از کم جاپانی تو خیرات دینے والا نہیں ہے۔ کبھی کبھی ٹوکیو کے انڈر گراؤنڈ ریلوے اسٹیشن کے باہر کوئی بے گھر ٹائپ جاپانی کھانا کھانے کے لیے مدھم سی آواز میں آپ سے مدد کی اپیل کر سکتا ہے، کیونکہ انہیں پتا ہے کہ جاپان سے باہر کی دنیا میں خیرات کرنے کا رواج موجود ہے۔ ایک دفعہ میرے بڑے بھائی سٹاف کے دیگر ممبران کے ساتھ ریلوے سٹیشن کے باہر سے گزر رہے تھے تو ایک ادھیڑ عمر جاپانی نے کھانا کھانے کے لیے پیسے مانگے تو بھائی جان نے اسے ایک ہزار کا نوٹ دے دیا۔ ساتھ چلتی ہوئی ہمارے سٹاف کی ایک لڑکی کہنے لگی کہ باس! یہ آپ نے اچھا نہیں کیا، یہ آدمی تو اس طرح کبھی بھی کام نہیں کرے گا۔

کیا کہا جائے کہ یہاں غربت کی وجہ قسمت کے لکھے، المیے اور حالات کی ستم

ظریفی کی بجائے ہڈحرامی کوغریبی کا واحد سبب خیال کیا جاتا ہے۔

ہماری کمپنی میں کام کرنے والے پاکستانی نوجوان کے دس سالہ بیٹے نے کھیل کے مہنگے سامان کی فرمائش کی تو ہمارے دوست نے پاکستانی اسٹائل میں بچے کو سمجھانے کے انداز میں کہا کہ ’’بیٹا! تمہارا باپ ایک غریب آدمی ہے، اتنے مہنگے سامان کوافورڈ نہیں کرسکتا‘‘ مگراس جاپانی ماں کے پاکستانی بچے کا جواب بڑا ہی دلچسپ تھا کہ ’’پاپا! اگرتم غریب ہوتو پھر زیادہ محنت کیا کرو۔‘‘

یہ بات بھی کتنی انوکھی ہے کہ یہاں کوئی کسی سے لفٹ نہیں مانگتا۔اس جہان کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک گاڑی میں لفٹ دینا اورضرورت کے وقت لفٹ مانگ لینا عالمی ثقافت کا حصہ ہے۔ میں ایسے سیاحوں سے بھی ملا ہوں جنہوں نے لفٹ لے لے کر پوری دنیا کا چکر مکمل کیا ہے۔ بظاہر جزیرہ ہونے کی وجہ سے لفٹ مانگ کر دنیا کی سیاحت کرنے والوں کا ادھر جاپان آنا نہیں ہوتا، ورنہ یہ ان کا آخری سیاحتی مقام ثابت ہوگا۔سوچ رہا ہوں کہ نئے نصب ہونے والے ٹریفک سگنل بھی تو انوکھے ہیں جو وقت کی بجائے ٹریفک کا بہاؤ اور گاڑیوں کی تعداد دیکھ کر سرخ اور سبز بتی جلاتے ہیں مگراس تفصیل میں بات لمبی ہو جائے گی۔آخری تجزیے میں یہی کہوں گا کہ یہاں کی عجیب باتیں بیان کرنے کے لیے یوں تو ایک کتاب تحریر کرنا پڑے گی مگر مختصر ترین الفاظ میں قلم بند کرنا چاہیں تو کہنا پڑے گا کہ جاپان بہت جاپانی ہے۔عالمگیریت کے اس دور میں بھی بیرونی دنیا کے اثرات یہاں کے سماج میں غالب رنگ نہیں جما پائے ہیں۔میں تواس دیس کو جہانِ دیگر کہوں گا۔

حصہ دوم

رنگِ دیگر

نصرت فتح علی خان کے انمٹ نقوش

خواہش تو یہ تھی کہ فیوجی پہاڑ کو جو عالمی ورثہ قرار دیا گیا ہے، تو اقوامِ متحدہ کے اس اقدام کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے۔ جس طرح سکھ مذہب کے پیروکار ہر مقدس چیز کے ساتھ ''صاحب'' کا لاحقہ لگا دیتے ہیں، جیسے ننکانہ صاحب، پنجہ صاحب وغیرہ، بالکل ویسے ہی جاپانی بھی عقیدت وتکریم کے اظہار کے لیے ''صاحب'' کا لاحقہ لگانا ضروری خیال کرتے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ فیوجی پہاڑ جاپان میں ''فیوجی صاحب'' کہلاتا ہے۔ برف کی ٹوپی پہنے ہوئے فیوجی پہاڑ کا مذہبی مقام ومرتبہ اوراس پر واقع عبادت گاہوں کا ذکر پھر کسی دن کروں گا اوراس کے ساتھ اقوام متحدہ کی جانب سے عالمی ورثہ قرار دیے گئے جاپان کے دیگر بارہ مقامات کا بھی تعارف کروانا خوب رہے گا مگر اس وقت آج کا ایک واقعہ سنئے، جو میرے نزدیک زیادہ اہم ہے۔

صبح سویرے عادت کے مطابق جاپان کا ایک کثیر الاشاعت قومی روزنامہ کھولا تو دنیا بھر کی خبروں سے بھرے اخبار کے درمیانی رنگین صفحے کو دیکھ کر میں ٹھٹک سا گیا۔ ایک طرف فیصل آباد کے گھنٹہ گھر کی تصویر چار کالموں میں پھیلی ہوئی اوراس کے پہلو میں نصرت فتح علی خان کی دو کالمی رنگین تصویر چھپی ہوئی ہے، اوپر جلی حروف میں یہ شہ سرخی لگی ہے ''نصرت فتح علی خان فیصل آباد میں'' تصویر کے نیچے نصرت کا سن پیدائش و وفات 1948-1997ء تحریر ہے اور مختصر حالات زندگی بھی، پھر ایک تفصیلی مضمون اوسامو ماروياموکے قلم سے اخبار کی زینت بنا ہوا ہے۔ مضمون کی چھ کالمی سرخی کا عنوان بہت ہی خوبصورت

ہے ''قوالی کے شہنشاہ نے دنیا پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں'' مضمون پڑھ کر اخبار رکھا تو یادوں کا ایک طویل سلسلہ ذہن میں گردش کرنے لگا۔ نصرت فتح علی خان کا عالمی سطح پر کیا مقام تھا اور انہیں کیسی مقبولیت حاصل تھی اس کا پاکستان میں کم ہی لوگوں کو احساس ہے۔ اگر میں کہوں کہ ہندوستان کے کسی گلوکار کو عالمی سطح پر نصرت فتح علی خان کی مقبولیت کا دسواں حصہ بھی آج تک نصیب نہیں ہوا تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔ سچ پوچھئے تو عشرِ عشیر بھی میں نے اصطلاحاً لکھ دیا ہے ورنہ تو کسی بھارتی گلوکار کو کبھی اس طرح کے سامعین میسر ہی نہیں آئے جو نصرت فتح علی خان کے مداح تھے۔ اس کی چھوٹی سی مثال دیتا ہوں کہ ایسا بارہا ہوا ہے کہ نصرت جاپان آیا، بھرپور کامیاب کنسرٹ کیا اور واپس چلا گیا، پاکستانیوں کو پروگرام کے انعقاد کی اطلاع بعد میں اخبارات پڑھ کر ہوتی تھی۔ یہ عام بات تھی کہ کنسرٹ کے مجمعے میں ایک بھی پاکستانی نہیں ہے اور سب کے سب سامعین جاپانی ہیں۔ میوزیکل کنسرٹ دنیا بھر میں انڈین گلوکاروں کے بھی ہوتے ہیں مگر ان کے تمام سامعین برصغیر پاک و ہند کے باشندے ہی ہوتے ہیں، مقامی لوگ انہیں سننے کے لیے نہیں جاتے ہیں۔

نصرت سے منسوب صفحہ دیکھ کر یادوں کے کئی صفحات دل و دماغ میں گردش کرنے لگے ہیں۔

مجھے یاد ہے جب میں نیا نیا یہاں آیا تو جاپانی زبان سیکھنے کے لیے میں نے لینگویج سکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ سکول کے پہلے ہی دن جب کلاس ٹیچر سے تعارف ہوا، میں نے بتایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں تو جاپانی استاد کا ردِعمل بے ساختہ طور پر یہ تھا کہ ''یار! آپ کا نصرت فتح علی خان تو لاجواب ہے، اس جیسا تو کوئی بھی نہیں گا سکتا'' حالانکہ اس وقت نصرت کا انتقال ہوئے بھی کئی سال بیت چکے تھے اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ جاپانی اساتذہ عمومی طور پر اس طرح کا اظہارِ خیال کرنے سے کلاس میں اجتناب کرتے ہیں۔

سوئٹزرلینڈ میں ایک شام میرا دوست ندیم اپنے کام سے واپس گھر کی طرف جا رہا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک پنجابی قوالی کی آواز ٹکرائی۔ پردیس میں اپنے دیس کی ہر

چیز اچھی لگنے لگتی ہے، ندیم کام تو ختم کر چکا تھا اس لیے گھر کا رستہ چھوڑ کر آواز کے تعاقب میں چل پڑا کہ شاید کسی ہم وطن سے ملاقات ہی ہو جائے ،مگر جب آواز کے منبع پر پہنچا تو دیکھتا ہے کہ ایک گورا ہے جو نصرت فتح علی خان کی قوالی پر رقص کرنے میں مشغول ہے اور میلوں تک کسی ''دیسی'' کا نام ونشان نہیں ہے،''نی میں جانا جوگی دے نال'' کی دھن پر رقص کرنے والے اس گورے کو دنیا بھر کے دیگر گلوکاروں کے گیت بھی یقیناً دستیاب ہوں گے مگر یہ جادو صرف نصرت کی آواز میں تھا جو اس گورے کے بقول ناچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

امریکی پاپ گلوکارہ میڈونا کو اب بھی ملال ہے کہ وہ نصرت کے ساتھ پرفارم کرنے کی اپنی خواہش کو پورا نہ کر سکی۔ ہالی ووڈ کے فلم ساز اب بھی اسے یاد کرتے ہیں اور اس کے کام کی تعریف کرتے ہیں۔آپ کو بتا تا چلوں کہ نصرت فتح علی خان کا ایک میوزک البم جاپان سے بھی جاری ہوا تھا''قوالی: صوفیوں کا صوتی فن'' کے نام سے یہ البم یہاں بہت مقبول ہوا تھا۔آج بھی آپ یہاں کے کسی آڈیو، ویڈیو کرائے پر دینے والے سٹور پر جائیں تو ہو سکتا ہے کہ آپ کو ہندسندھ کے کسی بھی فنکار کی کوئی سی ڈی نہ ملے مگر نصرت فتح علی خان کی سی ڈی ضرور ملے گی۔

آج جہاں ایک طرف گلگت بلتستان میں کوہ پیماؤں کے بہیمانہ قتل جیسی وارداتوں سے پاکستان کا عالمی سطح پر امیج خراب ہو رہا ہے تو دوسری طرف اب بھی نصرت فتح علی خان جیسے لوگ مرنے کے بعد بھی پاکستان کا دنیا بھر میں مثبت امیج ابھارنے کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

پاک ٹی ہاؤس کا نیا روپ

صبح سویرے تازہ اخبار کی سوندھی خوشبو، چائے کے گرما گرم کپ کے ساتھ بہت ہی بھلی محسوس ہوتی ہے۔اگر آپ کے ناشتے کے مینیو میں اخبار شامل نہیں ہے تو قریبی نیوز ایجنسی یا پھر اپنے محلے کے ہاکر سے آزمائشی طور پر ایک مہینے کے لیے اخبار لگوا کر دیکھیں۔تب آپ کو پتا چلے گا کہ یہ کیسا نشہ ہے۔گزشتہ چند دنوں سے میں ایک الجھن کا شکار ہوں، کیونکہ میں پچھلے کئی سالوں سے جس اخبار کے ساتھ ناشتہ کرتا تھا وہ اخبار بند ہو گیا ہے۔گو کہ اسی نیوز گروپ نے نیا اخبار بھی نکالا ہے مگر وہ پہلے والی بات نہیں بن پا رہی۔جاپان کا سب سے زیادہ شائع ہونے والا اخبار ''آساہی'' ہے،ضرورت سے زیادہ امریکہ اور مغرب نواز ہے،اسی لیے مجھے پسند نہیں ہے۔امید ہے''جاپان نیوز'' کے نام سے شائع ہونے والے نئے اخبار سے چند دن میں مانوس ہو جاؤں گا۔

پچھلے برس ایبٹ آباد پریس کلب کے عہدیداران کا وفد ہمارے خانیوال تشریف لایا تو انکشاف ہوا کہ ایبٹ آباد میں کسی سے اخبار مانگ کر پڑھنا معیوب سمجھا جاتا ہے، ہر کوئی اپنا ذاتی اخبار خرید کر پڑھتا ہے۔میرے لیے تو یہ خوشگوار مگر حیران کن بات تھی۔ان دوستوں نے تو مجھے ایبٹ آباد آنے کی دعوت بھی دی تھی، جسے میں نے یہ کہہ کر بخوشی قبول کر لیا، کہ اسامہ بن لادن جن کا مہمان رہا، میں بھی ان کی مہمان نوازی ضرور دیکھنا چاہوں گا۔ایبٹ آباد کے متعلق صحافی دوستوں کا یہ دعویٰ بھی سننے میں آیا کہ اخبار کے خریداروں کی فی کس شرح پاکستان میں سب سے زیادہ ان کے شہر میں ہے۔زمانۂ جاہلیت کے عرب شاعر

امراءالقیس نے پردیس میں مرتے وقت، ایک پردیسی شہزادی کی قبر کو دیکھ کر قیام کیا، اور ایک لازوال شعر کہا تھا کہ ''ہر غریب الوطن کا دوسرے غریب الوطن کے ساتھ ایک رشتہ ہوتا ہے۔'' جس طرح ہر پردیسی کا دوسرے پردیسیوں کے ساتھ ایک تعلق ہوتا ہے، ویسے ہی تمام اہل قلم کا بھی ایک دوسرے سے ایک ذاتی ناتا اور باہمی تعلق ہوتا ہے۔ برسوں پہلے جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھا، ایک ادیب پروفیسر نے میری شعروادب سے رغبت دیکھتے ہوئے، مجھے پاک ٹی ہاؤس میں آنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر بھنگ پینے کا شوق ہو تو پھر بھنگ گھوٹنے والوں کے پاس جا کر بیٹھنا چاہیے۔ پروفیسر صاحب کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں نے ادیبوں اور فنکاروں کے اس چائے خانے پر جانا شروع کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے نیو ہوسٹل میں قیام کے سبب یہ چائے خانہ میرے روز شام کے معمول میں شامل ہو گیا کہ کالج سے پیدل چند منٹ کا فاصلہ تھا۔ یہاں بیٹھنے والے دانشوروں اور فنکاروں کی باتوں میں ایسی اپنائیت تھی کہ تعلیم مکمل کرنے کے باوجود ٹی ہاؤس آنا جانا، اور وہاں بیٹھنے والوں سے رابطہ برقرار رہا، تاوقتیکہ میں پاکستان سے باہر منتقل ہو گیا۔ موجودہ صدی کا آغاز جنرل پرویز مشرف کے دورِ اقتدار اور پاک ٹی ہاؤس کی بندش سے ہوا۔ مجھے دونوں خبروں سے بہت دُکھ پہنچا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ پرویز مشرف کا اقتدار اپنے خاتمے کو پہنچا اور پاک ٹی ہاؤس بھی دوبارہ کُھل گیا۔

اس بار پاکستان بہت مختصر وقت کے لیے گیا تھا مگر پاک ٹی ہاؤس مجھے بہر حال جانا تھا، شام کے وقت چند شاعر دوستوں کے ساتھ ٹی ہاؤس میں داخل ہوا تو طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ اس چائے خانے کے بند ہونے سے ادیب اور شاعر دربدر ہو گئے تھے، اب پھر ان کو گھر اور ٹھکانہ مل گیا ہے۔ ہم فطرتاً ماضی پرست ہیں، اس لیے غالب امکان یہی ہے کہ زیادہ تر اہل قلم کو میری بات پسند نہ آئے گی، مگر میں وہی کہنا چاہتا ہوں جو میں نے محسوس کیا۔ مجھے ٹی ہاؤس ماضی کی بجائے اب زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا۔ ٹی ہاؤس میں موجود قلم قبیلے کے اکثر لوگ یہ شکوہ کرتے پائے گئے کہ کوئی بڑا ادیب یا شاعر

اب وہاں نہیں آ رہا ہے، کوئی بھی نہیں! میں نے گردن گھما کر دیواروں پر نظر ڈالی تو اس دنیا سے رخصت ہو جانے والے ادیب، جن کا پاک ٹی ہاؤس سے رشتہ رہا، سیاہ فریموں کے اندر اُن کی تصاویر موجود تھیں۔ شہرت بخاری، ناصر کاظمی سے لے کر احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، شہزاد احمد اور پھر فیض صاحب، ساغر صدیقی سے لے کر حبیب جالب احمد بشیر، اختر حسین جعفری، استاد امانت علی خان اور جاوید شاہین بھی تو وہاں موجود تھے۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے ان سب کی موجودگی کو وہاں محسوس کیا ہے۔ پتا نہیں شکوہ اور تنقید کرنے والے دوستوں کو ان سب کی موجودگی کیوں محسوس نہیں ہوتی؟

میاں محمد نواز شریف کے ہاتھوں افتتاح کی ننھی سی تختی پر پاک ٹی ہاؤس کی ابتدا اور معرض وجود میں آنے کا سال 1948 لکھا ہے، یہ تاریخ اس لحاظ سے تو درست ہے کہ اسی برس ٹی ہاؤس کا نام انڈیا ٹی ہاؤس سے تبدیل کر کے پاک ٹی ہاؤس رکھا گیا، مگر اس چائے خانے کا قیام دراصل 1940 میں ہوا تھا، انڈیا ٹی ہاؤس کے نام سے قائم ہونے والا یہ کیفے ٹیریا قیام پاکستان کے بعد 1948ء میں پاک ٹی ہاؤس ہو گیا۔

اپنے عاجزانہ سائز اور عبارت کی سادگی کی وجہ سے مجھے افتتاحی تختی اچھی لگی، اچھا ہو گا اگر اس پر 1940 میں قیام کا ذکر بھی کر دیا جائے، قراردادِ پاکستان کی منظوری اور اسی شہر میں عین اس وقت اہل قلم کے اس چائے خانے کا قیام ایک حسین اتفاق بھی ہے۔ پاک ٹی ہاؤس کی بحالی کی تقریب کے موقع پر میاں محمد نواز شریف نے کہا تھا کہ یہ لاہور کے میٹرو بس منصوبے جتنا اہم منصوبہ ہے جو تکمیل کو پہنچا۔ ان کی بات سے میں اس لیے اتفاق کرتا ہوں کہ میٹرو بس اگر میاں شہباز شریف تعمیر نہ کرتے تو ممکن ہے کہ آنے والا کوئی اور حکمران یہ پراجیکٹ تعمیر کروا دیتا، لیکن تیرہ سال کی بندش کے بعد، نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک برصغیر پاک و ہند کے شاعروں، ادیبوں، فنکاروں، سیاستدانوں اور دانشوروں کی بیٹھک، پاک ٹی ہاؤس اگر اب بحال نہ ہوتا تو شاید یہ بحالی کبھی بھی ممکن نہ ہوتی۔ مسلم لیگ (ن) کی قیادت اس منصوبے کو اپنا کارنامہ شمار کر سکتی ہے اور اس کامیابی کے لیے وہ داد اور

تحسین کی مستحق بھی ہے۔

عطاء الحق قاسمی کو میں اہل قلم کی طرف سے عقیدت بھرا سلام اور خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں جن کی سالہا سال کی مستقل کوششوں سے ٹی ہاؤس کی بحالی ممکن ہوسکی۔قاسمی صاحب نے یوں تو الحمراء ادبی بیٹھک سے ٹی ہاؤس کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی، مگر وہ بات نہیں بنی جو پاک ٹی ہاؤس کی تھی۔ بات بنتی بھی کیسے؟ وہاں سعادت حسن منٹو اور فیض احمد فیضؔ سے لے کر استاد امانت علی خان کے قدموں کے نشانات جو نہیں تھے،اور نہ ہی ان کے وجود کی خوشبو۔

آخر میں پاک ٹی ہاؤس کی انتظامیہ سے گزارش ہے کہ پچھلے دنوں ہم سے بچھڑ کر خالقِ حقیقی سے جا ملنے والے منفرد شاعر اور کالم نویس دوست خالد احمد کی تصویر بھی ٹی ہاؤس کی دیوار پر دیگر مرحوم مصنفین کی تصاویر کے ساتھ آویزاں کی جائے۔مرحوم خالد احمد ہر لحاظ سے اس عزت اور اعزاز کے مستحق ہیں۔

آئن سٹائن اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان

آئن سٹائن کی موت سے ہفتہ بھر پہلے کسی شخص نے اس سے سوال کیا تھا کہ بنیاد پرست اندازِ فکر اور سائنسی طرز کی سوچ میں کیا فرق ہے؟ آئن سٹائن کا کہنا تھا کہ بنیاد پرست سوچ کے حامل شخص سے اگر سو سوال کیے جائیں تو وہ سو فیصد کے جواب دے گا، اور اگر سائنسی طرز کی سوچ رکھنے والے آدمی سے آپ سو سوال کریں گے تو وہ ننانوے کے جواب میں معذرت کرے گا کہ مجھے معلوم نہیں ہے جبکہ ایک سوال کا جواب دے گا۔ایک سوال کا جواب بھی شاید کچھ یوں دے گا کہ اب تک کی معلومات کے مطابق جواب یوں ہے، اگر مزید تحقیق کے نتیجے میں کچھ نیا دریافت ہو چکا ہو یا پھر مستقبل میں ہو جائے تو میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔یعنی آئن سٹائن کے بقول سائنسی ذہن والے شخص کے پاس سو میں سے ایک سوال کا جواب بھی حتمی اور قطعی نہیں ہوتا، اس میں بھی مزید امکانات کی گنجائش باقی ہوتی ہے۔

پاکستانی نیوز چینل ٹاک شوز دیکھتے ہوئے کبھی کبھی آئن سٹائن کا یہ جواب میرے ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے۔ یہاں کسی مخصوص شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد پر تنقید کرنا بے جا ہوگا، کہ ہر سوال کا تسلی بخش جواب نا صرف میزبان کے پاس ہوتا ہے بلکہ ہر مہمان کے پاس بھی ہر موضوع پر حتمی اور اٹل معلومات موجود ہوتی ہیں۔ ہمارے قانونی ماہرین سے آپ معیشت کے بارے میں جو چاہیں، بے دھڑک پوچھ لیں۔ معاشیات کے کسی بھی ماہر سے آپ تعلیمی پروگرام، عالمی تعلقات سے لے کر علم طب کا کوئی سوال کر کے

دیکھ لیں، ایسا جواب ملے گا کہ دماغ کے کسی کونے میں کوئی شک باقی نہ رہے گا۔ سیاستدانوں سے تو آپ الجبراء سے لے کر فلکیات کے مسئلے حل کروالیں۔ توانائی کے بحران اور ٹیکس چوری جیسے معمولی مسائل کا حل تو الماس بوبی کو پیش کرتے دیکھا گیا ہے۔ یہاں سوال یہ ابھرتا ہے کہ اتنے زیادہ ٹیلنٹ کے باوجود ہمارا ملک ترقی کیوں نہیں کر رہا ہے؟ ہم سب کو ہر سوال کا جواب تو معلوم ہے اور ہر مسئلے کا حل بھی ہم چٹکیوں میں بتا سکتے ہیں تو پھر پاکستان آگے کیوں نہیں بڑھ رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمیں معلوم تو کچھ بھی نہیں ہوتا لیکن اداکاری یہ کرتے ہیں کہ ہمیں سب کچھ معلوم ہے؟ مزید برآں! غلط معلومات رکھنا لاعلم ہونے سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

اس مرتبہ آئن سٹائن یاد آنے کی وجہ یہ خبر بنی ہے کہ پاکستانی آئن سٹائن، یعنی ہمارے ایٹمی پروگرام کے بانی و موجد ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے کہوٹہ لیبارٹری سے فراغت کے بعد سماجی کارکن، پھر کالم نگار بننے کے بعد اب اپنی نئی سیاسی جماعت کو الیکشن کمیشن میں رجسٹرڈ کروالیا ہے۔ اپنی نئی نویلی جماعت کے لیے انہوں نے میزائل کا انتخابی نشان طلب کیا ہے۔ پاکستان کے دستیاب حالات میں اس خبر کو خلافِ توقع تو نہیں کہا جا سکتا، کہ یہی ''ہر فن مولا'' رویہ ہمارا عمومی مزاج بنتا جا رہا ہے۔ اسے المیہ لکھنے کی بھی جسارت نہیں کروں گا کیونکہ پاکستان کے باقی شہریوں کی طرح یہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا بھی بنیادی انسانی حق ہے کہ وہ سیاست میں حصہ لیں اور اپنی الگ سیاسی حیثیت منوائیں۔ جرمن نژاد امریکی سائنسدان آئن سٹائن کو امریکہ میں بالخصوص اور پورے مغرب میں بالعموم عقل اور ذہانت کا استعارہ مانا جاتا ہے۔ امریکیوں میں تو یہ روزمرہ کا محاورہ ہے کہ اگر کسی مسئلے کو سادہ اور آسان فہم کہنا مقصود ہو تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ ''اسے سمجھنے کے لیے کوئی آئن سٹائن کا دماغ نہیں چاہیے۔'' آئن سٹائن کی علمی عظمت کے اعتراف اور مبالغے کو چھوتی ہوئی توقیر کی وجہ ایٹم بم کی ایجاد اور فزکس کے میدان میں اس کے تحقیقی کام کو بیان کیا جاتا ہے۔

میرے ذہن میں آئن سٹائن کے اس اعلیٰ مقام و مرتبے کے پیچھے ایک اور بھی

محرک ہے، اور وہ ہے اس کا یہودی مذہب کا پیروکار ہونا، ورنہ دنیا میں اور بھی سائنسدانوں نے نہایت اہم ایجادات اور بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ اس جملہ معترضہ کی وجہ میرا یہودیوں کے بارے میں تعصب ہو، جو کہ راسخ ہو چکا ہے۔ چند دیگر وجوہات بھی میری اس سوچ کا سبب ہو سکتی ہیں۔ سخت سردی کے دن تھے جب میں اور میرا کلاس فیلو امتیاز لندن کے مادام تساؤ میوزیم کے مومی مجسمے دیکھنے کے لیے گئے، یہ مجسمے موم سے اس فنکارانہ مہارت سے بنائے گئے ہیں کہ مجسموں کے درمیان کھڑے سیاحوں کو دیکھیں تو فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے انسان کون ہے؟ اور مجسمہ کون سا ہے؟ ہندوستان کی تو کئی شخصیات کے مجسمے وہاں موجود تھے لیکن پاکستان کی نمائندگی واحد محترمہ بے نظیر بھٹو کا مجسمہ کر رہا تھا۔ ہم آئن سٹائن کے مجسمے کے قریب سے گزرنے لگے تو ایک ادھیڑ عمر امریکی نے اپنے آٹھ، دس سالہ بیٹے کے ہمراہ ہمیں روک لیا، اور اپنا کیمرہ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بڑی لجاجت سے فرمائش کرنے لگا کہ آئن سٹائن کے مجسمے کے ساتھ اس باپ بیٹے کی تصویر بنا دوں۔ میں نے بخوشی تصویر کھینچ دی۔ کیمرہ واپس کرتے ہوئے میں نے اس امریکی سے پوچھا کہ کیا تم یہودی ہو؟ اس نے جواباً صاف گوئی اور تفنّن سے کام لیتے ہوئے بتایا کہ ایک بٹا چار (1/4) وہ کیسے؟ میرے مزید سوال پوچھنے سے پہلے ہی اس نے اس (1/4) کی وضاحت کر دی کہ اس کی دادی یہودی مذہب کی پیروکار تھی۔ میرا سوال اور امریکی کا دلچسپ جواب سن کر امتیاز تو ہکّا بکّا رہ گیا، مجھ سے فوراً پوچھنے لگا کہ تمہیں کیسے پتا چل گیا کہ یہ آدمی یہودی ہے؟

یوں تو ہالی ووڈ کی فلم انڈسٹری کے زیادہ تر سٹوڈیو مالکان، پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور ڈسٹی بیوٹر یہودی ہیں، مگر شاید یہ اتفاق ہی ہو کہ جس فلم میں بھی آئن سٹائن کا ذکر ہو اس کا پروڈیوسر یا پھر ڈائریکٹر ضرور یہودی ہوگا۔ عالمی میڈیا آئن سٹائن کا خوبصورت امیج بنانے میں ایک اہم محرک ہے، مگر عالمی نشریاتی اداروں پر یہودی کنٹرول کے بیان سے میرا مقصد آئن سٹائن یا یہودیت کی مذمت ہرگز نہیں ہے۔ ہر قوم اور قبیلے کو یہ پورا حق ہے کہ وہ اپنے سپوتوں اور سورماؤں پر فخر کرے، ان کا نام بلند کر کے خراج تحسین پیش کرے۔

لاطینی امریکہ میں قیام کے دنوں کا ذکر ہے۔ میرا دوست سرخیوراویرو مجھے اپنے ساتھ مرسیڈیز کمپنی کے ڈیلر کے پاس لے گیا، جہاں سے اس نے نئی گاڑی خریدنی تھی۔ کار کے رنگ اور قیمت کے متعلق اپنے شکوک کا تبادلہ کرنے کے بعد ہم شوروم کے مرکزی دفتر میں چلے گئے۔ دفتر میں جہازی سائز کی آئن سٹائن کی مشہور بلیک اینڈ وائیٹ تصویر لگی ہوئی تھی۔ تصویر دیکھتے ہی میں نے سرخیو سے کہا کہ یہ کاف مین (Kaufmann) نامی مرسیڈیز کا ڈیلر یہودی ہے۔ میرے دوست نے حسبِ عادت مجھ سے اختلاف کیا اور بحث شروع کر دی۔ دفتر میں کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا اس لیے بحث طوالت اختیار کر گئی۔ جب میں اسے پاگل فوجی اور وہ مجھے متعصب مذہبی کہہ چکا تو ہمارے درمیان اس بات پر شرط لگ گئی کہ مرسیڈیز کمپنی کا مذکورہ ڈیلر یہودی ہے کہ نہیں؟ فیصلہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ ہم نے شو روم کے مینیجر کو ثالثی کے لیے بلوا لیا تھا۔ سرخیوراویرو نے پوچھا کہ تمہارا مالک یہودی تو نہیں؟ مینیجر نے جواب دیا ہاں! ہاں! وہ جرمن نژاد یہودی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں اس کے والدین جنوبی امریکہ میں آ کر آباد ہوئے تھے۔

پاکستانی قوم ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر اسی طرح فخر کرتی ہے جیسے امریکی اور یہودی آئن سٹائن پر فخر کرتے ہیں۔ جس طرح آئن سٹائن کی تکریم کے لیے امریکی ایٹمی پروگرام کا معمار ہونا کافی حوالہ ہے، اسی طرح ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو بھی ایٹم بم کی نسبت سے فقط ایٹمی سائنسدان کی حیثیت میں ہماری قوم نے محسن پاکستان کا خطاب دیا ہے۔ ہمارے ملک میں ان کی پہچان ایک غیر متنازعہ ہیرو کے طور پر اسی نسبت سے رہی ہے، انہیں سیاست کے سہارے کی ضرورت قطعاً نہیں تھی۔ آئندہ الیکشن میں ان کی جماعت اگر حصہ لیتی ہے اور قانون ساز اسمبلی کی چند نشستیں جیت بھی جاتی ہے، تو اس سے ان کی عزت میں کوئی اضافہ ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ ہاں! کمی ہونے کا خدشہ بہر حال موجود ہے۔ بہتر ہوتا اگر وہ سائنس کے میدان میں ہی اپنی تحقیق کا کام جاری رکھتے، نوجوان نسل کے لیے کوئی اچھا سائنسی تعلیم کا

ادارہ قائم کرتے، تاکہ ان کے سائنس کے بارے میں وسیع علم سے نئی نسل بھی فیض یاب ہوسکتی۔

پسِ تحریر! میرا عزیز دوست امتیاز، جو کہ آج کل کینیڈا کی ایک یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہے، مجھ سے اس بات پر نالاں ہے کہ میں نے اپنے مضمون میں اسے صرف ہم جماعت لکھا ہے، دوست کیوں نہیں لکھا؟ قارئین سے التماس ہے کہ وہ کلاس فیلو کا مطلب بے تکلف دوست سمجھیں۔ اپنے یار امتیاز رحمٰن سے معذرت کا طلبگار ہوں۔

یہ زنجیریں ٹوٹ سکتی ہیں

پرانے زمانے کا قصہ ہے، جب برصغیر پاک و ہند چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور راجواڑوں میں بٹا ہوا تھا، راجے، مہاراجے اور نواب ان ریاستوں کا نظام چلاتے تھے۔ ایسی ہی کسی ریاست میں ایک بہت ہی ماہر کاریگر لوہار رہتا تھا۔ اس کے ہنر کے بہت دور دور تک چرچے تھے۔ ریاست کے راجا سے لے کر عام رعایا تک، سب اس لوہار کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اپنے فن میں مہارت کی بدولت وہ متمول بھی خوب ہو چکا تھا۔ پھر کیا ہوا کہ کسی دوسری ریاست نے اس ریاست پر حملہ کر دیا۔ قبضہ کرنے کے بعد حملہ آوروں نے اس ریاست کے تمام بااثر افراد کو قیدی بنا لیا، راجہ کو قتل کر دیا گیا۔ ان قیدی بنائے گئے لوگوں میں وہ ماہر لوہار بھی شامل تھا۔ قیدی بنائے جانے کے ہنگام، باقی اسیروں کے برعکس وہ لوہار بالکل مطمئن نظر آ رہا تھا۔

دشمن فوج نے فیصلہ کیا کہ گڑھے کھود کر زنجیروں سمیت قیدیوں کو ان میں پھینک دیا جائے، زنجیروں میں جکڑے قیدی بھوک، پیاس سے خود بخود مر کھپ جائیں گے۔ کاریگر لوہار کے چہرے پر اس وقت بھی متانت اور اطمینان نظر آ رہا تھا۔ جب اسیروں کو گڑھے کھود کر ان میں پھینکا جا رہا تھا۔ اس اطمینان وسکون کی وجہ اس کی خود اعتمادی اور یقین تھا کہ زنجیر کیسی بھی مضبوط کیوں نہ ہو، وہ اسے با آسانی کھول لے گا۔ دنیا میں کوئی ایسی زنجیر نہیں بنی جو اسے مقید رکھ سکے۔ جب لوہار کو گڑھے میں پھینکا گیا تو اس نے سنبھلنے کے بعد زنجیر کی ایک ایک کڑی ٹٹولی، تاکہ کمزور کڑی تلاش کر سکے، جسے توڑنا آسان ہو۔ ایک کڑی

پر آ کر اس کا ہاتھ رک گیا۔ اس کی چیخ نکل گئی، پہلی مرتبہ اس پر موت کا خوف طاری ہوا۔ وجہ اس خوف کی یہ تھی کہ زنجیر اس کے اپنے ہاتھ کی ہی بنی ہوئی تھی۔ اس کی عادت تھی کہ وہ جو بھی چیز بناتا اس پر اپنی مہر ثبت کر دیتا تھا، آخری کڑی کو ٹٹولتے ہوئے اس کی انگلیوں کی پوروں نے وہی مہر محسوس کر لی تھی۔ زنجیر بناتے ہوئے اس نے تو کبھی بھی، کوئی بھی کڑی کمزور نہ رکھی تھی، یہی سوچ کر وہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ میں اگر یہ زنجیر بنا سکتا ہوں تو توڑ بھی سکتا ہوں......! اس خیال نے اسے حوصلہ دیا اور اس نے زنجیر بالآخر توڑ ڈالی، رات کے اندھیرے میں گڑھے سے نکلا اور کسی نئی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔

پاکستانی قوم مسائل کی جن زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے، اگر ہم غور کریں تو یہ زنجیریں ہمارے اپنے ہی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہیں۔ غربت، بے روزگاری، جہالت، کرپشن، بدامنی، لوڈ شیڈنگ اور مہنگائی کی ان زنجیروں سے رہائی کے لیے ہم حکمرانوں کی طرف امید والتجا بھری نظروں سے دیکھتے ہیں، وہ حکمران جن کو ہم خود الیکشن میں منتخب کرتے ہیں۔ یہ آس، امید ہمارا حق ہے، مگر جب ہم حکمرانی کے لیے اپنے نمائندے چُنتے ہیں تو کیا تب بھی مسائل سے نجات کا یہ نقطہ ہمارے پیش نظر ہوتا ہے؟ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پھر ایک بار موقع دیا ہے کہ ہم مسائل کے شکنجے سے نکل آئیں۔ الیکشن میں اپنے نمائندے منتخب کرتے وقت ہمیں سوچنا چاہیے کہ جن لوگوں کو ہم اس ملک کی باگ ڈور تھمانے جا رہے ہیں، کیا ان میں ملک کو درپیش مسائل سے نمٹنے کی صلاحیت موجود ہے؟ امیدوار کا کردار، اخلاق، جذبۂ ایثار، اہلیت اور وہ جس پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ رہا ہے، اس جماعت کا پروگرام اور منشور ہماری امیدوار کے لیے حمایت یا پھر اس کی مخالفت کی بنیاد ہونا چاہیے۔

اگر ہم ذات، برادری کی زنجیروں میں جکڑے، فرقہ و مسلک کے اسیر ہو کر، زبان، نسل اور قبائلی تعصّبات کی بیڑیاں پہن کر اپنے نمائندے منتخب کریں گے تو پھر مسائل کی قید سے رہائی کبھی ممکن نہیں ہو گی۔ ہمیں ان تعصّبات سے بالاتر ہو کر سوچنا پڑے گا۔

تعصب کی یہ اسیری نئی بھی نہیں ہے۔

حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے ایک صدی پہلے برصغیر کے مسلمانوں کے ان امراض کی نشاندھی بڑی صراحت کے ساتھ کردی تھی، جو آج بھی ہماری ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

سرزمین پاکستان کے طول وعرض میں بسنے والے لوگوں کے بنیادی مسائل یکساں نوعیت کے ہیں، ان مسائل کے حل کے لیے ہمیں اجتماعی سوچ اور اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہے۔ بازار سے ہر مسلک کے آدمی کو ایک ہی ریٹ پر راشن ملتا ہے، ہر ذات، برادری سے تعلق رکھنے والے فرد کے لیے لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ یکساں ہے، دہشت گردی کا عفریت ہر شہر اور گاؤں کا مسئلہ ہے، چاہے وہ کوئی بھی زبان بولتے ہوں۔ مہنگائی سے ہر کوئی پریشان ہے چاہے لوکل ہو کہ مہاجر، چونکہ دونوں کو ڈیزل اور پٹرول یکساں نرخوں پر دستیاب ہے۔ کیا روشن خیال اور قدامت پسند سوچ کے حامل افراد کے لیے ٹرانسپورٹ کا کرایہ نامہ الگ الگ ہے؟ بہرحال تمام مسائل کا حل تو اسی جمہوری نظام کے ذریعے ہی نکلے گا، جمہوریت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کوئی آئیڈیل نظامِ حکومت نہیں مگر دنیا میں اب تک جو نظام بھی آزمائے گئے ہیں، یہ ان میں سے سب سے بہتر ہے۔ بعض سیاسی قائدین جو عوام میں کم مقبول ہیں، پاکستان کے مسائل کی وجہ دو بڑی پارٹیوں کا اقتدار میں بار بار آنا قرار دیتے ہیں، جو کہ نہایت نامعقول بات ہے۔ مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی اقتدار میں بار بار اس لیے آتی رہی ہیں کیونکہ پاکستانی عوام انہیں اقتدار میں دیکھنا چاہتے تھے، اور یہ کوئی بری بات بھی نہیں ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور یورپ کے کئی ممالک میں تو پچھلے سو سال سے دو، دو پارٹیاں ہی حکومت کر رہی ہیں۔ برطانیہ، جہاں پر ہمارے پارلیمانی طرزِ حکومت نے جنم لیا، وہاں لیبر پارٹی اور ٹوری پارٹی کی ہی سو سال سے باریاں لگی ہوئی ہیں،

امریکہ میں دو صدیاں ہونے کو آئی ہیں کہ ریپبلکن اور ڈیموکریٹ پارٹیوں کے علاوہ کوئی اقتدار میں نہیں آیا۔ پاکستان میں اگر پیپلز پارٹی کی حکومت کے بعد اب نئی حکومت پھر مسلم لیگ (ن) کی بنتی ہوئی نظر آرہی ہے تو اس میں کیسا مضائقہ ہے؟ جمہوریت، جمہور کی آواز کا نام ہی تو ہے، جسے ابراہم لنکن نے لوگوں کی حکومت، لوگوں کے ذریعے، لوگوں کے لیے کہا ہے۔

الیکشن نتائج 2013ء کے روشن پہلو

حالیہ انتخابات کے نتائج کا سب سے روشن رُخ تو یہ ہے کہ پاکستانی قوم نے مسلم لیگ (ن) کو واضح مینڈیٹ دیا ہے، تجزیہ نگاروں کی اکثریت اس بات پر متفق نظر آرہی تھی کہ ایک معلق یا ''ہنگ'' پارلیمان وجود میں آئے گی۔ ان قیاس آرائیوں کے برعکس عوام نے بڑا واضح فیصلہ دیا ہے۔ کاملہ شمسی کے بقول سب تجزیہ نگار خاصی خجالت محسوس کررہے ہیں۔ الیکشن میں دوسرے اور تیسرے نمبر پر ووٹ حاصل کرنے والی سیاسی جماعتوں کی حاصل کردہ نشستوں کی تعداد فاتح جماعت سے چار گنا کم ہے۔ اس صورتِ حال میں ہارس ٹریڈنگ اور ارکانِ اسمبلی کی بولیاں لگنے کا امکان ختم ہوگیا ہے، تحریک عدم اعتماد کے خوف کی تلوار نئی حکومت کے سر پر سایہ فگن نہیں ہوگی۔ علاقائی جماعتوں کی بلیک میلنگ کا بوجھ سرکاری خزانے کو نہیں اٹھانا پڑے گا۔ نئی بننے والی حکومت اس پوزیشن میں ہوگی کہ وہ اپنی تمام توجہ اور توانائی عوامی مسائل کے حل پر مرکوز کردے، جن میں لوڈ شیڈنگ اور مہنگائی کا مسئلہ فوری توجہ کا طالب ہے۔

انتخابی نتائج کا دوسرا خوبصورت پہلو یہ ہے کہ ملک کے چار صوبوں میں کوئی واحد فاتح جماعت نہیں، بلکہ تین مختلف سیاسی جماعتیں زمامِ اقتدار سنبھالنے جارہی ہیں۔ پنجاب اور بلوچستان میں مسلم لیگ (ن)، سندھ میں پیپلز پارٹی اور خیبر پختونخواہ میں تحریک انصاف حکومت کریں گی۔ پنجاب اور سندھ میں بالترتیب مسلم لیگ نواز اور پاکستان پیپلز

پارٹی نے واضح اکثریت حاصل کی ہے جبکہ سرحد اور بلوچستان میں مخلوط حکومتیں قائم ہو رہی ہیں۔ تینوں متحارب، بڑی جماعتوں کی صوبائی حکومت قائم ہونے سے ان صوبائی حکومتوں کے درمیان کارکردگی کے مظاہرے کا مقابلہ ہوگا جو کہ ایک صحت مند رجحان ہے۔ جو پارٹی ایک صوبے میں اپوزیشن میں ہو گی، دوسرے صوبے میں وہ حکمران جماعت ہوگی۔ مستقبل کے انتخابات میں ان صوبائی حکومتوں کی کارکردگی سیاسی جماعتوں کی کامیابی اور ناکامی میں کلیدی کردار ادا کرے گی۔ پاکستان کے سیاسی منظرنامے میں ایک جوہری تبدیلی وقوع پذیر ہوتی نظر آ رہی ہے، لوگوں میں اب نظریات، شخصیات اور تعصّبات کی بنیاد پر نہیں بلکہ کارکردگی کی بناء پر ووٹ دینے کا رجحان رواج پاتا جا رہا ہے۔

ہماری قومی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک منتخب حکومت کی مدت پوری ہونے کے بعد اقتدار عوام کی منتخب کردہ دوسری سیاسی جماعت کی حکومت کو منتقل ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ انتخابات ہماری تاریخ کے سفر میں میل کے پتھر (سنگِ میل خاصا بھاری لفظ لگتا ہے) کے طور پر یاد رکھے جائیں گے۔ پہلی دفعہ پر امن، جمہوری طریقے سے اقتدار کی منتقلی ظہور پذیر ہو رہی ہے۔

پاکستانی سیاست کی ایک ستم ظریفی یہ بھی ہے کہ یہاں الیکشن میں کوئی بھی ہارتا نہیں ہے۔ ایک فریق جیتتا ہے اور باقی سب کے ساتھ دھاندلی ہو جاتی ہے۔ اس بار لیکن صورتِ حال خاصی مضحکہ خیز ہے۔ تحریک انصاف سراپا احتجاج ہے کہ کراچی اور پنجاب میں اس کے ساتھ ایم کیو ایم اور مسلم لیگ (ن) نے دھاندلی کی ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن فرماتے ہیں کہ خیبر پختونخوا میں تحریک انصاف کا مینڈیٹ جعلی ہے اور وہ اسے نہیں تسلیم کرتے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے لہجے میں انتخاب کے شفاف اور منصفانہ ہونے کے حوالے سے شکایت ہے مگر سندھ میں مسلم لیگ (ف) احتجاج برپا کیے ہوئے ہے کہ پیپلز پارٹی نے اس کے ساتھ کھلی دھاندلی کی ہے۔ الغرض اداکارہ میرا سے لے کر گلوکار ابرار الحق تک

احتجاجیوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ نہ جانے کیوں، یہ سیاسی منظر نامہ دیکھ کر مجھے بار بار فنِ باغبانی کے ایک شعبے ''بونسائی'' کا خیال آتا ہے جو کہ جاپان سے متعلق ہے۔ ''بونسائی'' باغبانی کا ایسا فن ہے جس میں گملے میں لگے ہوئے پودے کی تراش خراش مسلسل اس انداز سے کی جاتی ہے کہ سالہا سال عمر پانے کے باوجود اس پودے کا قد چند انچ سے زیادہ نہیں بڑھ پاتا۔ ان ٹھگنے درختوں کو قومی ورثہ سمجھا جاتا ہے اور انہیں جاپان سے باہر لے کر جانے پر پابندی ہے، ہوسکتا ہے آپ نے ان بالشتیے، درختوں کی تصویریں دیکھی ہوں، کئی درخت تو صدیوں پرانے ہیں اور لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں روپے مالیت کے ہیں، مگران کا قد بھی چند انچ سے زیادہ کا نہیں ہونے پاتا۔ پاکستان میں جمہوریت نے کافی طویل سفر طے کرلیا ہے، ہمارے سیاستدانوں کو اب بالغ نظری کا مظاہرہ کرنا چاہیے، دھاندلی کے الزامات لگانے کی بجائے نتائج کو تسلیم کرنے کی روایت کا آغاز کرنا چاہیے۔ ہمارے ہاں البتہ کبھی کسی ریفرنڈم کے نتائج کی شفافیت کو چیلنج نہیں کیا گیا۔ ذرائع ابلاغ ریفرنڈم کے موضوع پر ہر مرتبہ خاموش رہے، صرف حبیب جالبؔ کی گواہی ریکارڈ پر ہے۔

شہر میں ہو کا عالم تھا، جِن تھا یا ریفرنڈم تھا

دھاندلی کے انفرادی واقعات تو امریکہ، یورپ سمیت دنیا کے تمام جمہوری ممالک میں پیش آتے ہیں، ہمارے ہاں بھی پیش آئے ہوں گے، اہم بات مگر یہ ہے کہ اس الیکشن میں کوئی بھی King's Party شاہی جماعت نہیں تھی، ہماری قومی تاریخ کا یہ بھی پہلا خوشگوار واقعہ ہے۔ جنرل اشفاق پرویز کیانی کے زیرِ کمان پاک فوج انتخابی عمل میں مکمل طور پر غیر جانبدار رہی ہے۔ آرمی چیف نے ووٹ ڈال کر جمہوری عمل پر مکمل اعتماد کا عندیہ دیا ہے۔ دھاندلی کا شور اٹھانے والے ہم وطنوں سے ایک ارضی حقیقت شیئر کرنا چاہتا ہوں، پاکستان کی زمینی حقیقت یہ ہے کہ ڈیفنس سوسائٹی سے جیتنے والی سیاسی پارٹی کے ساتھ دھاندلی کرنے کی کوئی جرأت نہیں کرسکتا، البتہ باقی پارٹیوں کے ساتھ ماضی میں کبھی کبھی

یہاں کی جماعت دھاندلی کر جاتی تھی۔عوام نے بڑا واضح پیغام دیا ہے کہ وہ ایک مستحکم حکومت چاہتے ہیں جو اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی تگ و دو کی بجائے لوگوں کو درپیش مسائل کا حل تلاش کرے۔ان انتخابات کی فاتح جماعت بظاہر مسلم لیگ (ن) ہے،لیکن درحقیقت پاکستان جیتا ہے اور پاکستانی قوم ظفر مند ہوئی ہے۔

پیشہ، ذات اور الیکشن

نیویارک میں جس طرح کسی سے اس کا ملک پوچھنا بدتمیزی شمار ہوتا ہے اور یورپ میں کسی شخص سے مذہب دریافت کرنا اخلاق سے گری ہوئی حرکت گردانتے ہیں، بالکل اسی طرح یہاں کسی سے وضاحت طلب کرنا خلافِ آداب سمجھا جاتا ہے۔ہم پردیسیوں کی حیثیت جاپان میں کیونکہ مہمان کی سی ہے، اس لیے یہاں کے معاشرتی ضابطۂ اخلاق کی پابندی ہم پر اس طرح واجب نہیں ہے جیسے ریاستی قانون ہم پر لاگو ہوتا ہے۔کئی سال کے وقفے کے بعد آسٹریلوی نژاد میلکم، جو میرا دوست اور پیشے کے اعتبار سے ترکھان ہے، مجھے ملا تو میں نے مذکورہ بالا اخلاقی ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس سے پوچھا کہ وہ ابھی تک جاپان میں ہی کیوں ہے؟ میں تو سمجھا تھا کہ وہ گولڈ کوسٹ واپس جا چکا ہے؟ پہلے تو وہ میری بات ہنسی میں ٹال گیا۔مگر جب میں نے اپنا سوال دہرایا کہ وہ کیوں اتنے سالوں سے یہاں، اپنے وطن سے دور رہ رہا ہے؟ حالانکہ آسٹریلیا کی معاشی حالت ٹھیک ٹھاک ہے، موسم بھی یہاں سے بہتر ہے اور تمہارا تو یہاں شادی چھوڑ، محبت کا بھی کوئی سین نہیں ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ تم یہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟ اس بات پر وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا اور بتانے لگا کہ آسٹریلیا میں میرے پیشے کی وہ عزت نہیں ہے جو جاپان میں ہے۔آسٹریلیا میں بڑھئی کا پیشہ ''بلیو کالر جاب'' غیر معزز ہے، مگر مجھے اس پیشے سے بہت پیار ہے، یہاں اس پیشے کی چونکہ بڑی عزت دیکھی، اس لیے میں نے اپنا پیشہ چھوڑنے کی بجائے اپنا ملک ترک کر دیا۔

یہاں ہر کام کرنے والے آدمی کو اس کے پیشے کے ساتھ صاحب کا لاحقہ لگا کر پکارا جاتا ہے۔ جیسا کہ دھوبی کو ''دھوبی صاحب''، ''نائی صاحب''، ''مکینک صاحب''، ''موچی صاحب'' حتیٰ کہ خاکروب کو بھی ''خاکروب صاحب'' کہہ کر بلاتے ہیں۔ ہر پیشہ یہاں باعزت پیشہ ہے، بالخصوص ہاتھ سے محنت کرنے والے آدمی کو یہاں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دنیا کے بہت کم ملکوں میں محنت کش طبقے کو ایسی عزت و تکریم حاصل ہے جیسی جاپانی معاشرے میں نظر آتی ہے۔

کھویاناگی ڈینٹر و پینٹر کا معاملہ مگر مختلف ہے، جو کئی سال سے ہماری کمپنی کی گاڑیوں کی ڈینٹنگ، پینٹنگ کا کام کر رہا ہے۔ اس کا اکلوتا بیٹا اس کے ساتھ کام کرنے کو راضی نہیں ہے، کیونکہ لڑکے کی گرل فرینڈ کہتی ہے کہ اسے یہ کام پسند نہیں ہے۔ حالانکہ کھویاناگی کے بقول اس کے بیٹے کے ہاتھ میں بہت صفائی ہے اور وہ بہت اعلیٰ کاریگر ہے۔ تحقیق کرنے پر پتا چلا کہ برخوردار کی گرل فرینڈ کو بھی بنیادی طور پر ڈینٹنگ، پینٹنگ کے کام پر کوئی اعتراض نہیں ہے، مشکل یہ ہے کہ اسے پینٹ کی بُو سے الرجی ہے۔ تازہ پینٹ کی خوشبو سونگھتے ہی یہ لڑکی چھینکیں مارنا شروع کر دیتی ہے، ناک سے پانی بہنے لگتا ہے اور آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ ذاتی طور پر تو مجھے فریش پینٹ اور پیٹرول کی بو بہت اچھی لگتی ہے مگر کئی لوگوں کو اس سے الرجی بھی ہوتی ہے۔ اس معاملے میں بھی کسی پیشے کی تحقیر کا پہلو نہیں نکلتا، خالصتاً طبّی مسئلہ ہے۔

پاکستانی معاشرہ چونکہ ایک طویل عرصے تک جاگیرداروں اور وڈیروں کے ہاتھوں یرغمال رہا ہے، مکمل رہائی تو خیر اب بھی نصیب نہیں ہوئی، اسی وجہ سے جاگیردارانہ ذہنیت کے بہت سارے تصورات بدقسمتی سے عوام میں بھی کسی حد تک رواج پا گئے ہیں۔ اسی بنیاد پر ہمارے معاشرے میں محنت کشوں کو بہت سے لوگ حقیر سمجھتے ہیں۔ محنت کش کو ''کمّی'' اور پھر کام کرنے والے کو ''کمین'' قرار دینا اسی جاگیردارانہ نظام کا شاخسانہ ہے۔ ستم بالائے ستم کہ پیشے کو ذات بنا دیا گیا ہے اور پھر قوم کا درجہ دے دیا گیا، حالانکہ ہمارے

لیے حکم اور پیغام تو بڑا واضع تھا۔

الکَاسبُ حبیب اللّٰہ۔

ترجمہ: محنت کش اللہ کا دوست ہے۔

ذات پات اور قومیت کے یہ فرسودہ تصورات ہماری ملکی ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ دنیا کی دیگر اقوام نے بھی ماضی میں ان رکاوٹوں کو عبور کیا پھر ترقی کے موجودہ مقام تک پہنچ پائی ہیں۔

جس طرح قدیم ہندوستان کا معاشرہ، برہمن، کھشتری، ویش اور شودر ذات کے نام پر چار درجوں میں بٹا ہوا تھا، یہاں بھی ماضی میں اس سے ملتی جُلتی تقسیم تھی۔ بادشاہ اور اس کا خاندان، سیمورائی طبقہ، کسان اور پھر بیوپاری۔ حیرت انگیز طور پر ہر ذات کے کام بھی بھارتی معاشرے کی طرز پر بٹے ہوئے تھے، بادشاہ اور اس کا خاندان کم وبیش وہی مذہبی حیثیت رکھتا تھا جو برہمنوں کی تھی، سیمورائی طبقے کو آپ جاپانی کھشتری کہہ لیں، کسان طبقے کو بیوپاری طبقے پر سبقت حاصل تھی۔ ہر طبقے کا آدمی اپنے نام سے ہی پہچان لیا جاتا تھا کہ وہ کسان ہے، بیوپاری یا پھر سیمورائی ذات کا ہے، شاہی خاندان کے اپنے مخصوص نام تھے۔ ان خاندانی ناموں کی تعداد تین سو کے قریب ہے۔ آپ ان روایتی ناموں کو یہاں کی برادریاں بھی کہہ سکتے ہیں۔ بہتر تعلیم، شعور اور تہذیب کی ترقی سے یہ فرق پڑا ہے کہ اب ہر آدمی ان تین سو روایتی ناموں میں سے کوئی بھی نام چُن سکتا ہے۔ گویا اب معاملہ ہر آدمی کی ذاتی پسند کا ہے، خاندانی پس منظر کا نہیں ہے۔ یہ عام بات ہے کہ باپ کا خاندانی نام ایک طرح کا ہے جبکہ بچوں نے اپنے خاندانی نام اپنی اپنی پسند کے الگ الگ رکھے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں تو کچھ ناعاقبت اندیش لوگ ایسے بھی ہیں جو ذات برادری کو مذہب کا درجہ دیتے ہیں۔

اگلے کچھ دنوں میں پاکستانی قوم آئندہ پانچ سال کے لیے اپنے سیاسی نمائندے اور مستقبل کی حکومت کا چناؤ کرے گی۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان نے بڑا احسن اقدام کیا

ہے کہ ذات، برادری کی بنیاد پر ووٹ مانگنے کو ممنوع قرار دیتے ہوئے اس جرم کی تین سال قید سزا مقرر کر دی ہے۔ الیکشن کمیشن تو قانون بنا کر اپنے حصے کا فرض ادا کر چکا، اب ہم سب پاکستانیوں کی ذمہ داری ہے کہ اپنا ووٹ دیتے وقت امیدوار کے ذاتی کردار، اخلاق اور منشور کو بنیاد بنائیں، امیدوار کی ذات، برادری، قوم، قبیلہ قطعاً قابلیت یا نااہلی کا معیار نہیں ہونا چاہیے۔ جس چیز پر انسان کا کوئی اختیار ہی نہیں وہ اس کی خوبی یا خامی کیسے ہو سکتی ہے؟ یہی اصل روح اور پیغام ہے نبی اکرم ﷺ کے خطبہ حجۃ الوداع کا کہ رنگ، نسل، قوم قبیلہ کسی انسان کے برتر اور کمتر ہونے کی وجہ نہیں ہو سکتا۔ ذات پات کے تعصّبات سے جان چھڑا کر ہی ہم پاکستان کے لیے ایک روشن مستقبل کی امید کر سکتے ہیں۔ الیکشن میں اپنی رائے دیتے ہوئے ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا، یہ بات ہمیں خود بھی سمجھنا ہوگی اور دوسروں کو بھی سمجھانا ہوگی، درندوں کو درندگی سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر انسانوں کو انسانیت سیکھنا پڑتی ہے۔

خدا حافظ

دوسری جنگِ عظیم میں جرمنی ہار گیا۔ایک فوجی تقریب میں برطانوی جرنیل کے سامنے ایک جرمن جرنیل جب ہتھیار ڈال چکا تو تجسس بھرے لہجے میں برٹش افسر سے کہنے لگا! کہ جنگ تو ہم ہار گئے،تسلیم کرلیا،مگر میں تم سے ایک سوال ضرور پوچھنا چاہتا ہوں؟انگریز جرنیل نے جواب دیا کہ ''ضرور پوچھو!'' فتح کی خوشی اور جنگ کے خاتمے کی وجہ سے برطانوی فوجی افسر اچھے موڈ میں تھا۔''کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' نازی جرنیل سنجیدگی سے سوال کرنے لگا کہ ہماری فوج تم سے کمزور ہرگز نہ تھی۔ ہمارا حوصلہ تم سے زیادہ بلند تھا۔ ہمارے ہتھیار تم سے کمتر نہ تھے،ہماری جنگی حکمت عملی میں کوئی جھول نہ تھا، میں قسم کھاتا ہوں کہ بزدلی ہماری فوج کو کبھی چھو کر بھی نہ گزری تھی، پھر کیا وجہ ہے کہ ہم جنگ ہار گئے اور تم جیت گئے؟

رائل برٹش آرمی کا جرنیل مدبرانہ انداز میں کہنے لگا کہ ''ہماری جیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم ہر صبح محاذ پر جنگ شروع کرنے سے پہلے خدا تعالیٰ سے کامیابی کی دعا کرتے تھے،یہی وجہ ہے کہ ہم کامیاب و کامران ٹھہرے''،انگلش جرنیل کی بات سُن کر جرمن جرنیل سوچ میں پڑ گیا۔سوچ کی دہلیز پار کی تو انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا ''نہیں!'' ''یہ وجہ نہیں ہوسکتی! کیونکہ عبادت اور دعا تو ہم لوگ بھی ہر صبح کرتے تھے۔ جنگ کا تمام عرصہ، ہر دن کا آغاز خدا کے حضور دعا والتجا سے ہی ہوا کرتا تھا،اس میں تو ہم نے کوئی کوتاہی نہیں دکھائی۔میرا خیال ہے کہ خدا کی بارگاہ میں دعائیں تو ہم لوگوں نے تم سے زیادہ ہی

کی ہوں گی، کم نہیں۔'' یہ سن کر تاجِ برطانیہ کے جرنیل نے بھنویں اٹھائیں اور ماتھے پر شکن ڈالتے ہوئے جرمن فوجی ہم منصب سے پوچھنے لگا ''تم کس زبان میں دُعا کیا کرتے تھے؟'' نازی جرنیل نے جواباً کہا کہ ''یقیناً جرمن زبان میں'' اس پر انگلش جرنیل نے فاتحانہ قہقہہ لگایا اور کہنے لگا پھر تو ساری بات صاف ہوگئی۔ خدا کو تو جرمن زبان آتی ہی نہیں!! وہ تو انگریزی سمجھتا ہے!!!

یہ واقعہ مجھے یوں یاد آیا کہ میرے کئی دوستوں کا اصرار اور مشورہ ہے کہ، وقتِ رخصت مجھے ''خدا حافظ'' نہیں بلکہ ''اللہ حافظ'' کہنا چاہیے۔ وجہ اس کی زیادہ تر یہ بتاتے ہیں کہ ''خدا'' فارسی زبان کا لفظ ہے عربی زبان میں نہیں ہے۔ عرض کیا کہ صدیوں سے ہماری سرزمین کے بسنے والے مسلمان رخصت ہوتے وقت ''خدا حافظ'' ہی کہتے آئے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے جید علماء کرام اور مسلمان بزرگ، جو چاہے کسی بھی فقہ اور مسلک کے ماننے والے تھے، سبھی نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں رب ذوالجلال کے لیے ''خدا'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اگر ''خدا'' کے لفظ میں کوئی بھی معیوب بات مخفی ہوتی تو ماضی کے علماء و مفتیان اس پر ضرور اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ جنرل ضیاء الحق کے اقتدار میں آنے سے پہلے، عالم اسلام میں پچھلے چودہ سو سال کے دوران ''اللہ حافظ'' کی اصطلاح کسی نے سنی تک نہ تھی۔ پاکستان سے باہر تو خیر اب بھی کسی مسلمان نے یہ اصطلاح نہیں سنی۔ یقیناً ''اللہ حافظ'' کی ترکیب وجود میں آنے سے پہلے بھی لوگ راسخ العقیدہ مسلمان ہوا کرتے تھے، ان میں بھی بڑے عالم، فاضل لوگ موجود تھے۔

میرا دوست شفقت اللہ مگر بضد ہے، کہتا ہے کہ ''اللہ حافظ کہنے میں تمہارا جاتا کیا ہے؟ اب تو سارا ملک یہی کہتا ہے۔'' سچی بات ہے جاتا تو میرا واقعی کچھ بھی نہیں ہے۔ ''اللہ حافظ'' کہنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں، بلکہ ''میڈ اِن پاکستان'' ہونے کی وجہ سے یہ اصطلاح اچھی بھی لگتی ہے۔ گزارش صرف یہ ہے کہ ''خدا حافظ'' کہنے والوں کی سرزنش نہیں ہونی چاہیے۔

جب کوئی عیسائی مذہب کا پیروکار God Bless You کہتا ہے تو ممکن ہے اس کے ذہن میں ''باپ۔ بیٹا۔ روح الامین'' یا God کی تشریح میں اس کے گمان میں حضرت عیسیٰ، کنواری مریم و مقدس روح کا تصور موجود ہو مگر جب کوئی مسلمان لفظ God

کہتا ہے تو بلاشبہ اس کا مطلب خدائے وحدہٗ لاشریک ہی ہوتا ہے۔ برسبیل تذکرہ، عیسائیوں میں بھی ایک ایسا فرقہ موجود ہے جس کا سارا زور اس نقطے پر ہے کہ خدا کو ''جاہوا'' کے نام سے پکارا جائے۔ ان کے بقول ''جاہوا'' ہی خدا کا اصل نام ہے۔ Jehovahs' Witnesses کے نام سے جانا جانے والا یہ مسلک، عیسائیوں کے امیر ترین مسالک میں سے ایک ہے۔ نسبتاً نیا فرقہ ہے۔ بنیادی طور پر تو امریکی سرزمین سے شروع ہوا مگر جاپان کے تقریباً تمام شہروں میں ان کے کلیسا موجود ہیں۔ اس فرقے کے مبلغین جب کبھی میرے دفتر تبلیغ کے لیے آتے ہیں، تو میرے لیے اردو میں اور سٹاف کے باقی ممبران کے لیے ان کے ملکوں کے حساب سے، روسی، نیپالی، انگریزی اور جاپانی زبانوں میں رنگین کتابچے لاتے ہیں۔ ان کی تبلیغ کا اول و آخر خلاصہ یہی ہوتا ہے کہ ''آپ کو پتا ہے خدا کا اپنا ایک نام ہے؟'' اس کا نام ''جاہوا'' بتاتے ہیں اور اسے اسی نام سے پکارنے کی تلقین کرتے ہیں۔ پچھلی بار تین مبلغین چم چم کرتی گاڑی میں ''یاہواوٹنسز'' کا پیغام لے کر میرے پاس آئے اور وہی گھسے پٹے، رٹے رٹائے جملے دہرانے لگے۔ میں نے انہیں بلھے شاہؒ کا یہ شعر سنایا!

گل سمجھ لئی تے رولا کیہ؟

اے رام، رحیم تے مولا کیہ؟

تشریح بھی سمجھانے کی کوشش کی، بابا بلھّے شاہؒ کا تو شاید ان کو پتا نہیں تھا، مگر جب ولیم شیکسپیئر کہتا ہے کہ ''نام میں کیا رکھا ہے؟'' اس بات کی تو انہیں خبر ہونی چاہیے؟ مگر نہیں تھی۔ پہلے پہل تو میں یہی سمجھتا رہا کہ ان مبلغین کو اپنی اور ہماری عاقبت کی فکر ہے، جو میری مسلسل سردمہری، عدم دلچسپی اور بعض اوقات غیر شائستگی کے باوجود اپنا پیغام لے کر گاہے بگاہے آتے رہتے ہیں۔ یہ بھید تو بعد میں کُھلا کہ وہ تبلیغ کرنے کی باقاعدہ ماہانہ تنخواہ لیتے ہیں، نا صرف معقول معاوضہ ومحنتانہ پاتے ہیں بلکہ گاڑی میں ڈلوائے گئے پٹرول کی رسیدیں بھی اپنے گرجا گھر میں جمع کروا کے، پیسے وصول کرتے ہیں۔ عین ممکن ہے گشت کا ٹی-اے-ڈی-اے الگ سے لیتے ہوں۔

کیسے لوگ ہیں دنیا والے؟

گاؤں کی مرکزی سڑک کے کنارے، ایک بوڑھا شخص اپنے عصا کے سہارے کھڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کے انتظار میں ہے۔ یہ پرانے زمانے کی بات ہے، ان وقتوں میں آمد ورفت کے لیے زیادہ تر جانور ہی استعمال کیے جاتے تھے۔ ایک اجنبی مسافر، جو بیل گاڑی پر سامان لادے، اسی سڑک سے گزر رہا تھا، رستے میں اس بوڑھے کو کھڑا دیکھ کر رک گیا۔ بیل گاڑی پر سوار آدمی لگتا تھا کہ اپنا گھر بار چھوڑ کر کہیں ہجرت کر رہا تھا، اس کے سامان سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ پردیسی اس بزرگ آدمی کے پاس ٹھہر کر اس سے پوچھنے لگا کہ ''اس گاؤں کے لوگ کیسے ہیں؟ میں اپنا گاؤں چھوڑ کر آ رہا ہوں، اگر اس بستی کے لوگ اچھے ہیں تو پھر میں یہاں پر ہی مستقل بسیرا کر لیتا ہوں۔''

بوڑھے آدمی نے پردیسی سے پوچھا، کہ جو گاؤں وہ چھوڑ کر آیا ہے، اس گاؤں کے لوگ کیسے تھے؟ بیل گاڑی پر سوار مسافر، بوڑھے کے اس سوال پر بہت حیران ہوا، کہنے لگا کہ ''میرے سوال کا آپ کے سوال سے بھلا کیا تعلق؟'' توقف کے بعد کہنے لگا ''خیر! اب آپ نے پوچھ ہی لیا ہے تو میں آپ کو بتلائے دیتا ہوں، جو گاؤں میں چھوڑ کر آ رہا ہوں وہاں کے لوگ تو بہت برے تھے۔ بہت ہی مکار، بدفطرت اور خود غرض۔ سچ پوچھیے تو اس گاؤں کے لوگوں سے گھٹیا لوگ تو پوری زمین پر شاید کہیں بھی نہ پائے جاتے ہوں۔ ان کے بارے میں خیر کا کوئی کلمہ کہنا، سراسر دروغ گوئی ہوگی۔ میں کچھ بن جاؤں، پھر واپس جا کر ان کو مزا چکھاؤں گا۔''

اجنبی مسافر کی بات سُن کو بوڑھا کہنے لگا کہ ''سچ پوچھو تو اس گاؤں کے لوگ بھی ویسے ہی گھٹیا، بے ہودہ، کمینے اور برے ہیں جیسے تمہارے گاؤں کے لوگ ہیں۔ میں نے اس گاؤں میں اپنی عمر کے ستر سال برباد کیے ہیں، اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں، کہ اس گاؤں کے لوگوں سے زیادہ نیچ اور خراب انسان اس روئے زمین پر ملنا محال ہیں۔ کئی معاملات میں تو اس گاؤں کے لوگ تمہارے گاؤں کے لوگوں سے بھی بدتر ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم کسی اور گاؤں میں جا کر رہائش اختیار کرلو، یہاں بسنے کی غلطی مت کرنا۔''

بوڑھے سے مکالمہ مکمل کر کے، بیل گاڑی والا مسافر آگے بڑھا ہی تھا کہ گھوڑے پر سوار، ایک اور آدمی، اس بوڑھے کے پاس آن کھڑا ہوا۔ گھڑ سوار بھی اپنا گاؤں ترک کر کے آ رہا تھا اور سکونت کے لیے کسی نئی جگہ کی تلاش میں تھا۔ بوڑھے سے مخاطب ہو کر، نئے مسافر نے بھی وہی پرانا سوال دہرایا، کہ اس گاؤں کے لوگ کیسے ہیں؟ بوڑھا کہنے لگا کہ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ایک اجنبی یہی سوال پوچھ رہا تھا، کچھ ہی دیر پہلے میں نے اس سوال کا جواب دیا ہے، لیکن کوئی بات نہیں، تمہارے لیے دہرائے دیتا ہوں۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم جس گاؤں کو چھوڑ کر آئے ہو، وہاں کے لوگ کیسے تھے؟'' بزرگ آدمی کا سوال سن کر، گھڑ سوار مسافر کی آنکھیں فرط جذبات سے بھیگ گئیں، جیسے کسی میٹھی یاد کا جھونکا ذہن سے گزرنے پر کیفیت ہو جاتی ہے۔ کہنے لگا، ''بابا جی! کیا پوچھتے ہیں! بس چند مجبوریوں اور ناگزیر وجوہات کے سبب مجھے اپنا گاؤں چھوڑنا پڑا، ورنہ وہاں کے لوگ تو بہت ہی بھلے، مخلص اور نیک سیرت ہیں، بہت ہی پیار کرنے والے اور دکھ، سکھ کے ساتھی۔ اگر میرے معاشی حالات سدھر گئے، تو میں پھر اپنے گاؤں لوٹ جانا پسند کروں گا، میری خواہش ہے کہ میری تدفین اسی گاؤں میں ہو، جہاں کی مٹی سے میرا خمیر اٹھا ہے۔ وہ گاؤں تو ہمیشہ میرے اندر بستا رہے گا۔'' بوڑھے نے جب مسافر کی بات سُنی تو جواب میں کہنے لگا کہ ''اس گاؤں کے لوگ، تمہارے گاؤں کے لوگوں سے بھی زیادہ اچھے ہیں، تم انہیں اپنے گاؤں کے لوگوں سے بھی بڑھ کر، پیار کرنے والا پاؤ گے۔ میں نے اپنی زندگی کے ستر برس اسی گاؤں میں

گزارے ہیں، اور ان ستر بہاروں کے تجربات کی بنیاد پر تمہیں بتاتا ہوں کہ ان جیسے نیک سیرت، ہمدرد، بھلے مانس، اور خدا ترس لوگ تمہیں پوری دنیا میں کہیں نہیں ملیں گے، میں تمہیں اس گاؤں میں خوش آمدید کہتا ہوں، تمہیں بسنے کے لیے اس سے اچھا گاؤں کہیں نہیں ملے گا۔ گھوڑے سے نیچے اتر آؤ۔ تمہاری تلاش تمام ہوئی۔'' اس حکایت کا راوی، جو اس درویش صورت بوڑھے کے پاس ہی کھڑا سارا منظر دیکھ رہا تھا، بوڑھے سے کہنے لگا کہ ''بزرگوار! آپ بھی کمال کرتے ہیں، میری سمجھ سے تو آپ کی شخصیت اور بیانات بالاتر ہیں۔ دو مختلف لوگوں نے، آپ سے ایک ہی سوال پوچھا کہ اس گاؤں کے لوگ کیسے ہیں؟ اور آپ نے ایک ہی سوال کے دونوں مسافروں کو بالکل متضاد جوابات دیے ہیں۔ اس کی کیا منطق ہے؟''

بوڑھا کہنے لگا کہ ''جیسا انسان خود ہوتا ہے، ویسا ہی اس کا گاؤں ہو جاتا ہے۔ محبت کرنے والے شخص کا پورا گاؤں ہی محبت کرنے والا ہو جاتا ہے اور نفرت سے بھرے آدمی کے گاؤں میں ہر فرد نفرت سے لتھڑ جاتا ہے۔ اپنے گاؤں کے لوگوں سے متعلق آدمی کی رائے سے اس کے گاؤں والوں کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملتی ہیں، فقط اس آدمی کی بابت پتا چلتا ہے کہ اس کا اپنا چلن، کردار کیسا ہے؟ انسان جیسا خود ہوگا، اسی ڈھب کی اس کے ذہن میں گاؤں کے باقی مکینوں کے بارے میں رائے تشکیل پا جائے گی۔''

یہ صوفیانہ کہانی کسی ایک گاؤں یا ایک شہر کی روداد نہیں ہے، بلکہ دنیا کے ہر ملک کی یہی کہانی ہے۔ ہر دیس میں آپ کو کہانی کے دونوں پردیسیوں کی طرز کے لوگ ملتے ہیں۔ میں دسیوں ممالک گھوم چکا ہوں اور ہر ملک میں، اس کہانی کے دو مسافر کرداروں کی طرح، لوگ وہاں کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرتے پائے ہیں۔ ہالینڈ کی لوکل ٹرین میں سوار، ہندوستانی نژاد، ادھیڑ عمر، باحجاب مسلمان خاتون جو یہ کہتی ہے کہ ہالینڈ سے اچھا ملک، اور ان سے اچھے لوگ، پوری دنیا میں کہیں نہیں، میں نے تو دنیا دیکھ رکھی ہے۔ اسی ٹرین میں سوار ایک پھل فروش نے مجھے آگاہی بخشی کہ یہ ملک سیدھا جہنم میں جا رہا

ہے۔ لاطینی امریکہ کے ملک پیرو کا وہ لوک گلوکار بھی مجھے یاد آتا ہے جس نے کہا تھا کہ ''پیرو کے لوگ ایسے محبت کرنے والے ہیں کہ ان کے بغیر میں زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' اسی پیرو کے ایک کیفے میں بیٹھے نوجوان طالب علم نے مجھے بتایا کہ اس ملک کے لوگوں سے گھن آنے لگی ہے، ان لوگوں کے ساتھ رہنا ممکن نہیں، اس کا دم گھٹنے لگا ہے۔

نیویارک کا وہ کیوبن ٹیکسی ڈرائیور بھی نہیں بھولتا، جو کہتا ہے کہ امریکہ میں کوئی بھی تارکِ وطن خوش نہیں ہے، یہاں لالچ اور بےسکونی کے علاوہ رکھا ہی کیا ہے؟ ذہن میں اس وقت اسی نیویارک کے سب وے اسٹیشن پر ایک نیگرو خاتون سے ہوئی گپ شپ بھی گونج رہی ہے، اس خاتون کا ایمان ہے کہ بائبل میں جس مقدس سرزمین Promised Land کا وعدہ کیا گیا ہے، وہ امریکہ ہی ہے۔ ایسا سکون اور معیاری زندگی، اس کے بقول، کہیں اور ممکن ہی نہیں ہو سکتی، یہ خدائی وعدہ ہے۔

اپنے ہم وطنوں کے منہ سے جب کبھی پاکستان، اور اس میں بسنے والے لوگوں کے بارے میں برائیاں سنتا ہوں، تو مجھے ہمیشہ یوں لگتا ہے کہ وہ سب، کہانی کے بوڑھے درویش کے بقول، اپنا ہی چلن اور ذاتی کردار بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ قارئین! آپ کا اور میرا نام ہی تو پاکستانی قوم ہے، اگر آپ اور میں اچھے ہیں، تو پھر پاکستانی قوم اچھی ہے۔ اگر آپ اور میں برے ہیں، تو پھر ہماری قوم بھی بری ہے۔ یہ بات ممکن ہی نہیں کہ آپ بھی اچھے ہوں، اور میں تو اچھا ہوں ہی، مگر قوم بری قرار دی جائے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان یاد رکھنے کے قابل ہے: ''دنیا سے تمہاری بیزاری، تمہارے اندر کی پلیدگی کی علامت ہے۔''

مرارجی ڈیسائی

ان دنوں میڈیا میں معمر بھارتی صحافی کلدیپ نائر کی حال ہی میں شائع ہونے والی آپ بیتی Beyond The Lines کا کافی چرچا ہے۔ صحافتی حلقوں میں ان کے متعلق عام تاثر یہی ہے کہ دبنگ اور دلیر ہونے کے علاوہ پاکستان کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان کا آبائی ''دیس'' سیالکوٹ ہے جہاں انہوں نے بچپن اور جوانی کے ایام گزارے۔ کلدیپ نائر کی یہ سرگزشت جہاں ان کی ذاتی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے، وہاں برصغیر کی سیاست اور تقسیم ہند کے واقعات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے سیاستدانوں کا جائزہ بھی پیش کرتی ہے۔ سیاست کے انہی کرداروں میں سے ایک مرارجی ڈیسائی ہیں، جن کے کلدیپ نائر معترف نظر آتے ہیں۔ 1940ء میں قراردادِ پاکستان کے پیش ہونے کے دن سے شروع ہونے والی اس خودنوشت میں ان کو خوب سراہا گیا ہے۔ یوں تو اس کتاب میں کئی تاریخی حقائق کو غلط درج کیا گیا ہے، جن کی باآسانی تصدیق کی جا سکتی تھی، مگر مصنف کی عمر اس وقت چونکہ نوّے برس کے قریب ہے، اس لیے کتاب میں پائی جانے والی یہ تھوڑی بہت کنفیوژن بڑی حد تک قابل فہم ہے، لیکن مرارجی ڈیسائی پر عظمت تھوپنے کی کوشش پر مجھے شدید اعتراض ہے۔

مرارجی ڈیسائی ہندوستان کی آزادی کے رہنما اور چوتھے منتخب وزیراعظم ہونے کے علاوہ، واحد بھارتی شہری ہیں جنہیں پاکستان کے اعلیٰ ترین سول اعزاز سے نوازا گیا، مگر ان کی تعریف مجھے کچھ ہضم نہیں ہو رہی۔ یقین کیجئے! اس کی وجہ مرارجی ڈیسائی کی ''یورین

ٹھراپی' قطعاً نہیں ہے۔ قارئین کی سہولت کے لیے واضح کر دوں، کہ نامور صحافی خشونت سنگھ سے روایت ہے کہ مرار جی ڈیسائی نے ان کے سامنے یہ اعتراف کیا تھا کہ وہ بعض پیچیدہ و پوشیدہ امراض کے علاج کے لیے، ایک سنیاسی کے مشورے سے پیشاب کو بطور دوا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق اس کے نتائج حیرت انگیز اور فوری ہیں۔ بہر حال مرار جی ڈیسائی کیا کھاتے اور پیتے تھے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، میرا اعتراض ان کے بطور انسان اور سیاستدان کردار کے حوالے سے ہے۔ سوئے اتفاق سے مجھے مرار جی ڈیسائی کی ذاتی زندگی کو کافی تفصیل سے پڑھنے کا موقع ملا۔ میں ان کی نجی زندگی کے دو چند اہم واقعات مختصر طور پر بیان کرنا چاہوں گا، جنہیں پڑھ کر ان کے کردار کی عظمت میرے ذہن میں تو مشکوک ہو گئی تھی، ہوسکتا ہے کہ آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو جائے۔

مرار جی ڈیسائی کے والد بڑے روایت پسند آدمی تھے، لہٰذا جب بیٹے نے اپنی پسند سے شادی کرنا چاہی تو انہوں نے بھرپور مخالفت کر دی۔ لیکن مرار جی ڈیسائی بھی اپنے عزم کے پکے نکلے، باپ سے کہنے لگے کہ آپ مانیں یا نہ مانیں، میں شادی اسی لڑکی سے کروں گا جو میں نے پسند کر لی ہے۔ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ ڈیسائی نے اپنی شادی کی تاریخ طے کر لی اور ادھر باپ نے احتجاجاً خودکشی کرنے کی دھمکی دے ڈالی۔ جب شادی رکوانے کا کوئی بھی حیلہ چارہ گر نہ ہوا تو ان کے باپ نے شادی کی تقریب سے تین دن پہلے واقعی خودکشی کر لی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مرار جی ڈیسائی نے اپنی شادی کی مجوزہ تاریخ پھر بھی تبدیل نہیں کی اور اپنے والد کے انتقال کے تیسرے دن سہرے باندھ کر گھوڑی پر سوار ہوئے اور دلہن بیاہ کر اپنے گھر لے آئے۔

وقت کا پہیہ گھومتا ہے، اور مرار جی ڈیسائی کی اپنی بیٹی جوان ہو جاتی ہے۔ شکل و صورت اس لڑکی کی واجبی سی تھی۔ مورخین نے تو بدصورت لکھا ہے کہ بیٹی اپنے باپ پر گئی تھی، لیکن مجھے ایسا لکھنے میں کوفت ہوتی ہے۔ شاید اس شکل و شباہت کے سبب ہی، لڑکی کی جوانی ڈھلنے لگی اور کوئی اس کا رشتہ مانگنے کے لیے نہ آیا۔ آخر کار جب وہ ستائیس سال کی ہو چکی تو ایک لڑکے نے اسے پسند کر لیا، اور اس سے

شادی کرنے کی خواہش ظاہر کر دی۔ ان دنوں مرار جی ڈیسائی وزیر اعلیٰ کے عہدے پر فائض تھے، غالب امکان یہی ہے کہ اس لڑکے نے مرار جی ڈیسائی کی سیاسی قوت اور اثر و رسوخ استعمال میں لانے کے لیے ہی ان کی بیٹی سے شادی کرنے کی کوشش کی تھی۔ لڑکی تو فوراً ہی شادی کرنے کے لیے راضی ہو گئی مگر مرار جی ڈیسائی نے شادی کی اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ باپ کے انکار سے دلبرداشتہ ہو کر لڑکی نے خود کو آگ لگا لی، شاید اسے امید ہی نہ تھی کہ اس لڑکے کے بعد بھی کوئی دوسرا لڑکا اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو گا۔ جلنے کے بعد جب لڑکی کو ہسپتال پہنچایا گیا تو ابھی اس کی سانسیں چل رہی تھیں۔ جب مرار جی ڈیسائی ہسپتال پہنچے تو لڑکی نے دم دے دیا، بیٹی کی موت کی خبر انہیں پہنچائی گئی تو خبر سُن کر مطمئن کھڑے رہے، ایک آنسو تک نہ بہایا، لاش کو دیکھے بغیر یہ ہدایات دے کر ہسپتال سے چلے گئے کہ، پوسٹ مارٹم کے بعد میت میرے اہل خانہ کے سپرد کر دی جائے۔ اس قدر کٹھور اور سنگ دل آدمی کیسے عظیم ہو سکتا ہے؟ عظیم رہنما تو بہت دور کی بات ہے، ایسا شخص تو اچھا انسان کہلوانے کا بھی مستحق قرار نہیں دیا جا سکتا۔

انسان اور جانور میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ انسان ماضی کی روایات سے سبق سیکھتا ہے، جبکہ جانور تمام تجربات خود کر کے سیکھتے ہیں، اس لیے تاریخ کے علم کی اہمیت سے انکار تو ممکن نہیں، مگر تاریخ کے مضمون میں بے پناہ دلچسپی کے باوجود، میں سمجھتا ہوں کہ قوموں کی اجتماعی زندگی میں ماضی کی اہمیت بس اتنی سی ہوتی ہے جتنی موٹر گاڑی میں دوران سفر پچھلی لائٹوں کی ہوتی ہے۔ ہیڈ لائٹیں بہر حال آگے ہی نصب کی جاتی ہیں، کہ آگے کی سمت بڑھنے کے لیے روشنی بھی اسی طرف درکار ہے۔ اگر کوئی ڈرائیور گاڑی کے آگے کی ہیڈ لائٹیں پھوڑ ڈالے اور پیچھے کی طرف سرچ لائٹ لگا کر اندھیری رات میں گاڑی دوڑانا شروع کر دے تو حادثہ ہونا یقینی ہے۔ عظیم چینی فلسفی اور مذہبی پیشوا لاؤ سے نے اس ضمن میں بڑی خوبصورت بات کہی ہے، کہتا ہے جوان وہ ہے جو مستقبل کے بارے میں سوچتا رہتا ہے

اور بوڑھا وہ شخص ہے جس کے گزرے ہوئے دن ہی اس کے ذہن میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں لاؤ سے کی یہ بات فقط فرد کے بارے میں ہی نہیں بلکہ سماج کے بارے میں بھی صادق آتی ہے۔ جس طرح جوان آدمی مستقبل کی طرف دیکھتا ہے، اسی طرح جوان معاشرہ بھی مستقبل کو اپنی نگاہوں کا مرکز بناتا ہے اور بوڑھا سماج ماضی پرست ہوا کرتا ہے۔ تاریخ کی مثال گاڑی کے اندر لگے اس آئینے کی سی ہے جس سے ہم گزرے ہوئے مناظر دیکھتے ہیں۔ محفوظ سفر کے لیے اس ریئر ویو آئینے کو گاہے گاہے دیکھنا ضروری ہے، مگر پچھڑے ہوئے مناظر کے آئینے پر نظریں جما کر آپ گاڑی نہیں چلا سکتے۔ ہمیں آگے بڑھنا ہے تو پھر مستقبل کے مناظر پر ہی توجہ دینی ہوگی۔ ہاں! ریکارڈ درست رکھنا بھی ضروری ہے، ہماری کہی اور لکھی گئی باتیں ہی کل تاریخ کا حوالہ بنیں گی۔ مرار جی ڈیسائی پر گفتگو کا مقصد تاریخ کی بارگاہ میں اپنی گواہی پیش کرنا ہے۔

اِک چراغ اور بجھا......!

شہزاد احمد دنیا سے چلے گئے ہیں۔شعروادب کا ایک باب تکمیل کو پہنچا۔کُلُّ نَفسٍ ذائقة الموت فرمان ہے اس پاک پروردگار کا جس کے قبضۂ قدرت میں سب کی جان ہے، یقیناً ہر ذی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ہمیشہ باقی رہنے والا تو خدائے ذوالجلال کا چہرہ ہی ہے، دل کو مگر یقین نہیں آتا کہ وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔یقین کرنا یوں بھی دشوار پاتا ہوں کہ پچھلے ہفتے ان سے ٹیلی فون پر گپ شپ ہو رہی تھی۔زندگی سے بھر پور قہقہے بکھیرتا کٹیلا لہجہ......! دراصل کالم لکھتے ہوئے میں ایک لفظ پر اٹک گیا تھا، کپڑے کی باریک کترن کو ہماری پنجابی زبان میں تو ''لیر'' کہتے ہیں۔اردو زبان میں اسے کیا لکھا جائے؟ بہت سوچا اور کئی کتابیں ٹٹولیں مگر جواب ندارد۔کسی سے پوچھ لیا جائے؟ رہنمائی لینے کا خیال آتے ہی شہزاد احمد ڈائریکٹر مجلس ترقی ادب کا نام ذہن میں ابھرا۔ فون کر کے میں نے انہیں اپنی الجھن بتائی۔بڑے پیار سے انہوں نے سمجھایا کہ اردو میں بھی اسے لیر ہی لکھ دیں۔باباجی اشفاق احمد، کہ جن کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا شرف مجھے حاصل رہا، ان کے ایک مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے مجھے سمجھایا کہ اردو زبان کا ہاضمہ بہت اچھا ہے۔نئے الفاظ سمونے کی اس زبان کی صلاحیت بے مثال ہے۔ایسا عالم شخص کہ لاکھوں نہیں کروڑوں میں ایک مگر علم پر غرور و تکبر کا سایہ تک ان کو چھو کر بھی نہ گزرا تھا۔تصنّع و بناوٹ نام کی کسی چیز سے تو ان کی شخصیت واقف ہی نہ

تھی۔کتاب سے بے پناہ محبت کرنے والے آدمی تھے۔ بہت سی کتابیں انہوں نے مجھے تحفے میں دیں۔ کتاب کی فرمائش وہ مجھ سے ہر ملاقات میں کیا کرتے تھے اس بات کا افسوس مجھے تمام عمر رہے گا کہ انہوں نے مجھے جاپان سے انگریزی زبان میں ترجمہ کی گئی کچھ کتابیں لانے کی خواہش کا اظہار کیا جسے میں پورا نہ کر سکا، اور کتاب کے علاوہ انہوں نے کبھی کوئی فرمائش کی بھی نہیں تھی۔ مسکراہٹ ہر وقت ان کے چہرے پر کھیلتی رہتی تھی۔

مجلس ترقیٔ ادب کے ڈائریکٹر تعینات ہوئے تو کتابوں کی اشاعت پر خصوصی توجہ دی، کئی نایاب کتب کی تازہ اشاعت کا اہتمام کیا۔ بہت سی اہم کتابیں نستعلیق خط میں نہیں تھیں، ان کو دور حاضر کے مقبول خط نوری نستعلیق میں شائع کروایا۔ ہمارے ملک میں عموماً سرکاری عہدیداروں کی عزت وتکریم ان کی کرسی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مگر کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ان عہدوں اور کرسیوں کو عزت بخشتے ہیں۔ شہزاد احمد بھی ایسے ہی نابغہ روزگار شخص تھے، انہوں نے مجلس ترقی ادب کے ڈائریکٹر کا عہدہ قبول کر کے اس عہدے کو عزت بخشی۔ انہوں نے اپنے فرائض کو نہ صرف بخوبی سرانجام دیا بلکہ آنے والے آئندہ افسران کے لیے بھی ایک بلند معیار مقرر کر دیا ہے۔ وہ ایک شخص نہیں بلکہ ایک ادارہ تھے۔ اپنی ذات میں انجمن ہونے کا مطلب اگر کسی کو سمجھ نہ آ رہا ہو تو صرف شہزاد احمد کی زندگی پر ایک نگاہ ڈال لے۔ تاریخ میں زندہ رہنے کے لیے وہ کسی منصب کے محتاج قطعاً نہیں تھے۔ ان کی خوبصورت شاعری عمر خیاؔم کی طرح انہیں ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ عالم مغرب کو جن چند مسلم تاریخی کرداروں نے اپنا گرویدہ بنایا ان میں سے ایک نام عمر خیاؔم کا ہے۔ وہ یتیمی اور غریبی میں بچپن گزار کر، فقط اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر، ترک وایران کی مشترکہ سلطنت کے سلجوقی حکمران کے دربار تک پہنچا، شاہی منجم مقرر ہونے کے ساتھ ہی شہنشاہ ملک شاہ کا قریبی مشیر بن گیا۔ ابراہیم خیمہ فروش کے بیٹے عمر نے اپنا تخلص خیاؔم پسند کیا۔

ایک جنگ کے ہنگام، جس میں عمر خیام سترہ سالہ عام نوجوان سپاہی کے طور پر سلجوق بادشاہ الپ ارسلان کی سپاہ میں دادِ شجاعت دے رہا تھا، تو اس نے وہاں تین پیش گوئیاں کیں تھیں۔ اول یہ کہ الپ ارسلان جنگ جیتے گا، دوم رومی اور سلجوقی دونوں بادشاہ قتل ہو جائیں گے، آخرش ملک شاہ زمامِ اقتدار سنبھالے گا۔ اس وقت کے درپیش حالات میں یہ تینوں باتیں انہونی سی لگ رہی تھیں کہ جنگ میں رومیوں کا لشکر الپ ارسلان کی فوج سے چھ گُنا بڑا تھا اور جدید ہتھیاروں سے لیس، دونوں بادشاہوں کا مارا جانا غیر منطقی بات تھی اور ملک شاہ کے تخت نشین ہونے کا جہاں تک تعلق تھا، وہ تو ابھی نوعمر تھا۔ چشم فلک نے مگر دیکھا کہ ایک سال کے اندر یہ تینوں پیش گوئیاں سچ ثابت ہو گئیں۔ انہی پیش گوئیوں کی صداقت کے صلے میں وہ شاہی ستارہ شناس بنا دیا گیا۔

علم ریاضی و الجبرا کے ایسے ایسے پیچیدہ مسائل اس نے حل کیے کہ زمانے نے اسے بوعلی سینا کا ہم پلہ قرار دیا۔ علم فلکیات میں اس نے تہلکہ خیز دریافتیں کیں، گلیلیو سے بہت پہلے اس نے یہ انکشاف کر دیا تھا کہ زمین گھوم رہی ہے۔ عمر خیام کی زندگی میں اس کی شہرت شاہ سے قربت علم نجوم میں مہارت، الجبرا اور فلکیات کے شعبے میں تھی۔ پہلی رباعی اس نے اس وقت لکھی جب وہ شاہی منجم مقرر ہو چکا تھا۔ آج مگر تمام دنیا عمر خیام کو فقط ایک شاعر کے طور پر ہی جانتی ہے اور ایک عالم اس کی رُباعیوں کا دیوانہ ہے۔ شہزاد احمد کا فن بھی عمر خیام کی طرح دائم ہے، کہ فن کو ہی دوام ہے۔

گزشتہ سے پیوستہ برس میری دعوت پر عالمی محفل مشاعرہ میں شرکت کرنے کے لیے میاں چنوں تشریف لائے تو عطاء الحق قاسمی نے ڈائس پر آ کر حاضرین محفل سے کہا کہ آپ خوش قسمت ہیں جو شہزاد احمد جیسے عظیم سخنور کو یہاں دیکھ اور سن رہے ہیں۔ ایک وقت آئے گا کہ آپ اپنے بچوں کو یہ بتا کر فخر محسوس کریں گے کہ آپ نے ان کو دیکھا اور سنا تھا۔

سوچتا ہوں قاسمی صاحب نے کتنی سچی بات کہی تھی۔ اس سال کے آغاز میں ملاقات ہوئی تو شہزاد صاحب کہنے لگے کہ عارضۂ قلب کی وجہ سے میرے لیے سردی کا موسم گزارنا ذرا کٹھن ہوتا ہے۔ سردیاں گزر جائیں تو پھر خیر ہی ہے۔ان کی اچانک موت سے اردو ادب کو ایک نا قابل تلافی نقصان پہنچا ہے اور مجھ جیسے بہت سے طالب علم ایک شفیق استاد سے محروم ہو گئے ہیں۔

دوہری شہریت

ان دنوں پاکستان میں دوہری شہریت کے متعلق بااختیاراور بعض سنجیدہ حلقوں میں اہم گفتگو ہورہی ہے۔ اس حوالے سے الیکشن کمیشن آف پاکستان نے یہ حکم نامہ بھی جاری کیا ہے کہ دوہری شہریت رکھنے والا کوئی بھی شخص الیکشن لڑنے کا اہل نہیں ہوگا۔اس کے علاوہ قومی اسمبلی میں ایک بل بھی پیش ہوا ہے کہ جن لوگوں کے پاس دوہری شہریت ہے یا پھر پاکستان سے باہر کسی ملک میں بینک اکاؤنٹ ہے اسے الیکشن لڑنے کے لیے نااہل قرار دیا جائے۔اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک سینئر اخبار نویس نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ دوہری شہریت ایسے ہی ہے جیسے کسی آدمی کے دو باپ ہوں۔

اسی لاکھ سے زائد پاکستانی جو بیرونِ ملک مقیم ہیں، اور جن میں سے بہت بڑی تعداد کے پاس اپنے میزبان مما لک کی شہریت موجود ہے یا پھر وہ شہریت حاصل کرنے کے عمل سے گزر رہے ہیں، ان کی اکثریت مذکورہ بالا بحث اور مجوزہ اقدامات کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ رہی ہے۔ایسے عالم میں جب غیر ملکی سرمایہ کار پاکستان آنے سے کترا رہے ہیں یہ ضروری ہے کہ بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کو یہاں سرمایہ کاری کرنے کے لیے راغب کیا جائے، نہ کہ ایسے اقدامات کیے جائیں جن سے وہ پاکستان سے مزید دور ہو جائیں۔ یاد رہے کہ اس سال کے دوران تارکینِ وطن پاکستانیوں نے سولہ ارب ڈالر کی رقم پاکستان منتقل کی ہے۔حب الوطنی کا یہ پیمانہ کب اور کس نے مقرر کیا ہے کہ اگر آپ پاکستان میں رہتے ہوں تبھی آپ محبّ وطن ہیں اور پاکستان سے باہر سکونت اختیار کرنے کی صورت

میں آدمی کی حب الوطنی مشکوک ہو جاتی ہے۔ابوریحان البیرونی نے کئی صدیاں پہلے برصغیر پاک وہند کے لوگوں کی نفسیات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ لوگ بیرونی دنیا سے نفرت کرتے ہیں اوراسے کمتر سمجھتے ہیں نیز غیر ملکیوں کو ''ملیچھ'' یعنی ناپاک کہتے ہیں۔غالباً یہی نفسیات جسے البیرونی نے بیان کیا ہے دوہری شہریت کے معاملے میں بھی کارفرما ہے۔

میرے نزدیک دوہری شہریت کا معاملہ سفری دستاویزات سے زیادہ کا نہیں ہے۔جن پاکستانیوں نے بھی بیرونی ممالک کے پاسپورٹ حاصل کیے ہیں ان کا بنیادی مقصد صرف سفر کی سہولت ہوتا ہے۔ کیونکہ پاکستانی پاسپورٹ کے ساتھ سفر کرتے ہوئے آپ کو زیادہ تر ممالک کا ویزہ درکار ہوتا ہے اور ویزہ کے حصول میں وقت اور پیسے ضائع ہوتے ہیں جبکہ یورپ، امریکہ یا جاپان وغیرہ کے پاسپورٹ کے ساتھ سفر کرتے ہوئے آپ کو عموماً کسی ویزہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔صرف ٹکٹ خریدیں اور سفر پر روانہ ہو جائیں۔ یہاں ایک ذاتی وضاحت کرتا چلوں کہ میرے پاس صرف پاکستانی پاسپورٹ ہے اور میں نے کبھی کسی دوسرے ملک کی نیشنلٹی حاصل کرنے کے لیے درخواست بھی نہیں دی ہے،لیکن میں اسے معیوب بھی نہیں سمجھتا۔نیشنلٹی کا اردو ترجمہ شہریت نہیں بلکہ قومیت ہے اور قومیت کاغذ کے پرزوں سے نہیں جانی جاتی بلکہ یہ انسان کے خون میں ہوتی ہے جو تبدیل نہیں کی جاسکتی۔

ارجنٹائن سے تعلق رکھنے والے فٹ بال کی دنیا کے عظیم کھلاڑی ڈیگو میراڈونا کی کیوبا کے سابق صدر فیدل کاسترو سے بڑی دوستی ہے۔فیدل خود کو میراڈونا کا مداح کہتے ہیں اور ان کے گھر میں میراڈونا کے کئی پوسٹر آویزاں ہیں۔چند سال پہلے کیوبا کی حکومت نے میراڈونا کو کیوبا کی شہریت دے دی۔جب اس عظیم فٹبالر سے کیوبائی شہریت قبول کر لینے پر حب الوطنی کے متعلق سوال کیا گیا تو اس نے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کاغذ کا کوئی ٹکڑا ارجنٹائن سے میری نسبت کو کمزور کر دے۔

دوہری شہریت رکھنے والے پاکستانیوں کی اکثریت دو طرح کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ایک وہ جو بسلسلہ روزگار بیرونِ ملک گئے اور ایک طویل عرصہ وہاں مقیم رہے ہیں۔دوسرا بڑا حصہ ان بچوں پر مشتمل ہے جو بیرونِ ملک ہی پاکستانی والدین کے ہاں پیدا ہوئے اور پھر وہیں پلے بڑھے ہیں۔

یہ لوگ پاکستان کی طاقت ہیں کمزوری نہیں ہیں، جو مفت میں پاکستان کے لیے سفارت کاری کر رہے ہیں اور کثیر زرِمبادلہ بھی پاکستان بھیج رہے ہیں۔

دوہری شہریت کی بنیاد پر انتخابی پابندیاں عائد کرنا جمہوریت کی روح کے منافی ہے۔ جمہوریت کی روح کیا ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے برطانیہ میں پیش آنے والا یہ واقعہ انتہائی مددگار رہے۔ یاد رہے کہ برطانوی پارلیمان کو دنیا کی تمام پارلیمانوں کی ماں کہا جاتا ہے اور برطانیہ کے ہی ''میگنا کارٹا'' جو تیرھویں صدی میں تحریر کیا گیا تمام دنیا میں جدید جمہوریت کی بنیاد مانا جاتا ہے۔ تین سال پہلے مشرقی لندن سے ایک بنگالی کونسلر منتخب ہوا جس کے پاس برطانیہ کا ویزہ نہیں تھا بلکہ وہ سیاسی پناہ گزین تھا اور حکومت سے وظیفہ لے کر گزارہ کر رہا تھا۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس بنگالی کو انگریزی زبان بالکل بھی نہیں آتی مگر وہ لندن کے جس علاقے سے امیدوار تھا وہاں بنگالیوں کی اکثریت ہے۔ نام تو اس علاقے کا ''برک ٹاؤن'' ہے لیکن عرف عام میں لندن والے اسے ''بنگلہ ٹاؤن'' کہتے ہیں۔

منتخب ہونے کے بعد جب اس بنگالی سے یہ پوچھا گیا کہ تمہیں تو انگریزی ہی نہیں آتی۔ تم عوام کے لیے کیا کرسکو گے؟ تو اس نے جواب دیا کہ بھلے مجھے انگریزی نہیں آتی لیکن مجھے اپنے علاقے کے لوگوں کے مسائل سے بخوبی آگاہی ہے اس لیے فرائض منصبی ادا کرنے میں انگریزی میرے لیے رکاوٹ نہیں بنے گی۔

آسٹریا میں پیدا ہو کر وہیں پلنے بڑھنے کے بعد اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہوئے آرنلڈ شیوازنیگر تن سازی کا عالمی چمپئن بنا اور پھر ہالی وڈ کی فلموں میں کام کرنے لگا۔ اسی دوران اس نے امریکی شہریت بھی حاصل کر لی۔ 2002ء میں اس نے کیلی فورنیا کے گورنر کا الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا اور وہاں تیس سال سے حکمران ڈیموکریٹک پارٹی کو شکست دے کر گورنر منتخب ہو گیا۔ حال ہی میں شیوازنیگر آٹھ سال گورنر رہنے کے بعد اپنے عہدے سے ریٹائرڈ ہوا ہے۔ یہ لوگوں کا بنیادی انسانی حق ہے کہ وہ جسے چاہیں اپنی نمائندگی کرنیکے لیے منتخب کریں اور ہماری مقتدرہ قوتوں کو عوام کے اس حقِ انتخاب کا

احترام کرنا چاہیے۔ ہمارے ملک میں زیادہ عرصہ چونکہ آمرانہ دورِ حکومت رہا ہے اس لیے افسر شاہی و دیگر مقتدرہ اداروں کا مزاج بھی جمہوری نہیں، بلکہ آمرانہ طرز اختیار کر گیا ہے۔

حکومت پاکستان کو چاہیے کہ وہ اسی لاکھ تارکینِ وطن کو عام انتخابات میں اپنے قریب ترین پاکستانی سفارت خانے میں یا پھر بذریعہ ڈاک ووٹ ڈالنے کا حق دے۔ ہماری قومی اسمبلی اور سینٹ میں بھی تارکینِ وطن کے لیے مخصوص نشستیں ہونی چاہئیں تا کہ یہ لوگ اپنے وطن سے زیادہ گہرا اور مضبوط تعلق محسوس کریں، چہ جائیکہ ان لوگوں کو دوہری شہریت یا پھر کسی اور امتیازی قانون کے تحت انتخابی عمل سے ہی باہر کر دیا جائے۔ ایسے وقت میں جب پاکستان کے اربابِ اختیار سرمایہ اکٹھا کر کے بیرونِ ملک منتقل کر رہے ہیں تارکینِ وطن بیرونی ممالک سے محنت سے کمایا ہوا سرمایہ پاکستان منتقل کر رہے ہیں۔

دوہری شہریت۔ دوسرا رخ......!

آج سے ٹھیک نصف صدی قبل مارشل میک لوہان نے بدلتی ہوئی دنیا کے تناظر میں ''گلوبل ولیج'' کا نظریہ پیش کیا تھا۔ اس دانشور اور ماہرِ تعلیم کا کہنا تھا کہ یہ دنیا، مواصلاتی شعبے میں ترقی کے سبب ایک عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر رہی ہے، وہ دن دور نہیں جب یہ کرۂ ارض عملی طور پر ایک عالمگیر گاؤں بن جائے گا۔ کینیڈا میں پیدا ہونے والے مارشل کو الیکٹرانک میڈیا کی دنیا میں وہی مقام حاصل ہے جو ارسطو کو سائنس میں ہے۔ اس تھیوری کو سن کر ذہن میں فطری طور پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ ''عالمی گاؤں'' کیونکر؟ دنیا کے مستقبل کے متعلق اس نے ''عالمی شہر'' کی اصطلاح کیوں استعمال نہیں کی؟ اس سوال کا جواب مارشل کے اپنے الفاظ میں کچھ یوں تھا کہ، شہروں میں لوگ ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتے ہوئے بھی پڑوسی کے حال سے بے خبر رہتے ہیں یا رہ سکتے ہیں۔ گاؤں میں حالات بالکل مختلف ہوتے ہیں، آپ بات چھپانا بھی چاہیں تو نہیں چھپا سکتے۔ صبح کے وقت وقوع پذیر ہونے والا کوئی بھی اہم واقعہ، شام تک گاؤں کے ہر فرد کے علم میں ہوتا ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ ہر غیر اہم واقعہ بھی سورج ڈھلنے سے پہلے ہر شخص کے علم میں آجاتا ہے، چاہے کوئی بے خبر اور لاعلم ہی کیوں نہ رہنا چاہے۔ مارشل میک لوہان کی زندگی میں اس کے ''گلوبل ولیج'' نظریے کے متعلق ماہرین عمرانیات کی رائے بٹی ہوئی تھی۔ میڈیا اور ایڈورٹائزنگ کے شعبے میں اس کی شہرت، موت تک ایک متنازعہ آدمی کے طور پر رہی۔ مگر آج آدھی صدی گزرنے کے بعد، نا صرف

عمرانیات کے ماہر بلکہ زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہلِ علم اس نقطہ پر متفق ہیں کہ یہ دنیا ایک عالمگیر گاؤں بن چکی ہے۔ یہاں مقصد مارشل کی علمی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کرنا نہیں، جس نے آدھی صدی پہلے انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کا تصور پیش کیا، بلکہ اس کے پیش کردہ نظریے کی روشنی میں موجودہ حالات کا جائزہ لینا ہے۔

عالمگیریت کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب کوئی بھی ملک باقی دنیا سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ اگر کوئی قوم ایسا چاہے بھی، کہ وہ باقی دنیا سے لاتعلق رہے گی، پھر بھی یہ دنیا اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔ ویسے تو اب ہر ملک دنیا کے دیگر ممالک پر انحصار کرتا ہے۔ اس لیے کوئی قوم ایسا چاہے گی ہی نہیں کہ اسے دیگر اقوامِ عالم سے الگ کر دیا جائے۔ بین الاقوامی طور پر یہ بات اب تسلیم شدہ ہے کہ ''کوئی بھی ملک الگ جزیرہ نہیں ہے۔'' جزیرے سے مراد یہاں جغرافیائی معنوں میں خطۂ زمین نہیں بلکہ سماجی اعتبار سے الگ تھلگ ملت مطلب ہے۔

دوہری شہریت کے حامل افراد کو حق رائے دہی ونمائندگی دینے کے موضوع کو میں اسی تناظر میں دیکھتا ہوں۔ مختلف ممالک کی مثالوں اور بدلتے قوانین کا جائزہ پیش کر کے میں نے یہ رائے پیش کی تھی کہ، دوہری شہریت رکھنے والے پاکستانیوں کو برابری کے حقوق ملنے چاہئیں۔

ملک میں کوئی بھی ایسا قانون نہیں ہونا چاہیے جس سے یہ تاثر قائم ہو کہ تارکینِ وطن پاکستانی، ملک کے اندر بسنے والے لوگوں سے کسی بھی اعتبار سے مختلف، یا پھر کم پاکستانی ہیں۔ حالیہ دنوں میں چونکہ اس موضوع پر پارلیمنٹ میں آئینی ترمیم بھی متوقع ہے، لہٰذا خبروں کا مقبول ترین موضوع بھی بنا ہوا ہے۔ اسی پس منظر میں اخبار نویس دوست اس مسئلے پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ بحث کا متقاضی مسئلہ ہے، جس میں ملک کے اندر اور باہر پاکستانیوں کی رائے منقسم نظر آتی ہے۔ دلیل کا جواب دلائل ہی سے ہونا چاہیے، یہی مستحسن ہے مگر کیا کیا جائے؟ کہ چند اخبار نویس دوہری شہریت کی حمایت میں

لکھنے والوں کو گالی دے رہے ہیں۔ کچھ لوگ یہ فرما رہے ہیں کہ دوہری شہریت کے حامی اہلِ قلم کی حب الوطنی مشکوک ہے۔

گالی یا تہمت کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ میں تو گالی و بہتان تحریر کرنے والے لوگوں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، کہ قوموں کی زندگی میں ارتقائی مراحل اسی طرح سے طے ہوا کرتے ہیں۔ ارتقاء کے عمل میں ان لوگوں کا دم بھی غنیمت ہے کہ اس کا کوئی شارٹ کٹ ہی نہیں ہوتا۔ دوہری شہریت کی مخالفت میں دو اہم مضامین برطانیہ سے پاکستانیوں نے لکھے ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ محض اتفاق ہو، دونوں نے یہ نہیں بتایا کہ کیا برطانیہ میں پارلیمنٹ کا ممبر بننے والے کو دوہری شہریت رکھنے کی اجازت ہے؟ یا کہ نہیں ہے؟ اگر پاکستان میں پیدا ہونے والے، مسلمان، گندمی رنگت کے ایشیائی اور اردو بولنے والے شخص کو یہ اجازت ہے کہ وہ برطانوی پارلیمان اور دارالامراء کا رکن بن سکتا ہے جبکہ برطانیہ کے ساتھ ساتھ اس کے پاس پاکستانی شہریت بھی موجود ہے، تو پھر ہمیں یہی شخص قابلِ قبول کیوں نہیں ہے؟ کیوں تاجِ برطانیہ کے لیے یہ شخص کوئی خطرہ نہیں ہے؟ قوم، رنگ، نسل، مذہب، زبان سب کچھ مشترک ہونے کے باوجود صرف ایک غیر ملکی پاسپورٹ کے سبب یہی آدمی ہمارے لیے خطرے کا باعث کیوں ہوسکتا ہے؟

میں کچھ سال پہلے لندن کے ہاؤس آف لارڈز میں سینیٹر جہانگیر بدر کی کتاب "How to be a Leader" کی تقریب رونمائی میں مدعو تھا۔ اس تقریب کے چند مناظر میرے ذہن میں مسلسل گردش کررہے ہیں، میاں شہباز شریف اور غوث علی شاہ کے علاوہ برطانوی پارلیمنٹ کے پانچ ارکان اور دارالامراء سے لارڈ نذیر احمد اور بوٹا سنگھ موجود تھے۔ حسنِ اتفاق سے ان سب کا آبائی وطن برصغیر پاک و ہند تھا، کوئی ایک بھی رکن سفید فام نہیں تھا۔ میں برطانوی پارلیمنٹ کی بات کررہا ہوں جسے پوری دنیا کی پارلیمانوں کی ماں کہا جاتا ہے۔

ذاتی حوالے سے اتنی سی وضاحت کرتا چلوں کہ میں نے آج تک پاکستان کے

علاوہ کسی بھی ملک کی شہریت کے لیے کبھی درخواست بھی نہیں دی ہے۔ گو کہ میں جاپان کی شہریت کے حصول کے لیے درکار قانونی تقاضے پورا کرتا ہوں، لیکن میرا ارادہ صرف پاکستانی پاسپورٹ رکھنے کا ہے۔ مگر میں دوہری شہریت کو برا نہیں سمجھتا۔ جن پاکستانیوں نے بیرونی ممالک کے پاسپورٹ حاصل کیے ہیں، ان کی غالب اکثریت کے نزدیک اس کا مقصد فقط سفر کی سہولت اور کاروبار میں آسانی ہے۔ تارکینِ وطن کی اربوں ڈالر پر مشتمل ترسیل زر اہم معاملہ ہے، مگر اس سے بھی زیادہ اہم بات میرے نزدیک بیرونِ ملک مقیم پاکستانی والدین کے ہاں جنم لینے والے بچے ہیں جن کے پاس دوہری شہریت ہے۔ یہ بچے اور نوجوان پاکستان کے بیرونِ ملک سفیر ہیں۔

ان کو ہرگز یہ احساس نہیں دلانا چاہیے کہ وہ کسی بھی طرح ہم سے کم پاکستانی ہیں۔ پچاسی لاکھ سمندر پار پاکستانی ہماری طاقت ہیں، کمزوری قطعی نہیں ہیں۔ دوہری شہریت رکھنے والے احباب کے باب میں ہونے والی گفتگو کے دوران جن خدشات کا ذکر کیا جا رہا ہے ان کی بنیاد اب تک تو صرف مفروضوں پر ہی ہے، کہ آج تک کوئی نسلی اعتبار سے غیر ملکی تو ہماری پارلیمان کا ممبر نہیں بنا، نہ ہی مستقبل قریب میں اس کا کوئی امکان نظر آتا ہے۔ بالفرضِ محال مستقبل میں اگر پاکستان کے کسی شہر کے مکینوں کی غالب اکثریت کسی غیر ملکی نسل کے پاکستانی شہری کو اپنا نمائندہ بنانا چاہتی ہے! تو اس میں حرج کیا ہے؟ یاددہانی کے لیے بتاتا چلوں کہ آج کل امریکہ کے صدر کا نام بارک حسین اوبامہ ہے، جسکا والد کینیا کا سیاہ فام مسلمان تھا اور جس کی جائے پیدائش اب تک بھی متنازعہ ہے کہ وہ جزائر ہوائی میں ہوئی یا پھر کسی غیر ملک میں؟ صدر کا سوتیلا بھائی اب بھی کینیا میں، جبکہ پھوپھی غیر قانونی طور پر امریکہ میں مقیم ہے۔ کسی کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے، دنیا بھر کے ماہرینِ عمرانیات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آنے والے دنوں میں اوبامہ جیسے، مکس نسل کے بچے ہی اکثریت میں ہوں گے۔ اور یہی چاکلیٹ رنگ کے بچے پوری دنیا میں حکمرانی کرتے نظر آئیں گے۔ دوہری شہریت کے حامل پاکستانیوں کے حق رائے دہی و نمائندگی پر عائد پابندی ہوسکتا ہے یہی پارلیمنٹ ختم کر دے۔ اگر موجودہ پارلیمان یہ

پابندی ختم نہیں کرے گی تو پھر اس سے اگلی، یا پھر اس سے اگلی اسمبلی یہ کام کر دے گی۔ پابندی تو بہرحال ختم ہونا ہی ہے۔ کیونکہ وقت کا اپنا مزاج ہے، وہ صرف آگے ہی بڑھتا ہے۔ حکیم الامتؒ یاد آ گئے۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

چیئرمین نادرا اور دوہری شہریت

دوہری شہریت رکھنے کے مخالف حضرات کو اب کوئی ڈھنگ کی دلیل بھی نہیں سوجھ رہی۔ اس مشکل میں انہیں اس بار نادرا کے برطرف اور پھر بحال ہونے والے چیئرمین طارق ملک نے ڈالا ہے۔المیہ یہ ہوا کہ طارق ملک پاکستان کے شہری ہونے کے علاوہ کینیڈا کی شہریت بھی رکھتے ہیں۔اس تحریر کا مقصد قطعاً یہ نہیں کہ پروفیسر فتح محمد ملک کے ہونہار فرزند کی جگہ پر کسی دولے شاہ کے چوہے کو چیئرمین نادرا لگا دیا جائے،جس کی اہلیت فقط پاکستانی پاسپورٹ اور اعلیٰ حکام کی خوشامد کے علاوہ کچھ بھی نہ ہو، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح اعلیٰ ترین سرکاری افسران کی دوہری شہریت پر پابندی نہیں ہے،اسی طرح تارکینِ وطن پاکستانیوں کے سیاست میں حصہ لینے پر بھی پابندی ختم ہونی چاہیے اور اس سلسلے میں فوری طور پر قانون سازی ہونی چاہیے۔

عرض کرتا چلوں کہ اس ضمن میں اسی شخص کی دلیل میں وزن ہوگا جس کے سب کو تولنے کے لیے بات یکساں ہوں گے۔سب کو پرکھنے کے لیے کسوٹی ایک ہوگی۔لوگ بھلے جیسے بھی مختلف ہوں، انہیں جانچنے کے لیے پیمانے تو مختلف نہیں ہو سکتے۔پیمانہ تو سب کے لیے ایک جیسا ہوگا۔یہی انصاف کا تقاضا ہے۔یہ کیسا انصاف ہے کہ اگر بات عوامی نمائندگی کی آئے تو لوگوں سے ان کے انتخاب کا بنیادی حق چھین لیا جائے اور پابندی لگا دی جائے کہ وہ کسی دوہری شہریت کے حامل شخص کو اپنا نمائندہ منتخب نہیں کر سکتے۔ایسا شخص کوئی سیاسی عہدہ نہیں رکھ سکتا،جس کے پاس پاکستان کے علاوہ بھی کسی ملک کا پاسپورٹ ہو۔پارلیمان تو ایسے شخص کے لیے شجرِ ممنوعہ ہے،ایسا کوئی آدمی اگر عوام کی اکثریتی رائے

کے بل بوتے پر ایوان میں داخل ہو بھی جائے تو اسے ذلیل ورسوا کر کے نکال باہر کیا جائے، دوہری شہریت کو دوغلی وفاداری بتایا جائے۔ حالانکہ قانون ساز اسمبلی کے ممبران تو جمہوری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے، لوگوں کی غالب رائے کے واحد ذریعے ہی ایوان میں داخل ہوا کرتے ہیں۔ بالفرِ محال اس پابندی کو جائز تسلیم کرلیا جائے۔ بجا مان لیا جائے۔ پھر چیئر مین نادرا کے متعلق کیا خیال ہے؟ کیا اس ناروا پابندی کے حق میں دلائل چیئر مین نادرا کے عہدے کے لیے صادق نہیں آتے ہیں؟ اگر یہ دلیل دی جائے کہ قانون اور آئین کا منشاء یہی ہے، تو پھر حضور!! قانون اور آئین آسمان سے نازل نہیں ہوئے ہیں بلکہ ہمارے منتخب کردہ لوگوں نے ہی انہیں تحریر کیا ہے۔ ہم اسی قانون کو تسلیم کرتے ہوئے تبدیلی کی بات کریں تو اسے معاشرتی ارتقاء کہتے ہیں، جو کسی بھی سماج کی صحت مندی کے لیے لازمی ہے۔

اگر کوئی یہ دلیل دیتا ہے کہ عوامی نمائندوں نے چونکہ قانون سازی کرنا ہوتی ہے جو کہ حساس نوعیت کا معاملہ ہے اور چیئر مین نادرا کو کوئی ایسا مشن نہیں ہے، لہٰذا اسے استثنٰی حاصل ہے۔ جنابِ والا! قانون ساز اسمبلی کا رکن اکیلا تو کچھ نہیں کرتا۔ سب سے پہلے تو اسے پارٹی پالیسی اور ڈسپلن کی پابندی کرنا ہوتی ہے اور اگر وہ پارٹی سے بغاوت بھی کر دے تو زیادہ سے زیادہ کیا کرسکتا ہے؟ کیا تن تنہا وہ کوئی قانون سازی کرسکتا ہے؟ یقیناً نہیں، ایسا ممکن ہی نہیں۔ دوسری طرف چیئر مین نادرا اگر چاہے تو یک وتنہا پاکستان کے ہر شہری کے متعلق تمام تر معلومات، یعنی پیدائش، ولدیت، پتہ ٹھکانہ، ملکیت وشجرہ نسب صرف ایک لیپ ٹاپ میں بھارت اور اسرائیل کو فراہم کرسکتا ہے۔ پاکستان کے رہنے والے تمام لوگوں کا کچا چھٹا اور حالاتِ زندگی ایک تھالی (ہارڈ ڈسک کا اردو ترجمہ) میں رکھ کر برطانیہ کی ملکہ کو پیش کرسکتا ہے، جس سے وفاداری کا اس نے حلف بھی اٹھا رکھا ہے۔ مگر میں کہوں گا کہ ہمیں اپنے ہم وطنوں کے متعلق ایسی بدگمانی زیب نہیں دیتی۔ انصاف کا نام لینے والوں کو یاددہانی کراتا چلوں کہ انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ پیمانہ ایک ہی رکھیں۔ چیئر مین نادرا کو جھٹ پٹ بحال کرنے والی عدالتِ عالیہ سے میں یہ سوال پوچھنے کی جسارت نہیں کروں گا کہ کیا طارق ملک نے ملکہ برطانیہ سے وفاداری کا

حلف نہیں اٹھا رکھا؟ یاد رہے کہ کینیڈا کی سربراہِ مملکت ابھی تک ملکہ معظّمہ برطانیہ ہی ہیں۔ بارِ دگر عرض

کرتا چلوں کہ ذاتی طور پر آج تک میں نے کسی غیر ملک کی شہریت کے حصول کے لیے درخواست نہیں دی ہے۔اس کے باوجود کہ جاپان کی شہریت کے لیے درکار تمام تر قانونی تقاضوں کو میں پورا کرتا ہوں اور پاسپورٹ لے سکتا ہوں۔میری نظر میں دوہری شہریت رکھنے کی مخالفت میں اُس مردِقلندر کی بات معتبر ہوگی ،جس کو کسی مہذب بیرونی ملک کی شہریت مل رہی ہو مگر وہ خود اسے لینے سے منکر ہو۔بدقسمتی سے دوہری شہریت کے مخالفین میں اکثریت ان کی ہے جنہیں اگر کسی ڈھنگ کے ملک کا پاسپورٹ آفر ہو تو ایک منٹ بھی سوچنے میں خرچ نہ کریں اور فوری طور پر اس حسین آفر کو شرفِ قبولیت بخش دیں۔دوہری شہریت رکھنے کی مخالفت کا بنیادی سبب تارکین وطن سے حسد اور رشک کے علاوہ زیادہ تر ''انگور کھٹے ہیں'' والا معاملہ ہے۔

ذرائع ابلاگ سے منسلک جو افراد چیئر مین نادرا کی برطرفی و بحالی کی بابت گفتگو سے احتراز برت رہے ہیں،اس کی وجہ قطعی یہ نہیں کہ انہیں مسلم لیگ کی حکومت سے کوئی ہمدردی ہوگئی ہے، بلکہ وہ خجالت محسوس کررہے ہیں کہ کس طرح ایک دوہری شہریت والے کا دفاع کریں۔جسے دوہری وفاداری کہہ کر غداری اور گالی کا مترادف خود ہی ثابت کر چکے ہیں؟ مگر خاموش رہنے والے حضرات کو میں پھر بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔جو کھسیانی بلی کی طرح کھمبا تو نہیں نوچ رہے ہیں۔

وزیراعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف نے یہ کہہ کر تارکینِ وطن پاکستانیوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے کہ دوہری شہریت رکھنے والے پاکستانیوں کی وفاداری اور حب الوطنی کو شک کی نگاہ سے دیکھنا ان کی توہین ہے اور انہوں نے مناسب قانون سازی کے ذریعے دوہری شہریت رکھنے والے پاکستانیوں ک وملکی سیاست میں حصہ لینے پر عائد پابندی کے خاتمے کا وعدہ بھی کیا۔ایسا قانون جتنی جلدی آجائے پاکستان کا اتنا ہی فائدہ ہے۔سمندر پار پاکستانی ہمارے ملک کا قیمتی اثاثہ ہیں، پاکستان پر بوجھ قطعی طور پر نہیں ہیں۔عام شہریوں کے برابر حقوق ان کا بنیادی حق ہے۔

دوہری شہریت کے مخالف نظریات رکھنے والے دوستوں سے میری گزارش ہے کہ وہ اپنی سوچ پر نظر ثانی

کریں۔دلیل کو تسلیم کر لینے سے آدمی چھوٹا نہیں ہو جاتا، میری نظر میں تو دلیل کو تسلیم کر لینے سے انسان کا قد کاٹھ مزید بڑھ جاتا ہے۔انسان کی سوچ تو ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

گوتم بدھ جب سنیاسی ہو کے نروان پا کر کئی سال بعد گھر لوٹا، تو اس کی بیوی یشودھرا، جو کہ خود بھی ایک شہزادی تھی، اس نے مہاتما بدھ سے پوچھا کہ: ''میں یہ تو نہیں کہتی کہ میرا بیوی ہونے کے ناتے تم پر کوئی حق تھا مگر میں یہ ضرور پوچھنا چاہتی ہوں کہ تمہیں اپنے ننھے منّے بیٹے راہول کو باپ کے سائے سے محروم کرنے کا کیا حق تھا؟ بدھ نے تاریخی جملے کی صورت میں جواب دیا، کہنے لگا: جو تمہیں چھوڑ کر گیا، وہ گوتم سدھارتھ تھا، مگر میں تو بدھا ہوں جو تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔سوچ بدلنے سے انسان بدل جاتا ہے۔ہٹ دھرمی اور ضد سے آدمی بڑا نہیں ہوتا۔دلیل کے سامنے سر تسلیم خم کر کے سوچ کی تبدیلی انسان کے لیے بہترین راستہ ہے۔

پاکستان- کپڑے کا دوسرا بڑا برآمد کُنندہ

اس بار ٹوکیو ایئرپورٹ سے پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہوئے ایک خوشگوار اشتہار نے سفر آسان بنا دیا۔ یہ اشتہار مسافروں کو ایئرپورٹ ٹرمینل سے طیارے کے اندر لے کر جانے والے ٹنل کے دائیں بائیں قدِ آدم سائز میں HSBC بنک کی طرف سے لگایا گیا تھا جس کی عبارت تھی ''پاکستان- دنیا میں ملبوسات برآمد کرنے والا دوسرا سب سے بڑا ملک ہے'' اس کے ساتھ ہی ایک عورت کی تصویر تھی جو حلیے سے سندھی معلوم ہو رہی تھی اور کپاس چننے میں مشغول تھی۔ ہانگ کانگ کے ایچ ایس بی سی بنک کا یہ اشتہار میرے لیے ایک خبر بھی تھا کیونکہ میرے علم میں تو کجا وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پاکستان کپڑے ایکسپورٹ کرنے والا دنیا کا دوسرا سب سے بڑا ملک بن گیا ہے۔ اسی طرح چند برس پہلے مجھے یورپ میں معلوم ہوا تھا کہ پاکستان دنیا میں اٹلی کے بعد دوسرا بڑا ملک ہے جو سب سے زیادہ جوتے ایکسپورٹ کرتا ہے۔ پاکستان پہنچ کر میں نے اپنے ادیبوں صحافیوں سمیت تمام دوستوں سے استفسار کیا کہ کیا انہیں معلوم ہے کہ ہمارا ملک ملبوسات برآمد کرنے میں تمام دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے؟ اسے محض اتفاق کہیے یا کچھ اور لیکن میرے تمام دوستوں کا جواب نفی میں تھا۔ کسی کو بھی نہیں پتہ تھا کہ کپڑے کی تجارت میں پاکستان اس نہج پر پہنچ چکا ہے۔ حالانکہ میں جن دوستوں کا ذکر کر رہا ہوں وہ تمام روزانہ اخبار پڑھتے ہیں اور کئی کئی گھنٹے نیوز چینل دیکھتے رہتے ہیں۔ سوچنے والی بات ہے کہ ان کی اس لاعلمی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی اخبار اور نیوز چینل نے مذکورہ خبر نشر ہی نہ کی ہو۔ یہ

بات اور بھی پریشان کن ہے کہ اغوا، قتل، ڈاکے، دھماکے سے لے کر دوسرے درجے کے کسی سیاستدان کا تیسرے درجے کا بیان تو اتنا اہم ہے کہ اسے اخبار صفحہ اول پر شائع کرتا ہے اور نیوز چینل بریکنگ نیوز کہتا ہے لیکن اگر ہمارا ملک کپڑے اور جوتے ایکسپورٹ کرنے والا دنیا کا دوسرا سب سے بڑا ملک بن جاتا ہے تو یہ پاکستان کے کسی بھی میڈیا ہاؤس کے لیے کوئی خبر ہی نہیں ہے۔

کیا خبر کا مطلب صرف بری خبر ہوتا ہے؟ آپ اتفاق کریں گے کہ ایسا نہیں ہے اور خوشگوار تاثر چھوڑنے والی ہر نئی بات بھی خبر بننے کی اسی طرح مستحق ہے جس طرح جرم وسزا سے متعلق وقوع پذیر ہونے والا ہر نیا واقعہ ایک خبر بنتا ہے۔ پرنٹ میڈیا خصوصاً اخبارات کا رویہ اس ضمن میں نسبتاً بہتر اور الیکٹرانک میڈیا بالخصوص نیوز چینل سے زیادہ ذمہ دارانہ ہے جس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ اردو اخبارات کی تاریخ سو سال پرانی ہے اور نیوز چینلز ایک نیا تجربہ ہے جس میں ایڈیٹر کا کردار اب تک نظر ہی نہیں آ رہا جبکہ اخبار میں ایڈیٹر کا کردار وہی ہوتا ہے جو ایک جسم میں روح کا کردار ہے۔ ایک نیوز چینل جو مایوسی بانٹنے اور خوف پھیلانے میں ممتاز مقام رکھتا ہے، ہمارے دوست شاہ جی اس کے مستقل ناظر ہیں۔ اس مرتبہ وہ پاکستان گئے تو حسبِ عادت جب بھی انہیں وقت ملتا وہ اپنا پسندیدہ چینل لگا کر دیکھنے لگتے۔ چند دن گزرے کہ شاہ جی کی سات سالہ بیٹی کارٹون دیکھ رہی تھی تو اسی وقت شاہ جی بھی گھر میں داخل ہوئے اور بچی سے ریموٹ لے کر اپنا پسندیدہ نیوز چینل لگا کر ٹی وی دیکھنے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد بچی شاہ جی کے پاس آئی اور بڑی معصومیت سے کہنے لگی: پاپا! خدا کے لیے یہ چینل نہ دیکھیں اس کا تو میوزک سن کر ڈر لگتا ہے۔

بڑی واضح بات ہے۔ کوئی بھی ابہام نہیں کہ مملکت اور حکومت میں بڑا فرق ہوتا ہے جسے ہر ذی شعور سمجھتا ہے۔ حکومت پر تنقید بجا ہے لیکن ہمارے ہاں تو ریاست نشانے پر ہے۔ حکومتی نہیں ریاستی ادارے ہدفِ تنقید ہیں اور دشمن کے ساتھ امن کی آشا کا بھجن گایا جا رہا ہے۔

جہاں تھوک کے حساب سے مایوسی بانٹی جا رہی ہے اور پاکستان کے حالات کو دارفور، قندھار اور غزہ کے محصورین سے بھی بدتر بیان کیا جا رہا ہے وہاں یہ خبر دینے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ بیرونِ ملک مقیم پاکستانی محنت کشوں کی ترسیل زر سالانہ گیارہ ارب ڈالر سے تجاوز کر گئی ہے اور صرف گزشتہ ایک مہینے میں بیرونِ ملک بسنے والے پاکستانی محنت کشوں نے جو سرمایہ پاکستان میں اپنے پیاروں کو بھیجا ہے وہ امریکہ اور یورپی یونین کی طرف سے دی جانے والی مجموعہ سالانہ امداد سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ پاکستان کی جغرافیائی اہمیت اور اس کے قدرتی وسائل تو خال ہی ہمارے میڈیا کا موضوع بنتے ہیں لیکن دستیاب نامساعد حالات میں بھی پاکستان کی برآمدات ترقی کرتے ہوئے اگر سالانہ پچیس ارب ڈالر تک پہنچ گئی ہے تو یہ پاکستانی قوم کی ہمت، سخت جانی اور جنگجویانہ صلاحیتوں کا مظہر ہے جس کی تحسین ہونی چاہیے، کہ ایک طرف اسے جنگ کا سامنا ہے اور دوسری طرف کئی کئی گھنٹے بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے باوجود اس قوم نے اپنی لگن، محنت اور جذبے کے بل بوتے پر پاکستانی ایکسپورٹ کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں 1947ء سے لے کر اب تک نہیں پہنچ سکی تھی یعنی پچیس ارب ڈالر جس کی وجہ سے پاکستان کے زرِ مبادلہ کے ذخائر اپنی تاریخ کے بلند ترین مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ بات فیشن ایبل تو نہیں لیکن ایک حقیقت ہے کہ پاکستان ترقی کر رہا ہے اور اس کا مستقبل بہت روشن ہے۔

گاندھی بنام موتی لال نہرو

ردِ عمل کے طور پر لکھنے سے میں گریز کرتا ہوں کیونکہ عمل کو افضل سمجھتا ہوں۔ بعض اوقات مگر ایسی صورتِ حال درپیش ہوتی ہے جس پر سچائی کے کسی بھی پیروکار کا خاموش رہنا بھی مناسب فعل نہیں ہوتا۔ ذرائع ابلاغ سے دلچسپی رکھنے والے احباب نے یقیناً یہ بات محسوس کی ہوگی کہ گزشتہ کچھ عرصے سے یوں لگتا ہے جیسے آج کل تحریکِ آزادی کی تاریخ دوبارہ لکھی جارہی ہے۔ نیز اس تحریک میں شامل کرداروں کے کردار کا تعین بھی نئے سرے سے کیا جارہا ہے۔ اس باب میں گاندھی جی کی عظمت کے بارے میں نئے نئے انکشافات ہورہے ہیں۔ میں اس مبینہ نئی تاریخ آزادی کے مصنفین پر ''ماضی تمنائی'' رقم کرنے کی تہمت تو نہیں لگانا چاہتا مگر گاندھی کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔ تاریخ کے مضمون سے دلچسپی کے سبب میری نظروں سے اس نوع کا مواد گزرا ہے جو اس موضوع پر ہونے والی گفتگو سے متعلق ہے اور بہرصورت اس بحث سے مطابقت رکھتا ہے۔

یہ دو عدد خطوط ہیں۔ ایک خط گاندھی کا موتی لال نہرو کے نام ہے اور دوسرا خط اول الذکر خط کا جواب ہے۔ امید ہے کہ ان کی اشاعت سے امن کی آشا کا بھجن کھنڈت نہیں ہوگا۔ ہاں! گاندھی کی شخصیت کو سمجھنے کے سلسلے میں یہ خطوط بے حد مددگار ہوسکتے ہیں۔ گاندھی کہ جنہیں آج کل ہمارے بعض دوست مہاتما بھی کہتے ہیں، جواہر لال نہرو کے والد موتی لال نہرو سے کچھ ناراض ناراض سے رہتے تھے۔ اس ناراضگی کی وجہ ان کی یہ شکایت تھی کہ موتی لال نہرو عوامی مقامات اور تقریبات میں سرعام شراب پیتے تھے۔ گاندھی کو یہ بات اس لیے کھٹکتی تھی کہ اس سے کانگریس پارٹی کے امیج پر برا اثر پڑنے کا

اندیشہ تھا۔اسی سلسلے میں انہوں نے موتی لال نہرو کو ایک خط تحریر کیا جو کہ تاریخ کا حصہ ہے۔ خلاصہ اس مکتوب کا کچھ یوں ہے کہ

''پیارے نہرو! آپ کلب میں اور بعض ایسے مقامات پر بھی شراب نوشی کرتے ہوئے پائے گئے ہیں جہاں بہت سے لوگ آپ کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔آپ کے اس عمل سے ایک طرف تو آپ کی ذاتی شہرت کو نقصان پہنچ رہا ہے، دوسری طرف انڈین نیشنل کانگریس کے بارے میں عوام کی عمومی رائے بھی منفی انداز میں متاثر ہو رہی ہے۔بہتر یہی ہے کہ آپ گھر بیٹھ کر پیا کریں یا پھر ایسی جگہ جا کر شراب نوش فرمائیں جہاں دیکھنے والے لوگ نہ ہوں۔مہربانی فرما کر آپ پبلک میں شراب نوشی سے احتراز برتیں۔''

اس خط کا جواب تو موتی لال نہرو نے مختصر ہی تحریر کیا۔مگر اس مختصر سی تحریر سے گاندھی جی کی پوری شخصیت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ یقین کیجیے کہ آپ کو گاندھی کی خود نوشت "My experiments with truth" جس کا ''تلاشِ حق'' کے نام سے اردو ترجمہ بھی اب دستیاب ہے، پڑھنے کے بعد بھی اس کی شخصیت کا اتنا صحیح اندازہ نہ ہو سکے گا جو ان مختصر سے خطوط کو پڑھ کر ہوتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ گاندھی کی آپ بیتی ان فضول ترین کتابوں کی فہرست میں سے ایک ہے جنہیں پڑھنے کے بعد احساس ہوا کہ میں نے وقت ضائع کیا ہے۔

موتی لال نہرو نے اپنے اس لازوال خط کی ابتدا اس نوکیلے فقرے سے کی کہ'' گاندھی جی! آپ کیوں مجھے پاکھنڈی (ڈرامہ باز) بنانا چاہتے ہیں'' اور پھر آگے مزید لکھتے ہیں کہ

''اگر میں شراب پیتا ہوں پھر تو مجھے سب کے سامنے بھی پینی ہی چاہیے۔اگر آپ مجھے شراب چھوڑنے کا کہیں تو دوسری بات ہے۔میں خود بھی سوچتا ہوں کہ مجھے شراب چھوڑ دینی چاہیے مگر جب تلک پیتا ہوں تب تلک تو پبلک کے سامنے بھی پینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔''

ان خطوط سے ہمیں بڑی حد تک ان حضرات کے سوچنے کا ڈھنگ اور زندگی گزارنے کا انداز سمجھ آتا ہے۔گاندھی کے رویے میں ہمیں صاف منافقت اور چھلکتی ہوئی مکاری نظر آ رہی ہے جو کہ

شراب چھوڑنے کا نہیں کہہ رہا بلکہ اسے لوگوں کے سامنے پینے کی ممانعت کر رہا ہے۔ گویا شراب میں تو کوئی خرابی وہ نہیں سمجھتے صرف عوام کے سامنے اسے پینے پر معترض ہیں۔

موتی لال نہرو کے خصائل اس کے بیٹے جواہر نہرو میں بھی نظر آتے ہیں۔ جب گاندھی چرخہ کات کر اپنے کپڑے خود بنتے اور لنگوٹ پہن کر ریل گاڑی کے تیسرے درجے میں سفر کرتے تو اس وقت بھی جواہر لال نہرو کے کپڑے فرانس سے دھل کر آتے تھے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے نہرو گاندھی کے مقابلے میں کم منافق تھا۔ ایک معروف بھارتی فلسفی وروحانی پیشوا سے سوال پوچھا گیا کہ اگر آپ کو یہ کہا جائے کہ مہاتما گاندھی کی شخصیت کو ایک فقرے میں بیان کریں تو آپ کیا کہیں گے؟

فلسفی کا جواب تھا کہ ''گاندھی انسانی تاریخ کا سب سے مکار سیاستدان تھا'' میرے خیال میں گاندھی کے متعلق یہ رائے کسی تعصب یا نفرت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کی زندگی کے تجزیے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچنا ہی قرینِ قیاس ہے۔

قائداعظم کا طرزِ زندگی اور اندازِ سیاست مگر یکسر مختلف تھا۔ وہ ڈھونگ اور سوانگ کے قائل نہ تھے۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ ایک دفعہ جب وہ گاندھی سے کسی معاملے پر گفتگو کے سلسلے میں ملنے کے لیے گئے، گاندھی زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور قائداعظم سے بھی اس نے فرشی نشست پر ہی بیٹھنے کے لیے اصرار کیا تو قائداعظم نے جواباً کہا تھا کہ آپ فرش پر ہی تشریف رکھیں مگر میرے لیے برائے مہربانی! ذرا کرسی منگوادیں۔

متاعِ ضمیر اور حرفِ رسا

سید احتشام ضمیر کے اخباری کالموں کا مجموعہ ''متاعِ ضمیر'' کے عنوان سے حال ہی میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ عصرِ حاضر کے اہم مسائل کا ہلکے پھلکے انداز میں تجزیہ اور ان پر تبصرہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ صحافت اور ادب میں ظرافت نگاری کو مشکل ترین صنف خیال کیا جاتا ہے۔ کالم نویسی کے فن میں جو شگفتگی اور برجستگی سید احتشام ضمیر کے ہاں پائی جاتی ہے وہ سخن وروں کی کہکشاں میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔ ان کے طنزیہ نشتر بھی شگفتگی میں بجھے ہوئے ہیں۔ نازک سے نازک بات ایسی سہولت اور شائستگی سے لکھ جاتے ہیں، جسے کہتے ہوئے اچھے اچھے لکھاریوں کے قلم کا سانس پھول جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں بیک وقت شوخی و پرکاری بھی ہے اور سادگی و سلاست بھی۔ اخبار میں ان کا پہلا کالم پڑھتے ہی میرے ذہن میں تو یہ سوال ابھرا تھا کہ ایسا باکمال لکھاری اب تک دریافت کیوں نہ ہو سکا؟ اور کیونکر قارئین کی نظروں سے اوجھل رہا؟ عین ممکن ہے ''متاعِ ضمیر'' پڑھ کر آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آئے۔ خیر دیر آید، درست آید۔

سید احتشام ضمیر اور سید ضمیر جعفری کا تقابلی جائزہ تو کسی بھی اعتبار سے جائز نہیں ہوگا مگر مشتاق احمد یوسفی کا یہ کہنا ''احتشام ضمیر کے قلم میں باپ والی کاٹ ہے'' اپنی جگہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف کیے بغیر بات مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔ ان کے موضوعات میں ایسا تنوع ہے جو ہم عصر اہلِ قلم میں کم کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ ایک خوبصورت پہلو تو ان کی تحریروں کا یہ بھی ہے کہ اپنی کہی ہوئی بات کو دہراتے نہیں ہیں۔ اسی لیے ہمیشہ ان کے کالم کا

انتظار رہتا ہے کہ ضرور کوئی نئی بات لکھی ہوگی۔ آج کل ہمارے ذرائع ابلاغ میں مایوسی کی بات کرنا فیشن ہے، ایسے ماحول میں امید اور روشن مستقبل کی بات کہنے کے لیے کافی حوصلہ درکار ہے، میرے نزدیک تو یہ عمل عین عبادت ہے۔

سید احتشام ضمیر کا امتیاز ہے کہ انہیں حقائق کا مکمل ادراک ہے، اس کے باوجود وہ پاکستانی قوم کے روشن مستقبل کے لیے پر امید ہیں۔ مقبولیت کی بجائے معقولیت ان کے نزدیک زیادہ اہم بات نظر آتی ہے۔ ان کے طنز و مزاح میں بھی دردمندی چھلکتی ہے۔ عمومی طور پر اساتذہ کرام کالم نویسی کو ادب کا حصہ نہیں مانتے ہیں مگر میری رائے میں ''متاعِ ضمیر'' ادبِ عالیہ میں داخل ہے۔ ادب کے قاری کی حیثیت سے میں ان کا ذاتی طور پر شکر گزار ہوں کہ انہوں نے وطنِ عزیز کے سپاہی کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دینے کے بعد دفاعی تجزیہ کار بننے کی بجائے قلم کے ذریعے خدمت کو افضل سمجھا۔

نہایت اعلیٰ طباعت، معیاری امپورٹڈ کاغذ پر اس کتاب کو نستعلیق مطبوعات نے لاہور سے شائع کیا ہے۔ متاعِ ضمیر کا دیباچہ عطاء الحق قاسمی نے تحریر کیا ہے، ان کے علاوہ جمیل یوسف، الطاف حسن قریشی، انور نسیم، روبینہ تحسین بینا، سرفراز شاہد، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، جبار مرزا اور راقم الحروف کی رائے اس کتاب میں شامل ہے۔

کتاب کا سرِ ورق بڑا جاذبِ نظر ہے جو کہ سید ضمیر جعفری کی تصویر سے آراستہ ہے۔ ستر کے قریب منتخب کالموں پر مشتمل اس کتاب میں رنگین تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ کالموں کے مجموعے کے لیے تصویروں کی شمولیت ایک نیا تجربہ ہے، مگر انتہائی دیدہ زیب اور بہت خوب لگ رہا ہے۔

تین سو کے قریب صفحات پر مشتمل اس خوبصورت کتاب کی قیمت چار صد روپے ہے، جو کہ مہنگائی کے اس دور میں مناسب ہی معلوم ہوتی ہے۔

ایک اور خوبصورت کتاب کا ذکر میں آپ سے ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ کتاب کا نام ''حرفِ رسا'' ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی دعاؤں پر مشتمل اس کتاب کو نوجوان محقق اور دانشور

اعجاز احمد نے بڑی محنت اور محبت سے مرتب کیا ہے۔ پانچ سو سے زائد صفحات پر مشتمل اس کتاب کے اکتالیس ابواب ہیں، جس میں نبی کریم ﷺ کی سینکڑوں دعائیں شامل ہیں۔ اس کتاب کو مصنف نے معروف روحانی شخصیت پروفیسر احمد رفیق اختر کا فیضانِ نظر قرار دیا ہے۔ حرفِ رَسا کا امتیاز یہ ہے کہ اس کے حواشی وتشریحات عصرِ حاضر کی مستعمل اور عام فہم زبان میں تحریر کی گئی ہیں۔ رسولِ پاک ﷺ کی خوبصورت دعاؤں کا یہ گلدستہ بیت الحکمت پبلشرز نے شائع کیا ہے۔ کتاب کی قیمت 1200 روپے ہے لیکن میرے شہر میاں چنوں سے تعلق رکھنے والے محقق اور دانشور اعجاز احمد، جنہوں نے یہ کتاب مرتب کی ہے، انہوں نے کتاب میں اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ یہ کتاب ہر مسلمان تک تحفتاً پہنچانے کی خواہش وجذبہ رکھتے ہیں۔ نبی پاک ﷺ کی دعاؤں کو اکٹھا کرنا اور خوبصورت کتاب کی شکل میں شائع کرانا بلاشبہ ایک عظیم سعادت ہے اور اہلِ ایمان تک تحفتاً پہنچانا ایک عظیم نیکی ہے، پہنچانے کی نیت ہی بڑے ثواب کی بات ہے۔

متاعِ ضمیر اور حرفِ رسا پاکستان کے تمام بڑے شہروں کے اچھے کتب خانوں پر باآسانی دستیاب ہیں۔ کتاب سے تعلق رکھنے والے احباب انہیں ضرور پڑھیں۔

حصہ سوم

جہانِ دگر

پابلو نرودا کے چلّی میں چند روز

اس مرتبہ چلّی کا میرا یہ مختصر دورہ ویسے تو نجی و کاروباری نوعیت کا تھا مگر لاطینی امریکہ میں چند برس مقیم رہنے اور ہسپانوی زبان جاننے کے سبب میں اس سماج کے کچھ ایسے پہلوؤں سے بھی واقف ہوں جو عام پاکستانی سیّاح خال خال ہی جان پاتے ہیں اور جو جانتے بھی ہیں وہ انہیں تحریر کرنے کا تردد کم ہی کرتے ہیں۔ یہ خطۂ ارض اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود ابھی تک پاکستانیوں کی کوئی محبوب منزل نہیں بن سکا ہے۔اس کی بظاہر وجہ دورافتادگی بھی ہے کہ کم از کم پرواز کا دورانیہ بیس گھنٹے اور بعض صورتوں میں تو پاکستان اور جنوبی امریکہ کے درمیان کا فاصلہ طے کرنے کے لیے تیس گھنٹے سے بھی زیادہ عرصہ تک محوِ پرواز رہنا پڑتا ہے۔انہی باتوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے میں آپ لوگوں کو بھی اس سفر کے کچھ مشاہدات میں شریک کرر ہا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ دنیا کا ہر کونا دیکھنے کے قابل ہے اور ہر ملک ایک منفرد جگہ ہے۔

لاطینی امریکہ کا موسم بالکل الٹا ہے کہ جون جولائی سخت سردی کے مہینے ہیں اور دسمبر میں گرمی پڑتی ہے۔ چلّی کا ذکر کریں تو اہلِ قلم کے ذہن میں فوراً پابلو نرودا کا نام آتا ہے۔اتفاق ایسا ہے کہ مجھے پابلو نرودا کے نام اور شاعری کے بارے میں معلومات پہلے ملی تھیں اور چلّی کے وجود کی خبر بہت بعد میں ہوئی تھی اور وہ بھی نرودا کے ہی حوالے سے، اس لیے میرے دل میں یہ بات ہے کہ شاید باقی ہم وطنوں کا بھی یہی معاملہ ہو۔اسی سبب سے میں پابلو نرودا کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں۔جس طرح چلّی کی ریاست اور نرودا لازم و ملزوم

حوالے بن چکے ہیں تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ آپ لوگوں کے ساتھ اس نوبیل انعام یافتہ مزاحمت کار شاعر، منجھے ہوئے سفارتکار اور اپنے ملک کی صدارت کے لیے منتخب امیدوار کی سنیا گو میں واقع رہائش گاہ کے کچھ اندرونی مناظر پر گفتگو کی جائے جو کہ اب ایک مقبول میوزیم اور سیاحتی مرکز بن چکی ہے۔ نرودا کے دوسرے شہروں میں واقع دیگر دونوں مکان بھی میوزیم میں تبدیل کیے جا چکے ہیں اور اس کی قبر بھی ازلا نیگرا والے گھر کے صحن میں اپنی بیوی متلدے کے پہلو میں ہی ہے مگر سنتیا گو والا گھر اس لیے زیادہ اہم ہے کہ نرودا کی عمر کا بیشتر حصہ اسی مکان میں گزرا ہے۔ اس رہائش گاہ میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو منفرد اور لکھنے کے قابل ہیں۔

سب سے پہلے تو پہاڑی پر واقع اس رہائش گاہ کا نام ہی بڑا دلچسپ ہے ''لاچسکونا'' شاعر کے اپنی بیوی کے بالوں کی نسبت سے گھر کو دیے گئے اس نام کا اردو ترجمہ ''زلفِ پریشاں'' مناسب رہے گا۔ دراصل "La Chascona" پرانی ''ان کا'' تہذیب کی زبان ''کیچوا'' کا لفظ ہے اور نرودا اپنی گھنگھریالے بالوں والی تیسری بیوی متلدے کو پیار سے اسی نام سے بلایا کرتا تھا۔

گھر میں رکھے گئے تمام گلاس رنگین ہیں۔ کوئی سرخ، کوئی سبز اور نیلے رنگ سمیت تمام رنگوں کے گلاس موجود ہیں مگر کوئی بھی بے رنگ گلاس نہیں ہے۔ اس کی وجہ شاعر کی یہ خودساختہ تھیوری تھی کہ گلاس کا رنگ بدلنے سے مشروب کا ذائقہ بدل جاتا ہے۔ گھر کا ایک حصہ بالکل بحری جہاز کی طرز پر تعمیر کیا گیا ہے۔ وہی فرش اور چھت کا نقشہ اور ویسا ہی دونوں کا درمیانی فاصلہ۔ دیواروں اور فرنیچر کی بناوٹ بھی بالکل بحری جہاز جیسی بلکہ ایک لمحہ تو یوں محسوس ہوا جیسے جہاز کے اندر آ گئے ہیں۔ اس سے نرودا کی سفر سے رغبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

میکسیکو کے عہد ساز مصور اور کیمونسٹ رہنما ڈیگو راویرا کے ہاتھ کی بنائی ہوئی نرودا کی بیوی متلدے کی پینٹنگ بہت سحر انگیز ہے۔ اس فن پارے میں متلدے کے ایک ہی جسم پر دو چہرے دکھائے گئے ہیں جن کو اس کی گھنی زلفوں سے ڈھانپا ہوا ہے اور زلفوں کے

اندر نرودا کا عکس ہے۔ یاد رہے یہ وہی ڈیگوراویرا ہیں جن کے گھر روسی بالشویک انقلاب کے ہیرو ٹراٹسکی نے اسٹالن حکومت کی جانب سے جلاوطن کیے جانے پر اپنی زندگی کے بقیہ ایام گزارے تھے۔اس کے علاوہ دیواروں پر پابلو پکاسو کے ہاتھ کی بنی ہوئی پینٹنگز آویزاں ہیں اور نرودا کی پکاسو کے ساتھ 1950ء کی کچھ تصویریں۔ جی ہاں! وہی معروف مصور پکاسو جس کی بنائی ہوئی تصاویر کی قیمت اب اربوں ڈالر میں ہے۔ پکاسو اور ڈیگوراویرا کے علاوہ بہت سے نوبیل انعام یافتہ یا پھر اسی فنّی سطح کے فنکار پابلو نرودا کے ذاتی دوست تھے جس کا پتہ یہ میوزیم دیکھ کر چلتا ہے۔

رہائش گاہ کے اندر دو میکدے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ نرودا بلانوش تھا۔ مگر بڑے مہ خانے میں مجھے جس چیز نے متوجہ کیا وہ تین فٹ لمبے جوتوں کا جوڑا اور غیر معمولی طور پر بڑی گھڑی تھی۔ میں نے اپنے تجسس اور حیرت کو جب سوال بنا کر گائیڈ لڑکی آلیخاندرہ سے بیان کیا تو اس نے بتایا کہ گزشتہ صدی میں ہمارے ہاں شرح خواندگی بہت کم تھی اور جو پڑھنا جانتے تھے ان میں سے کوئی مقامی زبان جانتا ہے تو کوئی ہسپانوی اور کوئی دونوں میں سے ایک بھی نہیں جانتا بلکہ ولندیزی پڑھا ہے۔اسی تناظر میں یہ بڑے جوتے اور گھڑی وغیرہ دکاندار سائن بورڈ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ظاہر ہے یہ ایک پورا عہد تھا جس کی نمائندگی بار میں پڑے جوتے اور گھڑی کر رہے ہیں۔

گھر کی لائبریری میں موجود کتابیں اور دیگر سامان تو 1973ء کی فوجی بغاوت کے وقت فوجی اہلکار لوٹ کر لے گئے تھے مگر اب لائبریری کو نرودا کے سفارت کے دور میں زیر استعمال رہنے والی اشیاء سے سجایا گیا ہے۔ اسی فوجی بغاوت کے چند دن بعد مشکوک حالات میں پابلو نرودا کا انتقال ہو گیا تھا جس کو اکثریت ایک قتل قرار دیتی ہے۔اس کی تفصیل میری حال ہی میں پابلو نرودا اور گبریلا مسترال کی شاعری کے ہسپانوی سے اردو زبان میں کیے گئے ترجمے کی کتاب ''محبت کے دو رنگ'' میں موجود ہے۔

دورانِ پرواز میری ملاقات ایک ماہر آثار قدیمہ خاتون سے ہوئی، جس کو جب یہ

پتا چلا کہ میرا تعلق تاریخی ہڑپہ شہر کے قریبی علاقے میاں چنوں سے ہے تو وہ ہڑپہ کی قربت کی بنیاد پر میرے صدقے واری جانے لگی۔ سندھ کی تہذیب پر سیر حاصل گفتگو کے بعد میں نے اس سے مشورہ طلب کیا کہ سنتیاگو میں سیر کرنے کے لیے کون سی جگہ تجویز کرو گی، تو اس نے کہا کہ پہلے وعدہ کرو مذاق تو نہیں اڑاؤ گے؟ میری یقین دہانی پر کہنے لگی کہ سنتیاگو کا کیتھولک قبرستان جا کر دیکھو۔ مجھے اس مشورے پر ذرا بھی حیرانی نہیں ہوئی کیونکہ اس سے پہلے میں سن چکا تھا کہ ہمارے ایک نئے آنے والے پاکستانی دوست قبرستان کو پارک سمجھ کر بچوں کو سیر کروانے لے کر گئے تھے۔ بلکہ وہ تو سیر کروا کر بھی آ گئے تھے، گڑبڑ تو تب ہوئی جب انہوں نے اس پارک کا پتا ایک دوسرے پاکستانی دوست کو بتایا جنہوں نے سارے شہر میں ڈھنڈورا پیٹ دیا۔ چلی میں مقیم زیادہ تر پاکستانی ری کنڈیشن گاڑیوں کے کاروبار سے منسلک ہیں اور ایک خاندان کی طرح ہی رہتے ہیں۔ مجموعی تعداد دو سو افراد کے قریب ہے۔

کیتھولک قبرستان جانا ایک تلخ تجربہ ثابت ہوا۔ بات ایسی ہے کہ بیان کے لیے مناسب الفاظ کا چناؤ مشکل ہو رہا ہے۔ وہاں بہت سی قبریں ایسی ہیں جن پر لکھے نام مسلمانوں والے ہیں مگر ان کے کتبوں پر صلیب کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ یہ ماضی میں یہاں آ کر آباد ہونے والے عربوں کی قبریں ہیں۔ ایسی ہی ایک قبر پر یوسف بن عبداللہ لکھا تھا اور صلیب کا نشان بھی بنا ہوا تھا، اس قبر پر میں نے سیاہ سکرٹ میں ملبوس ایک خاتون کو سرخ گلاب کی ایک شاخ رکھتے ہوئے دیکھا۔ یہ سوچ کر بہت تکلیف ہوئی کہ ملک سے باہر رہنے کی قیمت اتنی زیادہ بھی ہو سکتی ہے؟

پاکستان کی طرح یہاں بھی تعلیمی اداروں میں نئے تعلیمی سال کا آغاز عموماً اپریل میں ہی ہوتا ہے۔ فرسٹ اپریل فول ہماری طرح یہاں بھی ہوتے ہیں مگر نئے آنے والے طلباء کے ساتھ ہونے والی ''فولنگ'' دنیا کے باقی ممالک کی نسبت یہاں ایک مختلف اور منفرد معاملہ ہے۔ کالج کے نئے طلباء و طالبات کو برہنہ کر کے شاپنگ بیگ اور رنگین لفافوں کا لباس پہنا کر مرزا غالبؔ کے مصرعے

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا کی عملی تصویر بنا کر شہر کے ہر اہم ٹریفک سگنل پر چندہ اکٹھا کرنے کے لیے ہاتھ میں شاپر پکڑا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ جسم کو ڈھانپنے کے لیے مومی لفافوں کے علاوہ مختلف رنگوں کا پینٹ بھی استعمال کیا جاتا ہے اور چہروں پر بھی رنگین نقش نگاری کی جاتی ہے تاکہ نئے طلباء پہچانے نہ جا سکیں اور انہیں اس حلیے میں فنڈ ریزنگ کرتے ہوئے شرم محسوس نہ ہو۔ کل سمندر کے کنارے سڑک پر جاتے ہوئے ہماری گاڑی تک بھی ایسے دو طالب علم پہنچے تھے۔ ساحل سمندر پر غسل آفتابی کرنے والوں کا رش تھا اس لیے ان طلباء کی بے لباسی زیادہ محسوس نہیں ہوئی بلکہ ان کے چہروں پر کی گئی نقاشی نے زیادہ گہرا تاثر چھوڑا۔

سرِ وادیٔ سینا

دمشق سے زبدانی کوئی زیادہ دور نہیں ہے، اگر کار میں سفر کریں تو یہ مسافت کم وبیش دو گھنٹے کی ہے مگر دمشق اور زبدانی کے موسم میں بہت فرق ہے۔ جون، جولائی کے مہینوں میں جب دمشق میں خوب گرمی پڑ رہی ہوتی ہے تو زبدانی میں خنکی اور ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔اس موسمی فرق کی وجہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ زبدانی قدرے بلند پہاڑی علاقہ ہے۔ انہی بل کھاتی پہاڑیوں کی ایک چوٹی پر حضرت ہابیل ◆ کی قبر ہے۔ ہابیل جو فرزندِ آدم اور اپنے سگے بھائی قابیل کے ہاتھوں قتل ہوئے، نسلِ انسانی کے پہلے مقتول ہیں۔ حضرت ہابیل ◆ کے مقبرے سے نکل کر دیکھیں تو ایک طرف اسرائیل کی پہاڑیاں صاف نظر آتی ہیں اور دوسری طرف لبنان کے پہاڑی سلسلے۔ بلا مبالغہ، اگر آپ صبح کے وقت عازمِ سفر ہوں تو شام تک یہاں سے پیدل اسرائیل اور لبنان سے ہوتے ہوئے واپس ملکِ شام میں پہنچ سکتے ہیں۔ ہاں! اس سفر کی اجازت آپ کو اگر نہیں مل سکتی تو یہ خالصتاً ایک سفارتی معاملہ ہے۔

ہابیل ◆ جہاں قتل ہوئے، اسی پہاڑی پر اسرائیل اور لبنان کی طرف رخ کر کے میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ سرسبز و شاداب پہاڑیوں کا یہ جنت نظیر خطہ اس قدر متشدد کیوں ہے؟ مقامی لوگوں سے بات چیت کر کے دیکھیں تو شیریں دہن اور حد درجہ مہمان نواز ہیں، تاریخ اور حال پر نظر دوڑائیں تو خون کی ایک طویل لکیر، لہو کی اک موجِ مسلسل رواں دواں ہے۔ سیاہ لباس اور کلاہ میں ملبوس گھنی سفید داڑھی والے ایک عیسائی راہب

سے میں نے یہی سوال پوچھا تھا کہ اس کبھی نہ تھمنے والی خون ریزی کا سبب کیا ہے؟ شفیق مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اس عراقی نژاد، شامی آرتھوڈوکس مسیحی بزرگ نے ایک لمحے کے لیے سوچا، کچھ توقف کے بعد کہنے لگا کہ اس سرزمین پر خدا کے پیغمبروں کا ناحق خون بہایا گیا ہے، یسوع مسیح کو یہاں مصلوب کیا گیا ہے، یہ ان مظلومین کے لہو کا اثر ہے۔ آج کی خون آشامی کی جڑیں ماضی میں بہت گہرائی میں موجود ہیں۔ اس راہب کا تو کہنا تھا کہ یہاں کبھی بھی امن قائم نہیں ہوگا، اس دھرتی پر نظر آنے والا تشدد مظلوموں کے خون کی تاثیر ہے۔

ٹوکیو میڈیکل یونیورسٹی میں نیوروفزیالوجی پڑھانے والا میرا دوست پروفیسر میرے اس سوال کو سائنسی انداز میں دیکھتا ہے۔ نیوروفزیالوجی کے شعبے کو آپ دماغ کی ساخت اور افعال کے مطالعے کا نام دے سکتے ہیں۔ یہ نیم ملحد پروفیسر پیغمبروں کی سرزمین میں جاری تشدد کی لہر کو طب کی زبان میں ''مرّر نیورو'' سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کی وضاحت وہ یوں کرتا ہے کہ جب ہم کسی عمل کو وقوع پذیر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں یا کسی شخص کو کوئی بھی فعل سرانجام دیتے ہوئے کا منظر ہماری نظروں سے گزرتا ہے تو ہمارے دماغ میں بھی اس عمل سے متعلق خلیے حرکت میں آجاتے ہیں۔ جب ہم درد میں مبتلا زخمی یا دکھی افراد سے ملتے ہیں تو ہمارے دماغ کے اندر درد، تکلیف اور دکھ سے متعلق خلیئے حرکت میں آجاتے ہیں جن کے سبب ہم میں ایسا منظر دیکھ کر جذبۂ رحمی پیدا ہوتا ہے، ترحم اور ہمدردی کے علاوہ دل پسیج جانا اور رنج وغم میں مبتلا ہو جانے کی وجہ بھی یہی ہے۔ کسی کو روتے دیکھ کر غدودِ گریہ سے آنسوؤں کا اخراج بھی ''مرّر نیورو'' کی ایک مثال ہے۔ ماہرین نفسیات وطب کے نزدیک ڈرٹی پکچرز کے متعلق بھی یہی معاملہ کارفرما سمجھا جاتا ہے۔ غرض اگر معاشرے میں تشدد پھیل جائے تو پھر پر تشدد اور خون خرابے پر مبنی مناظر دیکھنے سے تشدد اور خون ریزی سے متعلق دماغی خلیے کام کرنا شروع کر دیتے ہیں، نتیجتاً سماج میں متشدد رویے پروان چڑھتے ہیں۔ پروفیسر کی بات اس لیے کچھ دل کو لگتی ہے کہ اس سے ہمارے فوک وزڈم کو، جس میں بچوں کو بُری محفل اور بری صحبت وسنگت سے بچنے کی تلقین کی جاتی ہے، ایک سائنسی اور خالصتاً طبی

بنیادفراہم ہوتی ہے۔روسی زبان میں مثل مشہور ہے کہ ''مجھے تم اتنا بتا دو کہ تمہارا دوست کون ہے؟ میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کون ہو۔''

دمشق کی جامعہ بنی امیہ جسے امیہ مسجد بھی کہا جاتا ہے،اس کے مرکزی ہال میں داخل ہوں تو پندرہ،بیس فٹ کی اونچائی پر یزید کا تخت نظر آتا ہے،تخت کے سامنے وہ مقام ہے جہاں کربلا سے لائے گئے قیدیوں کو سن 61 ہجری میں کھڑا کیا گیا تھا،اس مقام کو مسجد کے فرش کی عمومی سطح سے قریباً ایک فٹ اونچا تعمیر کر کے اردگرد باڑ لگا دی گئی ہے،یہیں کھڑے ہو کر سیدۃ زینبؓ نے دربارِ یزید سے اپنا تاریخی خطاب کیا تھا۔ چند قدم ادھر خدا کے سچے پیغمبر یحییٰ کا سر مبارک دفن ہے، یحییٰ علیہ السلام،جنہیں عیسائی دنیا جان دی بپٹسٹ کے نام سے جانتی ہے،عیسائیوں میں بتسمہ کی رسم انہی سے منسوب ہے،حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کزن ہونے کے علاوہ یسوع مسیح کی رسمِ بتسمیہ بھی انہی نے ادا کی تھی۔حضرت یحییٰ علیہ السلام کا دھڑ یروشلم میں دفن ہے،بعض روایات کے مطابق انہیں قتل کرنے کے بعد جسد آخر کار مصر میں اور سر مبارک کاٹ کر دمشق میں مقام مذکورہ پر دفن کیا گیا تھا۔یاد رہے کہ مسجد امیہ مسلمانوں کی آمد سے قبل مسیحی گرجا گھر تھا،کئی برس تک یہ مقام مسلمانوں اور عیسائیوں کی مشترکہ عبادت گاہ رہا۔ولید بن عبدالمالک نے جب مسجد کی تعمیر نو کی تو ساتھ ہی اسے فقط مسلمانوں کے لیے مخصوص کر دیا مگر اب بھی روزانہ دنیا بھر سے عیسائی زائرین مسجد میں مقامِ یحییٰ کی زیارت کے لیے کثیر تعداد میں آتے ہیں۔

مسجد کے صحن میں داخل ہوں تو دائیں طرف امام زین العابدینؑ کا زندان ہے۔کربلا معلیٰ سے امام حسینؓ کا سر کاٹ کر لشکر یزید اپنے ہمراہ دربار میں پیش کرنے کے لیے لے آیا تھا۔یزید کے حکم پر راس الحسینؓ کو امام زین العابدینؑ کے اسی زندان میں دفن کیا گیا،مقصد شاید عبرت دلانا ہو،اب یہ مقام انہی کے نام سے منسوب ایک چھوٹی سی مسجد ہے،لوگ راس الحسینؓ کی زیارت کے بعد یہاں نوافل ادا کرتے ہیں۔ جامع بنی امیہ کے احاطہ سے باہر نکلتے ہی ایک طرف صلاح الدین ایوبی کا مزار ہے تو دوسری طرف امام حسینؓ

کی چار سالہ بیٹی سکینہ کا روضہ ہے، جو دورِ یزید میں روایت کے مطابق بی بی سکینہ کا زندان ہوا کرتا تھا، معصومہ کی شہادت کے بعد یہی مقام ان کا مدفن بن گیا۔ سرِ وادئ سینا ظالم اور مظلوم اب بدل گئے ہیں، نئے دور نے نئے ظالموں کو جنم دیا ہے اور مظلومین بھی تبدیل ہو چکے ہیں مگر خون ریزی قابیل کے ہاتھوں یہاں پہلے انسانی قتل سے لے کر آج کے دن تک جاری و ساری ہے۔ بہت عجیب و غریب مقدر ہیں اس دھرتی کے، کہ جس کے چپے چپے پر پیغمبروں کے قدموں کے آثار ہیں اور ذرّے ذرّے پر انسانوں کے ناحق خون کے چھینٹے پڑے ہیں۔

11 ستمبر ایک اور بھی ہے

نیو یارک کے جڑواں میناروں سے ٹکراتے دو جہاز، عمارتوں سے اٹھتا ہوا دھواں اور آگ کے شعلے وہ پہلا تصور ہیں جو 11 ستمبر کے ذکر کے ساتھ ہمارے ذہن کی سکرین پر نمودار ہوتا ہے۔ 9/11 کو ہی واشنگٹن شہر میں قائم پینٹا گون سے بھی ایک مسافر طیارہ ٹکرایا اور ایک اغوا شدہ جہاز کو اسی دن امریکی فضائیہ نے خود ہی مار گرایا، کیونکہ شک تھا کہ اس مسافر طیارے کو دہشت گردی کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ بنیادی اہمیت نیو یارک کے ٹوئن ٹاور کو پیش آنے والے حادثے ہی کو حاصل رہی۔ وجہ اس کی شاید یہ تھی کہ انسانی جانوں کا ضیاع سب سے زیادہ اسی حادثے میں ہوا۔ نیو یارک کو چونکہ پورے عالم کا دارالحکومت کہا جاتا ہے تو یہ بھی اس کی اہمیت کی بنیاد ہے۔ امن اور انسانیت سے محبت رکھنے والے ہر انسان کو اس سانحے نے افسردہ کر دیا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں ''گراؤنڈ زیرو'' گیا، جہاں پر کبھی جڑواں مینار کھڑے تھے، تو میں نے وہاں پر ایک پنجابی نظم اس حوالے سے لکھی تھی۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے مذکورہ مقام پر 9/11 کے حادثے کے کوئی ایک سال بعد میرا جانا ہوا تھا، حادثے میں جاں بحق ہونے والوں کی یادگار تعمیر ہو رہی تھی، وہاں پہنچا تو یہ انکشاف بھی ہوا کہ 9/11 حادثے میں ہلاک ہونے والے زیادہ تر لوگوں کی لاشیں ملبے کے ڈھیر سے نہیں نکالی جا سکی تھیں، لہٰذا یادگار جسے ''9/11 میموریل'' کہا جاتا ہے، ان لاشوں کے اوپر ہی تعمیر ہوئی ہے، اس میموریل کو اجتماعی قبر بھی کہا جا سکتا ہے۔

آج مگر میں آپ سے کسی اور گیارہ ستمبر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ آج سے ٹھیک

چالیس برس پہلے اس 9/11 آپریشن میں بھی امریکی طیارے استعمال ہوئے تھے۔ امریکی فضائیہ کے پائیلٹ نہ صرف ایف سولہ طیاروں کو فضائی نگرانی کے لیے استعمال کر رہے تھے بلکہ امریکی خفیہ ادارے CIA کے اہلکار باقاعدہ طور پر جنرل پنوچے کی فوج کے شانہ بشانہ، منتخب حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے اس آپریشن میں حصہ لے رہے تھے۔ جی ہاں! میں گیارہ ستمبر 1973 میں چلی کے عوام کی دوتہائی اکثریت سے منتخب کردہ سوشلسٹ حکومت کے خلاف فوجی بغاوت کی بات کر رہا ہوں۔ سالوادور آیندے کو صدارتی محل میں بمشکل تین سال گزرے تھے جب امریکی معاونت سے چلّی کے جرنیلوں نے اس کا تختہ الٹ دیا۔ تاریخ کی کتابوں میں بی بی سی لندن کی کھینچی ہوئی وہ تصویر موجود ہے جس میں 9/11 کے روز، اپنی موت سے کچھ لمحے پہلے سالوادور آیندے، ہاتھ میں سٹین گن پکڑے سنتیا گو میں واقع صدارتی محل کی راہداریوں میں گھوم رہا ہے۔ یہ سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان ہونے والی سرد جنگ کے عروج کا زمانہ تھا، ان دنوں امریکہ بہادر دائیں بازو کی ہر ملک میں ہونے والی فوجی بغاوت کی بھرپور حمایت کر رہا تھا، جمہوریت کے نغمے اور انسانی حقوق کے ترانے بہت بعد میں ریلیز ہونا شروع ہوئے ہیں۔

امریکی 9/11 تو فقط ایک ہی دن کا المیہ تھا مگر اس کی مدد سے جو 9/11 چلّی میں برپا ہوا، وہ ایک طویل المیے کا نقطۂ آغاز تھا۔ سترہ سال تک جنرل پنوچے مطلق العنان حکمران رہا۔ فوجی بغاوت کے چند ہی روز بعد نوبل انعام یافتہ شاعر پابلو نرودا کی مشکوک حالات میں موت واقع ہوگئی، عوام کی غالب اکثریت متفق ہے کہ انہیں قتل کیا گیا۔ اسی پس منظر میں عدالت نے حال ہی میں پابلو نرودا کی قبر کشائی کا حکم دیا تھا اور آج کل طبّی تجزیوں کے بعد میڈیکل رپورٹ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ یاد رہے کہ 1969ء میں چلّی کی کیمونسٹ پارٹی نے صدارت کے لیے پابلو نرودا کو نامزد کیا تھا مگر اس خوش نوا شاعر نے اپنے دیرینہ دوست اور کامریڈ آیندے کے حق میں دستبردار ہونے کا اعلان کیا، یوں سالوادور آیندے صدر منتخب ہوئے تھے۔

چلی کے جنوبی علاقوں میں رہنے والے دوست بتاتے ہیں کہ جنرل پنوچے کے زمامِ اقتدار سنبھالنے کے کئی مہینے بعد تک، یہ ہر صبح کا معمول تھا کہ ہمیں دریا کی سطح پر انسانی لاشیں تیرتی نظر آتی تھیں، یہ لاشیں سوشلسٹ خیالات کے حامی سیاسی کارکنوں کی ہوا کرتی تھیں۔ تین ہزار سیاسی کارکن تو ایسے لا پتہ ہوئے کہ ان کی لاشیں بھی آج تک نہیں مل سکیں۔ پروفیسر گلوریا مونیز، جنہوں نے میری شاعری کا ہسپانوی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے، اس 9/11 کو یاد کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ ہم سب احتجاج کرنے والوں کو فوجیوں نے گلی محلوں سے پکڑ دھکڑ کر ٹرکوں میں ڈالا، اور سنتیا گو کے مرکزی اسٹیڈیم میں جمع کر دیا تھا، ہم سب لوگ نعرے لگا رہے تھے اور گیت گا رہے تھے۔ اسی دوران معروف عوامی گلوکار وکٹر ہارا بھی گرفتار ہو کر ہمارے ساتھ شامل ہو گیا، کہیں سے گٹار بھی آ گیا، یہاں یہ ذکر ازبس ضروری ہے کہ حالات جیسے بھی نازک، تلخ ہوں، لاطینی امریکہ کے لوگ موسیقی اور رقص کو فراموش نہیں کرتے، پھر کیا تھا کہ وکٹر ہارا نے گٹار تھاما اور انقلابی گیت گانا شروع کر دیے، اس کے نغموں نے تمام اسیروں میں ایک نیا جذبہ جگا دیا۔ مارشل لاء حکام نے جب صورتِ حال بے قابو ہوتے دیکھی تو انہوں نے سب قیدیوں کے سامنے، گٹار بجاتے ہوئے وکٹر ہارا کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے۔

سنتیا گو کے صدارتی محل کے سامنے واقع بلڈنگ، جہاں سے گیارہ ستمبر کو فائرنگ کی گئی اور بارود کے گولے داغے گئے، اس عمارت پر بارود کے نشان آج بھی صاف نظر آتے ہیں، صدارتی محل کی سیر کروانے والے میزبان نے بتایا کہ جان بوجھ کر اس عمارت پر رنگ و روغن نہیں کیا جاتا، تاکہ یہ داغ سڑک پر آتے جاتے لوگوں کو ماضی یاد دلاتے رہیں۔ جب تک جنرل پنوچے برسر اقتدار رہا 9/11 کو یومِ نجات منایا جاتا تھا، لیکن اس کی رخصتی کے بعد اسے لوگ یومِ سیاہ کے طور پر مناتے ہیں اور ''ستمگر ستمبر'' کہہ کر یاد کرتے ہیں۔

اس گیارہ ستمبر کی یاد یوں آئی کہ چالیسویں برسی سے چند روز پہلے، چلی کی عدلیہ کے نمائندہ ادارے نے

عدالت کی جانب سے قوم سے معافی مانگتے ہوئے بیان جاری کیا ہے، کہ جنرل پنوچے کے دور میں اس وقت کے ججوں نے شہریوں کے بنیادی حقوق کا محافظ ہونے کا اپنا فرض اور کردار یکسر ترک کر دیا تھا۔ معذرت خواہانہ بیان میں کہا گیا ہے کہ

''بالخصوص سپریم کورٹ، ریاستی بدسلوکی کے دوران شہریوں کے تحفظ کی ذمہ داری نبھانے میں ناکام رہی، آمریت کے دوران جن پر مظالم ڈھائے گئے ان کے حقوق کو تحفظ دینے کے لیے عدلیہ کو بہت زیادہ کام کرنا چاہیے تھا۔''

مزید یہ کہا گیا کہ

''اب متاثرین اور معاشرے سے معافی مانگنے کا وقت آ گیا ہے۔ ججوں نے مداخلت کا مطالبہ کرنے والے متاثرین کی حالتِ زار کو رد کر دیا تھا۔''

میری نظر میں عدالت نے معافی مانگ کر اپنی توقیر بڑھائی ہے۔

اگر ہم زیادہ پرانی بات نہ بھی کریں، پرویز مشرف اور ضیاء الحق کے ادوار تو ابھی کل کی بات ہیں، ان آمریتوں میں ہماری عدلیہ نے جو کردار ادا کیا تھا، کیا اسے اپنے اس کردار پر معافی نہیں مانگنی چاہیے؟ میرے خیال میں یہ پاکستانی عوام کا عدالت پر قرض ہے۔

ٹالسٹائی مسلمان تھا؟

رسول حمزہ پہلی نظر میں تو کسی مافیا کا رکن دکھائی دیتا ہے، سونے کے دانتوں سے لیس مسکراہٹ چہرے پر سجائے، اس نے بڑی بے تکلفی سے اپنا موبائل فون میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا کہ ''بھائی! یہ جاپانی عورت کیا کہہ رہی ہے؟ فون سن کر مجھے ذرا روسی زبان میں ترجمہ بتاؤ۔'' ویسے تو روسی لوگوں کی اکثریت ہی بے تکلف ہوتی ہے لیکن سیاہ بالوں والا یہ نوجوان، جو نین، نقش سے کوہِ قاف کے علاقے سے آیا محسوس ہو رہا تھا، کچھ زیادہ ہی بے تکلف تھا۔ مگر اس کی بے تکلفی میں ایک گرمجوشی، اپنائیت اور خلوص کا رنگ چھلکتا تھا، اس لیے یہ بے تکلفی بھلی لگی۔ اور ہاں! یہاں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ میں جنات، دیو اور پریوں کی سرزمین کوہ قاف کا ذکر نہیں کر رہا بلکہ روس کے مسلم اکثریتی، پہاڑی علاقے کا تذکرہ مقصود ہے۔ میں نے بخوشی موبائل فون پکڑ کر بات کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی، بات مکمل ہو چکی تو مجھ سے فون پکڑتے ہوئے کہنے لگا: ''یار! میری کھوپڑی میں تو یہ جاپانی زبان نہیں گھستی، بہت کوشش کی......''

اس کی گفتگو کا لُبِ لباب یہ تھا، کہ گویا سارا قصور اس نامراد جاپانی زبان کا ہے، جو ابھی تک اس کے دماغ میں جگہ بنانے میں ناکام رہی ہے۔ میرے استفسار پر اس نے اپنا نام بتایا، رسول حمزہ!! نام سنتے ہی ذہن میں داغستانی، خوش نوا شاعر رسول حمزہ کی نظمیں گونجنے لگیں۔ فیض احمد فیض کا سفر نامہ ''مہ وسالِ آشنائی'' اس بے مثل شاعر کا خاکہ بڑی صراحت سے بیان کرتا ہے، اپنے مجموعہ کلام ''نسخہ ہائے وفا''

میں بھی فیض صاحب نے رسول حمزہ کی چند نظموں کا اُردو میں ترجمہ شامل کیا ہے، جو کلاسیکی ادب کا درجہ رکھتا ہے۔

نام سن کر میں نے بے اختیار کہہ دیا ''تمہیں پتا ہے رسول حمزہ داغستان میں ایک بہت بڑا شاعر ہو گزرا ہے؟'' میرے سوال پر اس نے ایک بار پھر اپنے سونے کے کور میں ملبوس دانتوں کی نمائش کی اور یہ دھما کہ خیز انکشاف کیا کہ عظیم انقلابی شاعر رسول حمزہ اس کے والد کا دوست تھا، نا صرف اس نوجوان کا نام اس کے والد نے اپنے شاعر دوست کے نام پر رکھا بلکہ یہ بچپن میں رسول حمزہ کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا ہے۔ اس کا والد رسول حمزہ کے داغستان میں واقع گاؤں کے پرائمری سکول میں استاد تھا۔ یہ حیرت انگیز انکشاف سن کر میں نے اسے اپنے ساتھ کافی پینے کی دعوت دی، جسے اس نے نقد ہی قبول کر لیا۔ کافی کے مگ ہاتھ میں تھامے، دیر تک ہم داغستان اور ادب کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ بُلّھے شاہ کی کافیوں کے علاوہ مجھے کولمبیا کی کافی بہت پسند ہے۔ کافی کی ان دونوں اقسام میں ایک چیز مشترک ہے کہ دونوں ہی ایک خاص قسم کی کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔ باتوں باتوں میں اس نے پوچھا کہ ''آج کل کیا پڑھ رہے ہو؟'' بظاہر جرائم پیشہ نظر آنے والا یہ داغستانی مسلمان اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی نکلا۔ یہاں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ میں پڑھا لکھا اسے نہیں کہتا جس نے کالج، یونیورسٹی سے ڈگریاں لے رکھی ہوں، بلکہ وہ شخص جسے پڑھنے لکھنے سے شغف اور کتابوں سے رغبت ہو۔ خیر!! میں نے بتایا کہ لیوٹالسٹائی کی ''جنگ اور امن'' ان دنوں دوبارہ زیر مطالعہ ہے۔ رسول حمزہ کہنے لگا کہ کامریڈ لینن مگر اس ادیب سے شاکی تھا، لینن کا کہنا تھا کہ اگر ٹالسٹائی نہ ہوتا تو اکتوبر 1917ء میں برپا ہونے والا بالشویک انقلاب، دس سال پیشتر ہی روسی قوم کو نصیب ہو جاتا۔

لیوٹالسٹائی کے نظریات سے علمی سطح پر اختلاف ممکن ہے مگر دنیا کے کسی بھی صاحب مطالعہ شخص سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ عالمی ادب کی تاریخ میں سب سے بڑا ناول نگار کون ہے؟ اور سب سے عظیم ناول کون سا ہے؟ تو یقیناً جواب ٹالسٹائی اور اس کے شہرہ آفاق ناول ''جنگ اور امن'' کے علاوہ کوئی دوسرا

نہیں ہوسکتا۔اس ناول کوشائع ہوئے ڈیڑھ صدی کا عرصہ بیت گیامگرآج بھی اس کی اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوا ہے۔دوصدیوں پہلے کے تناظر میں لکھے گئے اس جنگی ناول کا مرکزی نقطہ زارِروس اور نپولین بوناپاٹ کے درمیان لڑی جانے والی جنگ اوراس جنگ کے ہنگام کا روسی معاشرہ، بالخصوص روسی اشرافیہ کی زندگی پراس کے اثرات ہیں۔کئی اعتبار سے اس ناول نے جنگ کے متعلق ہزاروں سال سے پائی جانے والی انسانی سوچ کوایک نیا زاویہ اورادب کواک نیا موڑ عطا کیا ہے۔ٹالسٹائی انسانی تاریخ میں وہ پہلا ادیب تھا جس نے ہزاروں صفحات پرمبنی اپنے اس ناول میں جنگ کے محاسن،جنگی ترانے، پرچم، جوش وجذبہ اورسپاہ کے حوصلے کی تعریف میں شاہنامے نہیں لکھے بلکہ جنگ کی تباہ کاریوں، زخمیوں کے دکھ درد، ورثاء کی کسمپرسی، اور سپاہیوں کی گھریلو زندگی پر جنگ کے زہریلے اثرات کا جائزہ پیش کیا ہے۔اسی ناول میں لیوٹالسٹائی نے پورے عالم میں سب سے جامع تسلیم کی جانے والی''امن'' کی تعریف بیان کی ہے،اس کے بقول ''امن دوجنگوں کے درمیانی وقفے کو کہتے ہیں'' بنیادی طور پروہ ایک امن پسند آدمی تھا، بیسویں صدی کے آغاز میں جب روس اور جاپان کے درمیان جنگ ہوئی،جس میں روس کوشکست ہوئی تھی، ٹالسٹائی نے اس جنگ کے خلاف ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس کی پاداش میں اسے جیل بھی جانا پڑا۔باتیں جاری تھیں کہ رسول حمزہ نے ایک انکشاف نما سوال داغ دیا کہ''تمہیں پتا ہے کہ ٹالسٹائی مسلمان ہوگیا تھا؟'' میں نے بے یقینی کا تاثر دیتے ہوئے کہا:''میرے دوست! کس کی بات کررہے ہوکہ مسلمان ہوگیا تھا؟'' رسول حمزہ نے بھی جواباً طنزیہ انداز اپناتے ہوئے کہا:''جنابِ شاعر! میں''اینا کارینینا'' کے خالق آنجہانی کاؤنٹ لیونکولائی وچ ٹالسٹائی کا ذکرِ خیر کررہا ہوں۔'' رسول حمزہ نے چونکہ بچپن سے ہی عالمی سطح کے ادیبوں کی باتیں اورگفتگو سننے کے علاوہ ایک ادبی ماحول میں پرورش پائی تھی، اس لیے روسی ادب اورادیبوں کے متعلق ایسے ایسے تہلکہ خیزانکشافات کیے کہ چودہ طبق روشن ہوگئے۔میں نے کہا:''مجھے یہ تو معلوم ہے کہ اس نے آرتھوڈوکس عیسائیت کو خیرباد کہہ دیا تھا'' اور یہ

بات تو ریکارڈ کا حصہ ہے، مگر ٹالسٹائی کے مسلمان ہونے کے متعلق تو آج تک نہ کہیں پڑھا اور نہ ہی کسی سے ایسی بات سنی ہے۔

میری حیرانگی دیکھ کر رسول حمزہ کہنے لگا کہ اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں، بڑی منطقی سی بات ہے۔ لیو ٹالسٹائی نو سال کا تھا جب ماں کے بعد اس کا باپ بھی فوت ہو گیا، تو وہ اپنی پھوپھی کے پاس قازان چلا گیا تھا جہاں سے اس نے بنیادی تعلیم مکمل کی تھی، یہ مسلم اکثریتی علاقہ ہے، یوں یہ بات تو طے ہوئی کہ اسے بچپن سے ہی اسلام کا بنیادی تعارف حاصل تھا۔ آخری عمر میں جب وہ عیسائیت ترک کر چکا تھا، تب اس کی ملاقات چیچنیا کے ایک مسلمان امام مسجد سے ہوئی، ٹالسٹائی عمر کے آخری حصے میں کئی بار اس عالم دین سے ملنے کے لیے چیچنیا گیا تھا، اور اسی امام کے ہاتھوں بالآخر مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میرے لیے یہ کوئی معمولی خبر نہیں تھی، بعض اوقات خبر کا بڑا ہونا ہی دل میں شکوک و شبہات، وسوسے اور بے یقینی پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے، اسی ذہنی ادھیڑ بن میں تھا جب میں نے پوچھا کہ اگر ٹالسٹائی مسلمان ہو گیا تھا تو پھر کسی جگہ اس بات کا ذکر کیوں نہیں ملتا؟

رسول حمزہ کا استدلال تھا کہ ہمیں غور کرنا چاہیے کہ یہ واقعہ کن حالات میں وقوع پذیر ہوا؟ یہ روس میں مذہب اور اشرافیہ سے بیزاری کا دور تھا، کیمونسٹ انقلاب کا لاوا پک چکا تھا، روسی کسان لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں شہنشاہیت کا خاتمہ کرنے جا رہے تھے۔ ایک بات تو ہمیں ماننا ہی پڑے گی کہ امن پسندی اپنی جگہ، مگر ٹالسٹائی نہ صرف خود جاگیردار اور روسی اشرافیہ کا اہم رکن تھا بلکہ اس کی تحریریں بھی روسی طبقہ اشرافیہ کے متعلق ہی ہیں۔ اس لیے اس کے اسلام قبول کرنے کے واقعے کو اہمیت نہ ملنا قابلِ فہم ہونا چاہیے۔ اس موضوع پر کئی ادیبوں سے تبادلۂ خیال ہوا ہے، چند لوگوں نے رسول حمزہ کے بیان کی تصدیق کی ہے اور کچھ نے تردید، زیادہ تر اہلِ علم نے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ اس موضوع پر اگر مزید کبھی کوئی معلومات حاصل ہوئیں تو ضرور پیش کروں گا۔

حرفِ آخر! کل شام ٹرین میں بھاری بھرکم بیگ اٹھائے، ایک نوعمر جاپانی

یکنیشن ملا، پوچھنے پر پتا چلا کہ پاکستان سے واپس آ رہا ہے، ایک ٹیکسٹائل مل میں کام کے سلسلے میں دو ماہ فیصل آباد گزار کے آیا تھا، میں نے رسمی تعارف کے بعد پوچھا کہ پاکستان میں رہنے کا تجربہ کیسا رہا؟ پاکستانی قوم کے بارے میں کیا تاثر لے کر آئے ہو؟ وہ تو پاکستان میں قیام کے نشے سے سرشار تھا، کہنے لگا کہ پاکستانی بہت مہمان نواز، ملنسار اور کھلے دل کے مالک ہیں، مجھے نہ تو اردو آتی تھی اور نہ ہی انگریزی مگر میں نے پاکستان کے لوگوں کو بہت مددگار پایا۔ آپ لوگوں کا مشترکہ خاندانی نظام مجھے بے حد پسند آیا۔ میری خواہش ہے کہ بار بار پاکستان جاؤں۔ بلاشبہ پاکستانی قوم میں بے شمار خوبیاں ہیں، جہاں ہم اپنی خامیوں اور ناکامیوں کے تذکرے کرتے ہیں، کبھی کبھی ان خوبیوں کا بھی ذکر ہونا چاہیے۔

تہران سے ایک خط

ہمارے ایران کے دورے کا وقت اتفاقاً بہت ہی اہم تھا، وہ یوں کہ تہران میں غیر وابستہ ممالک کی تنظیم ''نام'' کا سولہواں اجلاس انعقاد پذیر ہو رہا تھا۔اس اجلاس میں پاکستانی صدر آصف علی زرداری سمیت تیس ممالک کے سربراہانِ مملکت نے شرکت کی،اس کے علاوہ 120 ممالک کے سفارتی وفود اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔تہران کو اس کانفرنس کے لیے دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ ہر طرف رنگ برنگی جھنڈیاں نظر آ رہی تھیں اور رنگین روشنیوں کی قطاریں اب بھی ہر طرف جگمگا رہی ہیں۔ مجھے تو تہران شہر کم اور شادی والا گھر زیادہ لگ رہا تھا۔مگر سچی بات تو یہ ہے کہ جب میں ایران پہنچا تو مجھے غیر وابستہ ممالک کی تنظیم کے کسی اجلاس کی کچھ خبر نہ تھی۔ہاں! گلی،کوچے بتا رہے تھے کہ یہاں کچھ خاص ہونے جا رہا ہے۔انتظامات دیکھ کر لگتا ہے کہ ایران کی حکومت اس موقع کے لیے بڑی دیر سے تیاری کر رہی تھی۔اجلاس میں مشرقِ وسطیٰ کی صورتحال گفتگو کا مرکزی موضوع رہی۔اجلاس کی تفصیلات بتا کر میں آپ کو بور کرنا نہیں چاہتا،تاہم پاکستان کے لیے یہ اجلاس اس لیے اہم تھا کہ باقی ممالک کے سربراہان اور سفارتی وفود سے ملاقات کے علاوہ پاکستانی صدر کی ملاقات ہندوستان کے وزیراعظم منموہن سنگھ سے بھی ہوئی۔ دونوں ممالک کے سربراہان کی ملاقات کے دوران، وزرائے خارجہ بھی موجود تھے۔

ایران کے نقطۂ نظر سے یہ کانفرنس اس لیے اہم تھی کہ اس سے اس کی دنیا میں بڑھتی ہوئی عالمی تنہائی کے تاثر کی نفی ہوئی ہے۔

تہران کانفرنس بلاشبہ ایران کے لیے بہت ہی اہم سفارتی کامیابی ہے۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب امریکہ اور یورپ کے کئی ممالک کی طرف سے اس پر اقتصادی پابندیاں عائد ہیں۔ دنیا بھر سے سات ہزار مندوبین اس اجلاس میں مدعو تھے۔ حکومت نے شہر کے تمام فائیو سٹار اور فور سٹار ہوٹل ایڈوانس بک کروا رکھے تھے، اس لیے ہم جیسے لوگوں کو ان دنوں میں کوئی اچھا ہوٹل ملنا اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور تھا۔ خیر میرے لیے تو ہوٹل کا فقط صاف ستھرا اور آرام دہ ہونا کافی ہے۔ ہوٹلوں کی اس ''سٹار وار'' سے میں ابھی تک متاثر نہیں ہوا ہوں۔

یہاں لوگوں کا عمومی رویہ بڑا دوستانہ اور مددگار ہے۔ امن وامان کی صورتِ حال یہاں بہت اچھی ہے، آدھی رات کو بھی خواتین نیم اندھیری گلیوں اور سڑکوں پر اکیلی پیدل چلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ دکانوں پر خریداری کے دوران بھاؤ تاؤ پاکستان کی طرح ہی کرنا پڑتا ہے۔ خیر! شہر تو چاہے کوئی بھی ہو، کبھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوتا اور برے لوگوں سے پاک بھی نہیں ہوسکتا۔ اس شہر کے لوگ مجھے نرم گفتار اور پاکستان سے محبت کرنے والے لگے ہیں۔ پولیس کے بارے میں یہاں بھی سب سے یہی سنا ہے کہ رشوت خوب لیتی ہے، اپنی آنکھوں سے رشوت لینے کا منظر نہیں دیکھا اس لیے وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

علامہ اقبالؒ کا ایران میں مقام ومرتبہ ایسا بلند ہے کہ بیان کرنے کے لیے کتاب لکھنا چاہیے، تبھی انصاف ہو سکے گا۔ ابھی ابھی ہوٹل مینیجر کی رات کی ڈیوٹی شروع ہوئی ہے اور اس کے ہاتھ میں علامہ اقبالؒ کی زندگی اور فن پر مبنی کتاب ہے۔ بات کرنے پر پتا چلا کہ اسے شاعرِ مشرقؒ کا فارسی شعری مجموعہ زبورِ عجم آدھا سے زائد حفظ ہے۔

میں نے اقبالؒ کا ذکر کیا تو اس نے میری بات کا جواب حکیم الامتؒ کے اس مصرعے کی صورت میں دیا۔

ای جوانانِ عجم، جانِ من و جانِ شما

مشہد، جو کہ ایران کا دوسرا بڑا شہر ہے اور یہاں کا واحد شہر کہ جس کا نام عربی زبان میں ہے، امام علی رضاؑ کے اس شہر میں داخل ہوتے ہی جن چند بڑی سڑکوں کے نام آنکھوں سے گزرے ان میں ایک کا نام علامہ اقبالؒ کے نامِ گرامی سے منسوب ہے، ''اقبال لاہوری ایوینیو'' یہ بھی قابلِ ذکر بات ہے کہ یہاں تمام شاعروں کے نام کے ساتھ عموماً ان کے شہر کا نام لگایا جاتا ہے، جیسے غالب دہلوی، سودا دہلوی، سعدی شیرازی، حافظ شیرازی۔ استقبالیہ پر بیٹھے احمد فارسی جانی کے ہاتھ میں 1977ء کی احمد ندیم قاسمی کے زیرِادارت مجلس ترقی اردو کی چھپی ہوئی فارسی زبان میں اقبال کے حالات وفن کی کتاب تک ہی بات محدود نہیں ہے، یہاں کے ہر دوسرے ٹیکسی ڈرائیور کی زبان پر ''اقبال لاہوری'' کا نام ہے۔ قہوہ خانوں پر بیٹھے لوگ پاکستان کا نام سنتے ہی اقبالؒ کا ذکر کرنے لگتے ہیں۔ ایرانیوں کا قہوہ اور چائے پینے کا انداز بھی مخصوص ہے۔ منہ کے اندر شکر کی ڈلی یوں رکھ لیتے ہیں جیسے ہمارے ہاں پان کی گلوری رکھتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ چسکیاں لے کر چائے وقہوہ پیتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر چائے میں دودھ نہیں ملاتے، مگر ہمارے ہاں تو چائے کا مطلب ہی دودھ کے ساتھ بننے والی ''انگلش ٹی'' ہوتا ہے۔

بُرج میلاد تہران کی نئی پہچان ہے، جیسے ٹوکیو کی نئی پہچان ٹوکیو سکائی ٹری اور دبئی کا برج خلیفہ نشان ہیں۔ بُرج میلاد 435 میٹر بلند ہے اور بلندی کے اعتبار سے یہ دنیا میں چھٹے نمبر ہے۔ مذکورہ کانفرنس کے اثرات یہاں سب سے نمایاں تھے۔ کئی جگہ مختلف ممالک کے سفیر دوطرفہ معاہدوں پر دستخط کرتے نظر آئے۔ غیر وابستہ ممالک کی تنظیم سے منسلک ممالک کے مندوبین کچھ تو سرکاری کام سے وہاں موجود تھے اور بہت سارے تین سو میٹر کی بلندی پر واقع درشن جھروکے سے شہر کا نظارہ کر رہے تھے۔ مجھے تو تہران یہاں سے اسلام آباد کی طرح کا شہر نظر آیا۔ ٹوکیو ٹاور کی طرح برج میلاد کی تعمیر کا بنیادی مقصد بھی اطلاعات ونشریات کے شعبے کی ضرورتوں سے متعلق ہے مگر سیاحتی نقطہ نظر کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے، کیفے ٹیریا، آرٹ گیلری، اور طرح طرح کی دکانوں سمیت سیاحوں کی دلچسپی کا یہاں

تمام سامان موجود ہے۔ برج میلاد سے قبل آزادی ٹاور تہران کی سب سے اہم عمارت تھی، آزادی اسکوائر میں برج آزادی سے ملحقہ ایک شاندار میوزیم بھی موجود ہے۔ اس میوزیم کا لیکن ایران کے نیشنل میوزیم سے کوئی مقابلہ نہیں، میوزیم کو جدید فارسی میں ''موزہ'' کہتے ہیں۔ ایسے پرشکوہ میوزیم دنیا میں کم ہی دیکھے ہیں۔

تہران کے مضافات میں پہاڑ ہیں۔ انہی پہاڑوں میں سے ایک کی چوٹی پر امام حسینؓ کی اہلیہ بی بی شہر بانوؓ کا روضہ ہے۔ امام زین العابدینؒ کی والدہ اور ایرانی بادشاہ یزدگرد کی بیٹی کے مزار کے پاس ہی وہ غار بھی ہے جہاں بی بی شہر بانوؓ نے زندگی کے آخری ایام بسر کیے۔ عجب پراسرار خاموشی اور ناقابلِ بیان سکون اس مقام کی خصوصیت ہے۔ یہاں سے پورا تہران صاف نظر آتا ہے۔

تہران ایران کا بتیسواں دارالخلافہ ہے اور اس کا قدیم نام ''رے'' تھا۔ پچاس لاکھ نفوس پر مشتمل یہ شہر دنیا کا انیسواں بڑا شہر ہے۔ 2008 میں اسے دنیا کا سب سے سستا شہر قرار دیا گیا تھا، یاد رہے اب ہمارا کراچی دنیا کا سب سے غریب پرور شہر ہے۔

عمر خیاؔم اور عطاؔر کا نیشا پور حسن و جمال میں اپنی مثال آپ ہے۔ کہتے ہیں کہ پورے ایران میں ایسی خوش کن آب و ہوا کہیں بھی نہیں ہے۔ اس فضا کو 'قدم گاہ رضوی'' کا فیضان مانا جاتا ہے۔ خیاؔم کی رسدگاہ سے لے کر بہت کچھ یہاں پر لائق تحریر ہے مگر پھر کبھی تفصیل بیان کروں گا۔

مشہد میں چند روز

خراسان کا دارالخلافہ مشہد ارضیاتی اعتبار سے کوہستانی علاقہ ہے۔تہران سے نوسو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع یہ ایران کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں کی اوٹ میں چھپتا ہوا نارنجی سورج ہر شام یہاں بڑا منفرد منظر پیش کرتا ہے۔شہادت گاہ کے نام سے بسنے والا یہ شہر نسبتاً نیا ہے، مشہد بسنے سے قبل چند کلومیٹر کی دوری پر واقع رستم وسہراب کا شاہنامہ تحریر کرنے والے فردوسی کا طوس اہم شہر تھا۔ وہی طوس جہاں عظیم صوفی بزرگ معروف کرخیؒ عیسائیت چھوڑ کر امام علی رضا کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور اسلام اختیار کرنے کے بعد یہیں بیشتر عمر گزار گئے۔ امام علی رضا کی یہاں شہادت و مرقد نے اک بیابان کو شہر میں تبدیل کر دیا، انہی کی نسبت سے یہ مشہد قرار پایا۔طوس میں فردوسی کا مقبرہ اور اس سے ملحقہ میوزیم اہم سیاحتی مرکز ہے، فردوسی پارک کے پاس ہی خلیفہ ہارون الرشید کے دور کا زندان ہے جسے ہارونیہ کہتے ہیں۔ زندان بلاشبہ ایک خوفناک مقام ہے مگر اپنی عمارت کے اعتبار سے اسے عرب طرزِ تعمیر کا شاہکار نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔روایت کے مطابق عباسی خلیفہ ہارون الرشید بھی امام علی رضا کے مزار کے احاطے میں ہی دفن ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک ایران کے اس واحد عربی نام والے مشہد شہر کی وجہ تسمیہ بھی بنو عباس کا خلیفہ ہارون الرشید ہے۔اب طوس اور مشہد ایک ہی شہر بن چکے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ جاپانیوں کا انگریزی زبان میں ہاتھ ذرا تنگ ہے مگر ایرانیوں کی انگریزی زبان میں تنگ دستی تو سب کو مات دیتی نظر آ رہی ہے۔ فارسی کی تھوڑی بہت شدبد تو

مجھے ہے مگر روانی سے بولنے سے ابھی تک قاصر ہوں، ویسے بھی سکول اور کالج میں ہمیں جو فارسی پڑھائی جاتی ہے وہ کلاسیکی ہے جبکہ یہاں جدید زبان کا چلن ہے اور پھر لہجہ بھی ذرا مختلف ہے، بہرحال گزارا بڑا اچھا ہو رہا ہے۔ زبان کے سلسلے میں لوگوں کا رویہ بڑا امدد گار رہے جس کی وجہ سے کوئی تنگی نہیں ہوتی۔ ٹیکسی ڈرائیور سے میں نے کہا کہ کسی ایسے ریستوران میں لے چلو جہاں بوفے کا کوئی نظام ہو، کیونکہ مینیو پڑھ کر تو کچھ بھی سمجھ نہیں آتا کہ کھانے کے لیے کیا آرڈر کیا جائے۔ اول تو کھانوں کے ناموں سے ان کے ذائقے کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، ستم بالائے ستم کہ سارا مینیو فقط فارسی زبان میں ہوتا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور دنیا میں عموماً بدلحاظ مشہور ہیں مگر اس آدمی نے تو کرایہ لینے سے صاف انکار کر دیا کہ آپ لوگ ہمارے مہمان ہیں۔

ریستوران پہنچے تو وہاں بوفے واقعی موجود تھا، لیکن سب کچھ فقط سلاد کی انواع و اقسام پر مبنی تھا۔ ہاں! مینیو کارڈ سے بھی آرڈر کیا جا سکتا تھا۔ اہلِ خانہ بھی اس سفر میں میرے ہمراہ تھے اور تمام افراد میری طرح دیسی ساختہ ہیں، اس لیے کچھ چٹ پٹا، تیکھا، چٹخارے دار، کرارہ کھانا چاہتے تھے۔ میں نے بیرے سے فارسی زبان میں گرم مصالحے اور مرچوں کی وضاحت کرنے کے لیے اپنی تمام تر فارسی استعمال کر ڈالی مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور اس نے ایک عربی ترجمان کو میری جانب بھجوا دیا، اس پر ابھی میں اپنی عربی دانی کے ابتدائی داؤ پیچ ہی آزما رہا تھا کہ ساتھ والی ٹیبل پر اپنے خاندان کے ساتھ بیٹھی ہوئی ایک لڑکی ہماری بے بسی سمجھ گئی اور اس نے رضا کارانہ طور پر مترجم کے فرائض انجام دیے۔ یہ الگ بات ہے کہ چٹ پٹا کھانے کی ہماری خواہش پھر بھی پوری نہ ہو سکی۔ کھانے یہاں غذائیت سے بھرپور مگر پھیکے پھیکے سے ہیں۔ اب بھلا غذائیت کو کون پوچھتا ہے جب چٹخارہ ہی نہ ہو۔ اپنے ٹیکسی ڈرائیور و گائیڈ کے ہمراہ تمام شہر گھوم چکے تھے کہ کسی پاکستانی ریستوران کا کوئی سراغ مل جائے مگر کسی نے بھی ایسے ریستوران کے وجود تو کیا امکان کی بھی کوئی تائید نہیں کی تھی۔ اس پر مجھے حیرت بھی ہوئی کہ صرف ٹوکیو میں ہمارے ایک پاکستانی دوست کے

ستائیس ریستوران ہیں اور ایران کا تو ہم سے سرحدی رابطہ ہے مگر مشہد میں ریستوران ہمارا کوئی بھی نہیں ہے۔

ہمارا ایرانی گائیڈ و ٹیکسی ڈرائیور ندیم اور شبنم کی فلموں کا دیوانہ ہے۔ ویسے تو اس نے ہالی ووڈ کی گاڈ فادر سے لے کر ٹاپ گن تک کوئی فلم چھوڑی نہیں مگر پاکستانی سینما سے اسے خصوصی محبت ہے۔ اس کے مطابق ہندوستان کی فلمیں غیر حقیقی اور جعلی لگتی ہیں جبکہ پاکستانی فلم حقیقت کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔

آغا جلال سید کا کہنا ہے کہ انڈیا کے مقابلے میں پاکستانی سینما زیادہ اچھا اور میچور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی اور ایرانی فلموں کو آسکر ایوارڈ ملتا ہے جبکہ ہندوستان کی کسی فلم کو آج تک آسکر ایوارڈ نہیں ملا۔ میں نے شہر میں گشت کے دوران اس کی توجہ جا بجا برقی قمقموں اور رنگ برنگی روشنیوں کی جگمگاہٹ کی طرف دلاتے ہوئے اس رنگا رنگی کا سبب پوچھا، معلوم ہوا کہ یہ سب گزشتہ عید کی خوشی میں سجایا گیا تھا۔ اکثر خوشی کے اسلامی تہواروں پر اس روایت کی پاسداری کی جاتی ہے۔

میرے ماموں جان مرحوم بتایا کرتے تھے کہ دنیا میں حسن کی بوتل ایران میں گر کر پھوٹی ہے اور پاکستان تک اس حسن کے صرف چھینٹے پہنچے ہیں۔ ان کے اس بیان کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انہوں نے اسلامی انقلاب سے بہت پہلے ساٹھ کی دہائی کا ایران دیکھا تھا۔ رضا شاہ پہلوی کے دور کا ایران تو شاید ثقافتی اعتبار سے یورپ سے ملتی جلتی کوئی تصویر پیش کرتا ہو، مگر آج صورتحال یکسر بدل گئی ہے۔ پورے ایران میں مجھے کوئی عورت ننگے سر نظر نہیں آئی۔ عموماً سیاہ عبا میں صرف چہرہ ہی نظر آتا ہے۔ اسلامی انقلاب کے بعد حجاب پہننا قانوناً ضروری ہے۔

میرے خیال میں فرانس اور ترکی میں حجاب پہننے پر پابندی ہو یا پھر ایران اور سعودی عرب میں حجاب لازمی طور پر پہننے کی پابندی ہو، یہ دونوں ایک سی باتیں ہیں، کیونکہ ہر دو صورتوں میں خواتین سے ان کا لباس کے انتخاب کرنے کا بنیادی انسانی حق چھینا جا رہا

ہے۔حجاب اوڑھنے یا پھر نہ اوڑھنے کا فیصلہ کرنا خواتین کا حق ہے، ایسے معاملات میں حکومتی مداخلت، بنیادی انسانی حقوق میں مداخلت کے مترادف ہے۔اس معاملے میں پاکستان ان مذکورہ ممالک سے بہت بہتر ہے کہ جہاں ایسی پابندیاں عائد نہیں ہیں۔ ہماری عورتیں سر ڈھانپنے، یا پھر نہ ڈھانپنے کا فیصلہ خود کرتی ہیں۔خواتین کے باب میں مگر یہاں ایک چیز قابلِ تقلید ہے، وہ ہے ''بانویان'' کے نام سے مستورات کے لیے مخصوص ٹیکسی سروس۔ بانویان نامی ٹیکسی سروس میں نہ صرف ڈرائیور خواتین ہوتی ہیں بلکہ اس میں سوار بھی صرف اور صرف عورتیں ہی ہوسکتی ہیں۔اسی حوالے سے ایک اور قابلِ تحسین چیز یہ کہ اکثر بڑے سرکاری دفاتر میں عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ لفٹ لگی ہوئی ہے۔

بہروز سبزواری المعروف قباچہ اور ایم کیو ایم کے فیصل سبزواری کے آباء واجداد کا شہر سبزوار دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا، جو کہ مشہد سے تقریباً دوسو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔سبزوار شہر دیکھنے سے پہلے میں سبزواری کو نقشبندی، سہروردی، چشتی کی طرح اہلِ تصوف کا ہی کوئی سلسلہ سمجھتا رہا۔ایران کے لوگ بڑے باذوق ہیں۔ مجھے دومرتبہ ڈالر کو مقامی کرنسی ریال میں تبدیل کروانے کے لیے منی ایکس چینجرز کے پاس جانا پڑا، اور دونوں جگہ بڑے بڑے فریموں میں حافظ شیرازی کے شعر خطِ کوفی اور خطِ شکستہ نستعلیق میں آویزاں دیکھے۔

از محبت خار ہا گل میں شود

کیا کہنے ہیں اس خیال کے جو عالمگیر سچائی بھی ہے کہ محبت سے کانٹے بھی پھول بن جاتے ہیں، اور اس مصرعے نے تو اب تک مجھے اپنے حصار میں جکڑا ہوا ہے۔

کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکل ہا

یقیناً ایسا شعر صرف حافظ ہی کہہ سکتا ہے۔ یہاں یہ بات کئی لوگوں سے سنی ہے کہ اقبالؒ کا فارسی کلام حافظ شیرازی کے شعری سلسلے کی تقلید ہے۔علامہ اقبالؒ سے ان لوگوں کی محبت بیان سے باہر ہے۔ مجھے یونیورسٹی میں ادبیات کے ایک طالب علم نے، جو کہ خطاط بھی ہے، شاعرِ مشرق کی ایک فارسی نظم خطِ

شکستہ نستعلیق میں لکھ کر تحفتاً پیش کی ہے، اور آخر میں لکھتا ہے 'علامہ فقید محمد اقبالؒ لاہورے'' فقط علامہ اقبالؒ کے نام پر ہی مشہد میں اقبال لاہوری ایونیو نہیں ہے بلکہ نامور پاکستانی شاعر اسلم انصاری کے نام پر بھی تہران میں ''خیابانِ اسلم انصاری'' موجود ہے، جسے دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ عظمتِ فن کے اعتراف کے لیے یہاں مردہ ہونا ضروری نہیں ہے۔

نادر شاہ کے مقبرے اور ملحقہ میوزیم کا ذکر کیے بغیر مشہد کی بات مکمل نہ ہو سکے گی۔ ہندوستان، پاکستان اور افغانستان سمیت سنٹرل ایشیا کی تمام ریاستوں کو فتح کرنے اور خون میں نہلا دینے والے نادر شاہ کا دور تو بس بارہ سال ہے مگر ان بارہ برسوں میں اس نے بارہ سے زیادہ ممالک اپنے زیرِنگیں کر لیے تھے۔ مورخین کو شائبہ ہے کہ وہ خدا پرست نہ تھا۔

نادر شاہ کے میوزیم میں توپ و تفنگ دیکھ کر اس اصطلاح کی سمجھ آئی کہ فارسی زبان میں ''تفنگ'' پستول کو کہتے ہیں۔ اس کے جانشین مگر نا اہل نکلے، اس کی تخلیق کردہ اتنی بڑی اور منظّم سپاہ اور ایسی عظیم سلطنت کو وہ سنبھال نہیں سکے۔ اس بات پر سب مورخ متفق ہیں کہ سائرس اعظم کے بعد نادر شاہ جیسی وسیع سلطنت اور عظیم سپاہ کوئی بھی ایرانی بادشاہ نہ تشکیل دے سکا۔

مشہد سے لاہور واپسی کی فلائیٹ کے دوران ہمیشہ یاد رہنے والی ملاقات ایک عراقی نو بیاہتا جوڑے سے ہوئی، وہ ہنی مون منانے کے لیے پاکستان جا رہے تھے۔ پاکستان میں ان کا سیاحتی پروگرام لاہور اور اسلام آباد کے علاوہ کراچی، کشمیر اور خیر پور سندھ تک پھیلا ہوا تھا۔ مجھ سے انہوں نے ہوٹل کے متعلق مشورہ مانگا، وہ کم خرچ بالا نشین ہوٹل کی تلاش میں تھے، اس لیے میں نے انہیں لکشمی چوک جانے کا مشورہ دیا۔ ان کے نزدیک ہنی مون منانے کے لیے پاکستان دنیا میں سب سے بہتر ملک تھا۔

کیا پابلو نرودا قتل کیا گیا؟

لاطینی امریکہ کے ملک چلّی سے خبر آئی ہے کہ ایک جج نے نوبل انعام یافتہ شاعر، سفارتکار اور سیاستدان پابلو نرودا کی قبر کشائی کا حکم دیا ہے، تاکہ اس عظیم مزاحمت کار کی موت کے اصل اسباب معلوم کیے جاسکیں۔ پابلو نرودا کی وفات مشکوک حالات میں، اس وقت ہوئی، جب جنرل پنوچے نے 1973ء میں منتخب جمہوری حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس فوجی بغاوت سے تین دن پہلے پابلو نرودا کینسر کا مرض تشخیص ہونے کے سبب ہسپتال میں داخل ہوا تھا، جنرل پنوچے کے حکومت پر قبضے کے محض دس روز بعد اس کا اسی ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ سرکاری طور پر اس کی موت کی وجہ دل کا دورہ پڑنا بتائی گئی، مگر چلی میں عام لوگوں کا عمومی خیال ہے کہ اسے قتل کیا گیا تھا۔ اس تاثر کو اس لیے تقویت ملتی ہے کہ نرودا ہسپتال میں کینسر کی علامات کے سبب داخل کیا گیا، مگر ہلاکت کا سبب دل کا عارضہ؟ غیر منطقی سی بات لگتی ہے۔ حکومت نے اس مسئلے پر 2011ء میں ایک تحقیقاتی کمیشن تشکیل دیا تھا۔ سرکاری کمیشن کے سامنے نرودا کے ڈرائیور نے یہ بیانِ حلفی دیا کہ نرودا کو جنرل پنوچے کے اہلکاروں نے زہر دیا تھا، دھوکے سے دیا گیا یہ زہر جان لیوا ثابت ہوا۔ فوج کے زمامِ اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد صورتحال یہ تھی کہ ہزاروں لوگوں کو بغیر کسی عدالتی کارروائی کے، موت کے گھاٹ اتارا جارہا تھا۔ چلّی کے جنوبی علاقوں میں رہنے والے دوست بتاتے ہیں کہ فوجی انقلاب کے کئی مہینوں بعد تک، یہ روز کا معمول تھا کہ دریا کے پانی کی سطح پر انہیں لاشوں کی نئی کھیپ ہر صبح تیرتی ہوئی نظر آیا کرتی تھی۔

کولمبیا کے نوبل انعام یافتہ صحافی اور ناول نگار گارشیا مارکیز کے پابلو نرودا کے متعلق اس بیان سے آج تک دنیا کے کسی بھی معتبر نقاد کو اختلاف کی جرأت نہیں ہوئی کہ ''نرودا بیسویں صدی کا کسی بھی زبان میں سب سے بڑا شاعر تھا'' مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے پابلو نرودا کی شاعری کو اس کے اصل ہسپانوی زبان کے متن سے براہِ راست اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

قبر کشائی کی خبر سن کر مجھے ازلا نیگرا میں واقع پابلو نرودا کی گھر کے صحن میں واقع قبر، اور وہاں حاضری کے لیے آئے ہوئے، محبت کرنے والے نوجوان جوڑے یاد آ رہے ہیں۔ ادب کے قارئین تو خوب جانتے ہیں، نئے پڑھنے والوں کو انقلاب اور رومان کے سب سے بڑے شاعر کا تعارف کروا دوں جو 1904ء میں، چلّی کے جنوب میں واقع ایک چھوٹے سے قصبے پارال میں پیدا ہوا۔ اس کی عمر فقط دو ماہ تھی کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ابتدائی تعلیم اس نے اپنے قصبے میں حاصل کی اور مزید تعلیم کے لیے دارالحکومت سنتیا گو منتقل ہو گیا۔ وہ صرف دس سال کا تھا جب اس کی پہلی نظم شائع ہوئی، اپنی عمر کے بیس سال مکمل کرنے سے پہلے وہ عالمی سطح پر ایک مقبول شاعر بن چکا تھا۔

نرودا کے والد نے ہمیشہ اس کے لکھنے کے کام کی مخالفت کی اور اسے نصابی کتب پر توجہ دینے کے لیے کہتا رہا، مگر کئی لوگوں نے اس کی حوصلہ افزائی بھی کی جن میں گبریلا مسترال بھی شامل تھی۔ سولہ برس کی عمر میں جب اس نے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا تو اس کا ایک مقصد والد کو غچہ دینا بھی تھا۔ یاد رہے کہ نرودا کا اصل نام نیفتالی باسو آلتو تھا۔ انیس برس کی عمر میں اس کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہوا، بیس برس کا تھا جب اس کی نظموں کا عہد ساز مجموعہ ''محبت کی بیس نظمیں'' اشاعت پذیر ہوا، جو کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور لاکھوں کی تعداد میں اس کی کاپیاں فروخت ہوئیں۔ مگر غربت نے ابھی تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا تھا حالانکہ وہ عالمی سطح پر مانا ہوا شاعر بن چکا تھا۔ معاشی ضرورتوں کی وجہ سے اس نے بحیثیت سفارتکار نوکری اختیار کر لی اور رنگون، کولمبو اور جاوا کے علاوہ سنگاپور میں متعین رہا۔ 1971ء

میں جسے نوبل انعام سے نوازا گیا، وہ پابلو نرودا چیک ریپبلک کے شاعر جان نرودا سے اتنا متاثر تھا کہ اسی کے نام سے اپنا نام اخذ کیا۔ یورپ کے دورے کے دوران وہ خصوصی طور پر چیکوسلوا کیہ گیا تھا تا کہ اس شاعر کی قبر پر پھول چڑھا سکے۔

ایشیائی ممالک میں سفارتکاری سرانجام دے کر وہ واپس چلی لوٹا تو اسے بیونس آئرس اور پھر بارسلونا میں سفارتی عہدوں پر تعینات کیا گیا۔ بعدازاں میڈرڈ میں چلی کا قونصلیٹ مقرر ہوا۔ اس کی بیٹی مالوامرینا کی پیدائش میڈرڈ میں ہی ہوئی، یہ بچی اپنی مختصر سی آٹھ سالہ زندگی میں اکثر بیمار ہی رہی۔ اسی دوران سپین میں خانہ جنگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہاں اس کا حلقہ احباب زیادہ تر بائیں بازو اور ترقی پسند سوچ کے حامل دانشوروں اور مصنفین پر مشتمل تھا۔ نرودا کے کیمونسٹ خیالات انہی دنوں ترتیب پائے۔ جب سپین کے آمر جنرل فرانکو نے اس کے ادیب دوست گارسیالورکا کو قتل کروادیا تو اس کے نظریات کیمونزم کے متعلق مزید پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کر گئے، وہ کھل کر جنرل فرانکو کے خلاف سوشلسٹوں کی حمایت کرنے لگا جس پر اسے نوکری سے برخواست کردیا گیا۔ اس کی جرمن بیوی بھی اس کا ساتھ چھوڑ کر چلی گئی۔ 1938ء میں مگر سپین میں اس کے دوست الیکشن جیت کر برسراقتدار آ گئے اور اسے فرانس میں ہسپانوی مہاجرین کا مشیر مقرر کردیا گیا۔ اس عہدے کے متعلق نرودا کا کہنا تھا کہ ''میری زندگی میں یہ سب سے مقدس مشن تھا جسے میں نے قبول کیا۔'' پھر اس کی زندگی میں ایک اور موڑ آیا اور 1943-1940ء میں وہ میکسیکو میں چلّی کا سفیر تعینات رہا۔ یہاں اس کی دوسری شادی ہوئی اور بدقسمتی سے اپنی بیٹی کی موت کی اطلاع بھی اسے یہیں موصول ہوئی۔ اسی دوران اسٹالن حکومت کے مخالف لیون ٹراٹسکی پر قاتلانہ حملہ ہوا جو میکسیکو میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔

نرودا پر الزام ہے کہ وہ اسٹالن حکومت کا حامی تھا اور اس نے ٹراٹسکی پر قاتلانہ حملہ کرنے والوں کو نہ صرف پناہ دی تھی بلکہ ان کو چلی کے ویزے جاری کر کے ملک سے فرار بھی کروایا تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جنگِ عظیم دوئم میں نازی جرمنی کی شکست میں

اسٹالن کے کردار کی وجہ سے پابلونرودااس کا مداح تھا۔ 1953ء میں اسے اسٹالن امن انعام سے نوازا گیا۔ اسٹالن کی موت پر اس نے طویل مرثیہ بھی لکھا مگر ٹراٹسکی پر حملے میں ملوث ہونے کے الزام کی نرودا نے ہمیشہ تردید کی۔ ویزوں کے اجراء کے متعلق اس کا کہنا تھا کہ ایسا میکسیکو کے صدر کے کہنے پر کیا گیا تھا۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ پابلونرودا کی کردارکشی کے لیے امریکی سی آئی اے نے باقاعدہ ایک خصوصی سیل قائم کیا تھا، یہ کوئی افواہ یا پروپیگنڈا نہیں بلکہ امریکی حکومت اب سرکاری طور پر اس سیل کے وجود کی تصدیق کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ نرودا پر عائد یہ الزام اوراسی طرح کے دیگر الزامات سی آئی اے کے تراشے ہوئے افسانے ہوں۔ روسی بالشویک انقلاب کے ہیرو ٹراٹسکی کی آپ بیتی، جس کا ہمارے دوست جاوید شاہین کا تحریر کردہ اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، اس میں بھی کہیں نرودا کے کسی ایسے فعل میں ملوث ہونے کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

1945ء میں وہ سینیٹر منتخب ہوااوراس کے بعداس نے کیمونسٹ پارٹی میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر لی۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ وہ آنتافوگاستا سے پہلے سینیٹر منتخب ہوا جس سے اس کی عوامی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں یہ بتا تا چلوں کہ چلّی میں سینیٹر براہِ راست عوامی ووٹوں سے منتخب ہوتے ہیں۔ پاکستان کی طرح بالواسطہ انتخاب کی بجائے سینیٹرز کا انتخاب امریکی طرز پر ہوتا ہے۔ جس میں انتخابی حلقوں کے لوگ بلاواسطہ انہیں منتخب کرتے ہیں۔ اسی سال وہ پیرو گیا جہاں اس نے لازوال نظم ''ماچوپیچو کی بلندیاں'' تحریر کی۔ میساچیوسٹس یونیورسٹی امریکہ میں شعبہ تخلیقی آرٹ کے سربراہ پروفیسر مارٹن کا کہنا ہے کہ یہ نظم ''انسانی تاریخ میں سب سے بڑی سیاسی نظم ہے'' 1946ء میں نرودا کو صدارت کے لیے کیمونسٹ امیدوار کی سیاسی مہم کا انچارج مقرر کر دیا گیا۔ 1948ء میں کیمونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ وہ روپوشی اختیار کر لیتا ہے۔ روپوشی کے دوران وہ تیرہ ماہ تک مختلف شہروں میں اپنے دوستوں کے گھروں اور تہہ خانوں میں چھپتا رہا کیونکہ حکومت کے کارندے اسے گرفتار کرنے کے لیے جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے تھے۔ ایک سال سے

زائد عرصے کی یہ روپوشی یوں ختم ہوئی کہ وہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر ارجنٹائن فرار ہو گیا۔ یہ سارا واقعہ اس نے نوبل انعام وصول کرتے ہوئے، اپنی نوبل تقریر میں دہرایا تھا۔ اگلے تین سال اس نے جلاوطنی میں گزارے۔ ارجنٹائن میں وہ اپنے ہم شکل، ناول نگار دوست میگل، جسے بعدازاں ادب کا نوبل انعام بھی ملا، اس کے پاسپورٹ پر یورپ اور ایشیا گھومتا رہا۔

جلاوطنی کے دوران جب وہ میکسیکو گیا تو وہاں کی حکومت نے اسے شہریت دے دی۔ وہ اٹلی کے جزیرے کیپری میں اپنے ایک مورخ دوست کے ہاں بھی رہائش پذیر رہا۔ نرودا کا یہ قیام مختصر مگر بہت یادگار رہا۔ اس قیام پر 1965ء میں ایک ناول لکھا گیا اور 1994ء میں اس ناول پر فلم بنائی گئی۔ اطالوی زبان میں بنائی گئی یہ فلم ہمیشہ یاد رکھی جانے والی فلموں میں سے ہے۔ نام ہے ’’iL Postino‘‘۔

یہ 1969ء تھا جب پابلو نرودا کو کیمونسٹ پارٹی نے ملک کی صدارت کے انتخاب کے لیے اپنا امیدوار منتخب کیا، مگر وہ اپنے دیرینہ دوست سالوادور آیندے کے حق میں دست بردار ہو گیا۔ الیکشن ہوئے اور آیندے الیکشن جیت کر چلی کا صدر منتخب ہو گیا۔ اسی کی درخواست پر نرودا فرانس میں سفیر کے عہدے پر فائز ہوا۔ آیندے مگر زیادہ عرصہ صدر کے عہدے پر براجمان نہ رہ سکا۔ امریکی سی آئی اے نے چلی کے فوجی جرنیلوں کے ساتھ مل کر اس کا تختہ الٹ دیا، تاکہ کیمونزم کا راستہ روکا جا سکے۔ اس آپریشن میں امریکی F-16 طیاروں اور اس کے فوجیوں نے عملی طور پر حصہ لیا تھا۔ یہ سرد جنگ کے عروج کا زمانہ تھا اور امریکہ ان دنوں دائیں بازو کے حامی ہر فوجی آمر کا کھل کر ساتھ دے رہا تھا۔ صدر آیندے آپریشن کے دوران مارا گیا اور نرودا اس کے دس دن بعد۔

صدر جنرل پنوچے نے نرودا کے جنازے کو عوامی اجتماع میں تبدیل ہونے پر پابندی لگا دی تھی۔ شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ ملک کے طول و عرض سے ہزاروں افراد نے سنتیا گو کا رخ کیا اور کرفیو کی خلاف ورزی کرتے ہوئے شہر کی سڑکوں اور گلیوں کو کھچا کھچ بھر دیا۔ اس بات کا قوی امکان ہے

کہ پابلو نرودا کی موت ''آپریشن کونڈور'' کا نتیجہ تھی۔ آپریشن کونڈور سی آئی اے کا ستر کی دہائی میں کیمونزم کے خلاف وہ آپریشن تھا جس میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اس نے خود اور جنوبی امریکہ میں فوجی آمروں کے ذریعے، دہشت گردی کی کارروائیاں کیں۔ اس دوران بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ساٹھ ہزار سیاسی کارکنوں کو قتل کیا گیا۔ گمشدہ افراد کی تعداد تیس ہزار ہے، جو کبھی واپس گھر نہیں پہنچے جبکہ چار لاکھ افراد پر جنسی تشدد کیا گیا، ہمیشہ کے لیے انہیں معذور بنا دیا گیا۔ اس آپریشن کا نشانہ بننے والوں کی اوپر دی گئی تعداد وہ ہے جن کے نام، پتے اور تفصیل فائلوں میں موجود ہے۔ پیراگوئے کے ایک جج نے ایک تھانے پر چھاپے کے دوران حادثاتی طور پر 1992ء میں یہ فائلیں برآمد کی تھیں۔ دنیا بھر میں ان فائلوں کو ''دہشت کی دستاویزات'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ممکن ہے پابلو نرودا کا نام ان فائلوں میں درج ہونے سے رہ گیا ہو؟ فرانزک سائنسدانوں کا یہ کہنا ہے کہ نرودا کی باقیات کے تجزیے سے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہوگا کہ اسے کتنا زہر دیا گیا؟ اور کیا یہ زہر موت کا سبب بننے کے لیے کافی تھا؟ موت تو عظیم لوگوں کو بھی آتی ہے، مگر یہ ان کی عظمت میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔

میجر آندرے کا قندھار

افغانستان کا شہر قندھار آج کل عالمی سطح پر زیادہ تر طالبان کی نسبت سے جانا جاتا ہے۔ اسی شہر میں طالبان کی بنیاد رکھی گئی اور ملا عمر سے لے کر اس تنظیم کی زیادہ تر قیادت کا تعلق قندھار ہی سے ہے۔ معروف امریکی صحافی پیٹر ایل برجن نے اسامہ بن لادن کے متعلق اپنی شہرہ آفاق کتاب ''Holy War inc.'' میں لکھا ہے کہ جب امریکہ میں گیارہ ستمبر 2011 کا حادثہ رونما ہوا تو حامد کرزئی کا قبیلہ ''پوپلزئی'' قندھار کے گردونواح میں طالبان جنگجوؤں سے برسرِ پیکار تھا۔ امریکی نشریاتی ادارے سی این این کے دہشت گردی سے متعلق امور کے تجزیہ کار پیٹر ایل برجن نے طالبان کی جنم بھومی میں رہتے ہوئے ان کے خلاف حامد کرزئی کے قبیلے کی مسلح مزاحمت کو، کرزئی کے صدر بننے میں سب سے بنیادی وجہ قرار دیا ہے۔ افغان صدر اسی شہر میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے ہیں۔ جبکہ طالبان کی پیدائش بھی اسی شہر کی ہے۔ اسی وجہ سے قندھار افغانستان میں برسرِ پیکار سبھی متحارب قوتوں کی خصوصی توجہ کا مرکز ہے۔

محولہ بالا پس منظر میرے ذہن میں تھا۔ اسی لیے جب میجر آندرے نے جاپان سے رخصت ہونے سے کچھ دن پہلے یہ انکشاف کیا کہ وہ روس میں چند دن گزارنے کے بعد قندھار جا رہا ہے تو میں ہکا بکا رہ گیا۔ آندرے جب میرے پاس ملازمت کے لیے آیا تو اس نے یہ ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ سوویت یونین کی فوج کا ریٹائرڈ افسر ہے۔ وہ تو مجھے آہستہ آہستہ یوں محسوس ہوا کہ شام کے وقت، کام کے ختم ہونے کے بعد، جب اس کے روسی

دوست ملنے آنے لگے۔ چونکہ اس کی رہائش کا انتظام بھی میرے دفتر کے پاس ہی تھا، اکثر شام کو وہ غسل کرنے کے بعد روسی فوج کی یونیفارم پہن لیتا تھا۔ نیلی اور سفید لائنوں والی فوجی ٹی شرٹ تو اکثر ہی روسی لڑکے پہنتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ روس میں دوسالہ فوجی ملازمت لازمی ہے، معذوری اور کسی پروفیشنل پڑھائی کی صورت میں ہی استثنیٰ ملتا ہے۔فوجی ہونا کسی روسی مرد کے متعلق کوئی خبر نہیں ہے۔مگر میں نے محسوس کیا کہ آندرے سے ملنے والے تمام روسی بڑی عزت وتکریم سے پیش آتے ہیں۔ ورنہ جن روسی ساختہ لوگوں سے ہمارا واسطہ رہتا ہے، ان حضرات کا عموماً کوئی بھی جملہ تین، چار گالیوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔اور گالیاں بھی ایسی بامعنی وزندگی سے بھرپور جیسے پنجابی زبان میں ہوتی ہیں، جو بقول شخصے اگر بھینس کو نکالی جائیں تو وہ بھی تین دن دودھ نہ دے۔ پھر ایک دن آندرے نے مجھے بتایا کہ وہ ریڈ آرمی سے بطور میجر ریٹائرڈ ہوا ہے اور افغانستان کے محاذ پر اس نے طویل عرصہ گزارا ہے۔

افغانستان کی جنگ کو محاذِ جنگ پر موجود سرخ سپاہ کا ایک افسر کیسے دیکھتا ہے؟ میرے لیے اس سوال کا جواب بے حد دلچسپی کا موضوع تھا۔اب اکثر میجر آندرے الیگزینڈ روچ سے افغان جنگ کی باتیں ہوتی رہتی تھیں، جنگ میں ہونے والے جانی نقصان پر وہ افسردہ تھا، اس کے جواب مختصر ہوتے تھے مگر تجربے کی کسوٹی پر پرکھے ہوئے۔"باس! مختصر یہ کہ وہ جنگ تھی، اور وہاں وہی کچھ ہورہا تھا جو جنگوں میں ہوتا چلا آیا ہے۔" قندھار کے محاذ پر مارٹر گولہ لگنے سے وہ شدید زخمی ہوگیا، تین ماہ ازبکستان کے ایک فوجی ہسپتال میں زیرِعلاج رہنے کے بعد دوبارہ جنگ میں شامل ہوگیا، حالانکہ پیٹ اور سینے پر مارٹر گولے کے ٹکڑوں کے نشان زخم کی شدت کا پتا دیتے ہیں۔آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ جن افغانوں کے خلاف وہ سالہا سال برسرِپیکار رہا ان کے متعلق اس نے کبھی ایک جملہ بھی ایسا نہ کہا جس سے نفرت کا اظہار ہوتا ہو۔حقارت، کدورت یا تعصب کی بُو آتی ہو۔

رخصتی کے دن میں نے اس سے کہا کہ آندرے! قندھار میں تو جنگ چل رہی ہے، تم کوٹورازم کے لیے کوئی اور جگہ نہیں ملی؟ میری بات کو اس نے قہقہے میں اڑا دیا، کہنے لگا:

وہاں تو سب اچھا ہے، بس ایسے ہی میڈیا کے لوگ شور شرابا کرتے رہتے ہیں،'' کیپٹل ازم ہے ہاہا!! سودا بھی تو بیچنا ہے'' قندھار تو میرا اپنا شہر ہے، وہاں کے لوگ مجھے جانتے ہیں۔ بتانے لگا، جب وہ سوویت فوج کے ساتھ قندھار کے محاذ پر متعین تھا تو ایک دن غلطی سے کنویں میں گر گیا، باہر نکلنے کی بہت کوشش کی مگر سب کوششیں بے سود ثابت ہوئیں، میں مسلسل امداد کے لیے بھی چیخ چلائے جا رہا تھا، آخر کار حلق سے آواز نکلنا بھی بند ہو گئی۔ مایوسی کے اس عالم میں ایک افغان خاتون نے میری مدد کی اور کنویں کے اندر رسی پھینکی اور مجھے موت کے منہ سے نکالا۔ میں نے اس فرشتہ صفت عورت کا شکریہ ادا کیا اور اپنی فوجی چھاؤنی چلا گیا۔ اگلے دن میں نے اس عورت کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ اسے کوئی انعام دیا جائے، پتا چلا کہ اس خاتون کے قبیلے والوں نے اسے غیرت کے نام پر قتل کر دیا ہے، کیونکہ اس نے میری جان بچائی تھی۔ وہ عورت بھی تو افغانی ہی تھی ناں! قندھار کی ہی رہنے والی پشتون مسلمان تھی ایک وہ بھی۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تین مہینے کے وقفے کے بعد جب میجر آندرے واپس جاپان آیا، تو اس نے بتایا کہ وہ ایک ماہ کی چھٹی قندھار گزار کر آیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات میرے لیے یہ تھی کہ وہ وہاں بڑا لطف اٹھا کر آیا تھا۔ آج صبح سویرے سائبیریا سے اس کا فون آیا کہ وہ کرسمس کی چھٹیوں میں جاپان آنا چاہتا ہے۔ اس کا دس سالہ بیٹا ساشا ڈزنی لینڈ دیکھنے کی ضد کر رہا ہے۔ اس کا میرے ہاں قیام کرنے کا اردہ تھا۔ میں نے ازراہِ تفنن اس سے کہا کہ ''میجر! اپنے بیٹے کو سیر کے لیے قندھار کیوں نہیں لے جاتے؟''

اس کا جواب سادہ سا تھا کہ ''ابھی ساشا ذرا چھوٹا ہے، تھوڑا سا بڑا ہو جائے پھر اسے قندھار کی بہاریں بھی ضرور دکھائیں گے۔''

میں نے کہا کہ تم ہمیشہ افغانستان کے متعلق خوشگوار باتیں ہی بتاتے ہو، کیا افغان جنگ کا کوئی تلخ پہلو بھی تمہاری یادوں کا حصہ ہے؟

میجر آندرے کا جواب تھا کہ جب افغانستان سے ہماری فوج کا انخلاء ہوا اور ہم واپس اپنے گھروں کو پہنچے تو کچھ ہی عرصہ بعد سوویت یونین ٹوٹ گیا، جس کے ہم سپاہی تھے۔ یہ خیال بڑا اذیت ناک تھا کہ ہم افغانستان میں کس کے واسطے لڑ رہے تھے؟ جس مملکت کی خاطر میرے فوجی دوستوں نے جانیں گنوائیں وہ ملک تو باقی ہی نہ رہا، پھر ہماری قربانی کس کی خاطر تھی؟ سوویت فوجیوں کا لہو افغانستان میں رائیگاں گیا اور عام افغان لوگ بھی شدید اذیت کے دور سے گزرے، یہ احساس اب بھی غمگین کر دیتا ہے۔

یہ ایک الگ قصہ ہے کہ میجر آندرے افغانستان میں ریڈ آرمی کی ناکامی کی وجہ افغان مجاہدین اور ضیاءالحق کے جرنیلوں کی بجائے امریکی اسٹنگر میزائل اور چارلی ولسن کو سمجھتا ہے، مگر اس کی تفصیل کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

Amir Bin Ali is one of the finest Poets from younger generation that have emerged during last decade.

(**Express Tribune Book Review**)

Staying away from his homeland makes Amir Bin Ali skeptical that he might get disconnected from his past, it is evident from his poetry and prose that he loves his country a lot and want to stay connected. He is successfully doing so through is writings.

(**Daily The Nation Book Review**)

مصنف کی دیگر کتب

محبت چھو گئی دل کو (شعری مجموعہ)، چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)

سرگوشیاں (شعری مجموعہ)، یاد نہ آئے کوئی (شعری مجموعہ)

محبت کے دو رنگ، گبریلا مسترال اور پابلو نرودا (ہسپانوی زبان سے براہِ راست اُردو میں کیے گئے تراجم)

گفتگو (انٹرویو)، مکتوب جاپان (کالموں کا مجموعہ)